سلسلہ مطبوعات مکتبۂ ابراہیمیہ



مقدمات عبدالحق

حصہ اوّل

مُرتّبہ

مولوی مرزا محمد بیگ صاحب
اسپشل تعلقدار نظام ساگر

سنہ ۱۹۳۱ء

دفعہ اول (۵۰۰)

قیمت ()

فہرست مندرجات





مقدمہ

از

جناب مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی

صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور سلطنتِ آصفیہ (حیدرآباد دکن)

مرزا محمد بیگ صاحب دکن کے ان جوانمردوں میں ہیں جو اپنے سینے میں لہو اور دل میں علم و ادب اور وطن کی خدمت کا ذوق رکھتے ہیں۔ اُسی کا اثر ہے کہ باوجود ملازمت کے فرائض کو خوبی سے انجام دینے کے اہتمام کے علم و وطن کی خدمت بھی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے قیام حیدرآباد میں مرزا صاحب کو وطنی و علمی خدمت کے لئے ہمیشہ مستعد پایا۔ اس مستعدی کی بنا پر میرے دل میں ان کی عزت ہے۔ اسی پاس عزت کا اثر تھا کہ جب میرے قیام حیدرآباد کے آخری ایام میں مرزا صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال ظاہر کرکے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے بے تامل اس کو قبول کرلیا۔ اس قبول میں ایک اور گہرا خیال بھی معین ہوا اور وہ ایک ممنونی کے اظہار کا موقع ہاتھ آنا ہے۔ اگرچہ میں منت پذیری کا اعتراف ذاتی طور پر کرچکا ہوں تاہم دل اعلان کے موقع کا

جو پایا تھا۔ مجھکو خوب یاد ہے کہ سب سے اول جس مقدمہ کو پڑھکر میں
متاثر ہوا وہ عبد الحق صاحب کا نوشتہ تھا۔ یہ یقینی ہے۔ البتہ یہ ظنی ہے کہ
وہ مقدمہ "انتخاب الاسلام" پر لکھا گیا تھا شبہ ہے کہ کوئی اور مقدمہ ہو
بہر حال مقدمہ کوئی سا ہو مقدمہ نگار مولوی عبد الحق صاحب ہی تھے اس
مقدمہ کے پڑھنے کے بعد مجھ کو بہت سے مقدمے لکھنے پڑے ہیں جن
میں سے بعض کو لکھوانے میں خود مولوی صاحب کی فرمائش کا زور فرما رہا ہے
جو اعتراف علی الاعلان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ان مقدمات میں کوئی خوبی
پیدا ہو سکی ہے تو دل میں اُس کا نقش اول مقدمہ بالا کے پڑھنے سے قائم
ہوا تھا دعوی تلمذ تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی پیروی کی سعی لاحاصل کا دعوی
البتہ کیا جا سکتا ہے وہ بھی مدعی کامل بننے کے لئے نہیں اداے شکر و سپاس
کے لئے۔

مقدمہ کیا ہے؟ | اس دور تحریر میں جہاں مؤلفین اور مصنفین کی کثرت ہو وہاں
مقدمہ نگار بھی روز افزوں ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ کمتر مقدمے پڑھنے کے قابل
ہوتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ بہت مقدمے مقدمے ہوتے ہیں شاید اسکی وجہ
یہ ہو کہ تقریظ اور مقدمے میں امتیاز نہیں کیا جاتا کہ اصل میں تو مقدمہ لیا گیا
ہے مقدمۃ الجیش سے جب ہم صاحب جیش تھے تو مقدمۃ الجیش کو خوب
سمجھتے تھے کہ کیا ہے اب نہ جیش نہ مقدمۃ الجیش۔ روزمرہ کے مشاہدے
سے مدد لیجئے۔ آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر گذریں گے تو دیکھیں گے
کہ دو دکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقے اور دلفریب طریقے سے آراستہ

سب سے اوّل دیدہ نواز ہوگا۔ یہ اپنی دلفریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کریگا
اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جویا ہوگی تو وہ بتائیگا کہ آپ کو جو جنس
دکان میں ملیگی وہ کیا ہے بعینہ یہی حال ایک کتاب کے مقدمہ کا ہے کہ وہ آپکو
دلکش طریقے سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے۔

پیش طاق کے واسطے دو شرطیں تھیں سلیقہ اور تفصیل بعینہ یہی دو شرطیں
ایک مقدمہ کے واسطے ہیں لکھنے میں اس کا سلیقہ ہو کہ دلکش پیرایہ میں کیا لکھا جائے
اور کیا نہ لکھا جائے کتاب کا کونسا حصہ نمایاں کیا جائے اور کونسا مخفی رہے تفصیل ایسی ہو کہ
کتاب پڑھنے کے بعد مایوسی نہ ہو بلکہ یہ اعتراف ہو کہ مقدمہ نگار راست نگار تھا اگر
مقدمہ نگار مطالب کتاب میں ترقی پیدا کرسکے اور پڑھنے والوں کے لئے مناسب موقع مزید معلومات
بہم پہنچادے اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کتاب پڑھوا رہا ہے تو اُس کو کمال
مقدمہ نگاری ماننا چاہیے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات اس معیار پر
کامل اترتے ہیں مولوی صاحب اپنے موضوع پر قلم اس وقت اٹھاتے ہیں
جب کہ اس پر پورا عبور حاصل کر لیتے ہیں نہ صرف کتاب پر بلکہ مصنف پر اور
موضوع کتاب پر اس لئے ان کے مقدمات میں یہ سہ گانہ پہلو روز روشن کی
طرح عیاں نظر آتے ہیں جس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے اُس کے موضوع پر اس کے
مطالب پر ایسی محققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلہ
موضوع کر گیا ہے۔ ہاں یہ خیال رہے کہ تقریظ نہیں لکھتے مقدمہ لکھتے ہیں مالہ وماعلیہ
دونوں سے بحث کرتے ہیں خوبی بھی دکھاتے ہیں عیب بھی جتلاتے ہیں اسی
کے ساتھ آپ کے لئے رائے قائم کرنیکا موقع بھی چھوڑتے ہیں بیان وہ ہے

جس میں صفائی ہے، محاورہ ہے، ادب ہے، زور ہے، ہاں کہیں ادب نہیں بھی ہے اور زور تو ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے مقدمہ لکھتے نہیں لڑاتے ہیں ان تمام اوصاف کیوجہ سے بیان دلاویز بھی ہے اور غور آفریں بھی۔

تفصیل مقدمات مقدمات کا حصۂ اوّل جو ہمارے سامنے ہے اس میں ۱۴ مقدمے ہیں تین حصّوں پر ۱۴ مقدمے تقسیم کئے گئے ہیں۔ اسلامیات۔ سائنس فلسفہ۔ تاریخ وتذکرہ اسلامیات میں اعظم الکلام تحقیق الجہاد معراج العاشقین پر مقدمے ہیں دونوں اول الذکر نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم کی مصنفہ ہیں۔ تیسری حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہٗ کی

مولوی چراغ علی مرحوم سرسید مرحوم کے پیروؤں میں باعتبار اپنے خاص اوصاف کے درخشندہ گوہر تھے۔ حیدرآباد کی حاضری کے زمانے میں یہ مسلسل کوشش میں نے کی کہ انکی حیات انکی شان کے مطابق لکھی جائے۔ کامیابی نہوئی اگرچہ مرحوم کے بعض اعزہ نے وعدہ اور ارادہ بھی کیا مولوی صاحب مرحوم کے مذہبی خیالات وہی ہیں جو سرسید مرحوم کے تھے۔ سرسید مرحوم کا دل جب مسلمانوں کی پسماندگی بلکہ درماندگی دیکھ کر دکھا تو انہوں نے کمرہمت اصلاح پر مضبوط باندھی اور خدا کا نام لیکر کام کرنے کو کھڑے ہوگئے۔ علی گڈھ کے لئے یہ فخر ہے اور رہیگا کہ سرسید کی محنتوں اور جانفشانیوں کی رزم گاہ بھی ہے۔ قدرتاً علی گڈھ والوں کو سرسید کے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع سب سے زیادہ ملا۔ میرے بزرگوں نے ان کے ساتھ کام کئے میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق بزرگوں کی نقل کی۔ یہ ہماری خاندانی روایت ہے کہ سرسید کی صداقت

اور نیک نیتی میں شبہ نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ رائے بھی تھی کہ سرسید کا مذہبی
خیال صحیح نقطے سے ہٹا ہوا تھا۔ اور یہ رائے ایسی کھلی ہوئی تھی کہ سرسید
بھی اس سے خوب واقف تھے۔ اور باوجود مخالفت کے وقعت کرتے تھے۔
تفصیل کی ضرورت ہے نہ موقع۔ مختصراً وہ رائے نتیجہ تھی یورپ اور سائنس
سے مرعوبیت کا یعنی خیال یہ تھا کہ یورپ میں کمال ہی کمال تھا سائنس کی عظمت کا
نقش ہے۔ اور اہم تھی مسلمانوں کو الحاد سے روکنے کے لئے انہوں نے تطبیق
کی کوشش کی۔ چونکہ سائنس پر حاوی نہ تھے۔ اس کو مذہب تک نہ لا سکے مذہب
کو سائنس کی سطح پر لانے کی کوشش فرمائی یہیں غلطی کی۔ اگر آج سرسید زندہ ہوتے
اور آج تفسیر لکھتے تو یقیناً یورپ اور سائنس سے اتنے مرعوب نہ ہوتے
جتنے انیسویں صدی کے وسط میں ہوئے۔ حال ہی میں جو عظیم الشان کانفرنس
سائنس کے علما کی لندن میں ہوئی اس کے پریسیڈنٹ کا ایڈریس بتاتا ہے کہ
بیسویں صدی کی سائنس انیسویں صدی کی سائنس سے بہت مختلف ہے اس کے
اندر اتنا انقلاب ہو گیا ہے کہ رفتہ رفتہ ان باتوں کا اقرار کرنے لگی جنکو گزشتہ
مدتوں میں محالات میں سے کہہ چکی تھی۔ مادہ اپنی ساری ہیئت کے ساتھ فنا ہو چکا
ہے زمان و مکان کا نظریہ پچھلے نظریوں کو تہ و بالا کر رہا ہے مادہ سے ماورا اس دنیا
کے سوا کچھ اور نظر آ جانے کے آثار ہیں۔ آمدم بر سر مطلب سرسید کے رفقا نے
بھی مذہب کی خدمت کا وہی پہلو اختیار کیا جو سرسید نے ان کے سامنے پیش کیا
تھا۔ ایک سے زیادہ مقدمے بتاتے ہیں کہ مقدمہ نگار بھی انہی خیالات کے
پیرو ہیں۔ اس لئے ان دونوں مقدموں میں دل کھول کر اعظم یار جنگ بہادر

کے خیالات کی پرزور تائید کی ہے اور مخالفین کی پوری قوت سے وار کیے۔ ضروری ہے کہ یہ خیالات ایک طبقے کو گراں گزریں گے اور شاید وہ ان کو قابل معافی نہ سمجھیں۔ اور یہ [illegible] ہو جائیں مگر ان کو فیصلہ کرنے سے پہلے یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ سرسید کے مخالفین نے بھی جو کچھ لکھا یا کہا وہ بھی سب کا سب تہذیب اسلام کے دائرے کے اندر یا حکمت [illegible] کا مصداق تھا۔ اگر اس طرف سے یہ روش اختیار نہ ہوتی تو ان کے مخالف بھی قلم کی باگ ڈھیلی نہ کرتے انصاف یہ ہے کہ اب بھی پلڑا ادھر ہی جھکا رہیگا۔

اس موقع پر یہ نہ لکھنا حق پوشی ہوگا کہ زیادہ محتاط علما نے اس وقت بھی سرسید کی تکفیر سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا میرے ذاتی علم میں حضرت مولانا فضل رحمٰن۔ مولانا محمد لطف اللہ صاحب مولانا سید محمد علی صاحب اسی طبقہ علماء میں شامل تھے مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم نے مکہ مکرمہ میں اپنے مدرسہ صولتیہ کے علماء کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کبھی کسی تکفیر پر یا اخلافی مسئلہ پر فتویٰ نہ دیا جائے۔

اعظم الکلام کا مقدمہ مجھکو یوں بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے اس میں مولوی چراغ علی مرحوم کے حالات اور علمی اوصاف پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے وہ علمی اوصاف ایسے ہیں کہ قدیم و جدید دونوں طبقوں کے اہل علم ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ جن اصحاب کو مولوی عبدالحق صاحب کے خیالات بالا سے غصہ آئے وہ ان کے ملحد بنانے میں جلدی نہ کریں اور مرے اوپر کرم فرما کر

معرکہ مذہب و سائنس کا مقدمہ غور سے حرف بحرف پڑھئے۔ اس سے واضح ہو جائیگا
کہ مولوی صاحب کے دل میں مذہب کا کتنا گہرا عقیدہ اور ادب ہے۔ اس کا آخیر
حصہ پڑھکر میری آنکھیں تو پرنم ہوگئیں۔ مقدمہ مذکور اس قابل ہے کہ وہ خوشنما تقطیع پر
بہت عمدہ طبع کرا کے خصوصاً طلبہ میں بکثرت تقسیم کیا جائے۔ میرا مضبوط خیال ہے کہ بہت سے
بڑے بڑے رسالوں سے زیادہ یہ مقدمہ مذہب کی تائید بمقابلہ سائنس کے کرنے
میں کامیاب ثابت ہوگا۔ میرے خیال میں یہ مقدمات تمام مقدمات میں زیادہ دلچسپ
ہے۔ تمدن ہند کا مقدمہ بھی بہت مفید اور علم آموز ہے۔ مجھکو بڑی دلچسپی اس حصہ
سے ہوئی جسمیں سید علی مرحوم کے حالات ہیں۔ یہ حالات نمونہ ہیں کہ کسی ممتاز آدمی کے
اوصاف بمخالف موافق رائے کس طرح ظاہر کیجائے۔ نادر بات یہ ہے کہ مترجم
تمدن ہند کے ایسے ضروری حالات یکجا کر دئے ہیں کہ ان سے بہتر دوسری جگہ شاید
ہی ملیں۔ اس پر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہم اس طبقے کو ابھی سے فراموش کر چکے جو سر سید
سے شروع ہو کر وقار الملک پر ختم ہو چکا تھا حالانکہ انکی حیات میں ایسے جوانمردانہ
کارنامے ہیں جو بہت آئندہ نسلوں میں اکسیر کا کام دے سکتے ہیں۔ کیسا ہی عبرتناک یہ بیان
ہو مگر واقعہ ہے کہ آج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں سب سے زیادہ کم ہستی سر سید احمد خاں
مرحوم کی ہے۔ نام جاننے والے یا لینے والے بہت نکلیں گے مگر ان کے حالات جاننے
والا ان کے کارناموں سے متاثر ہو کر پیروی کا شوق رکھنے والا مجھکو تو کوئی
نظر نہیں آتا۔ کیا یہ علامت کسی قوم کی زندگی کی ہے۔ پس مولوی عبدالحق صاحب
کی وہ سعی جو انہوں نے اس طبقے کے کارنامے یاد دلانے کی کی ہے ہمارے
شکر کی مستحق ہے نیز اس جامع کی جسکی کوشش سے یہ مقدمات یکجا طبع ہو کر ملک و ملت کے

سامنے آتے رہیں۔ کاش ایک بات میری مولوی عبدالحق صاحب سن لیتے اگرچہ اب تک نہیں سنی ہے۔
عبدالستار خاں مرحوم جن کا ذکر بار بار متعدد مقدموں میں آیا ہے ضرور اس کے مستحق تھے کہ
ان کے حالات پبلک کے سامنے لائے جاتے کوئی شبہ نہیں کہ یہ حالات ایک ایسا نقشہ دکھاتے
جس کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ جاتی کم سے کم یہ ہو کہ رسالہ اردو میں ایک بسیط مضمون چھپ جائے
یہ بھی کہہ دوں کہ اگر مولوی صاحب نے یہ حالات نہ لکھے تو پھر دوسرا لکھنے والا نظر نہیں آتا۔
حیات النذیر کے مقدمہ کے متعلق ایک واقعہ کا اظہار ضروری ہے مولوی نذیر احمد خاں
صاحب مرحوم کے رسالہ امہات الامہ جلائے جانے کے واقعہ کو مولوی صاحب نے
بڑی دلسوزی سے بیان کیا ہے۔ ایسا کہ دلسوزی نے اس میں کباب کا چٹ پٹا پن پیدا کر دیا ہے
واجب الاظہار واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکاء اس کے جلانے پر آخر تک آمادہ
نہ تھے خود مولوی صاحب مرحوم کی تحریک تھی اس طرف کے تامل نے تحریک کو اصرار
سے بدل دیا اصرار نے شدت اختیار کی بلکہ دھمکی کی صورت جیسی کہ مولوی صاحب مرحوم
کی طرف سے ایسے موقع پر ہوا کرتی تھی مسیح الملک مرحوم نے (جو واسطہ تھے) بالآخر کہا
میں نے شیر کو کٹہرہ میں بند کر دیا ہے آپ نکالتے رہیں۔ اس پر جلسہ کر کے غور کیا گیا اور
مؤلف مرحوم کی رائے کی تائید ہوئی۔ چنانچہ رسالے جلائے گئے۔ مٹی کا تیل لا کر پیچھے
رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا وہ میں ہی تھا اتفاق یہ کہ جلانے کے بعد آندھی
نے خاکستر اڑا دی بارش نے جگہ صاف کر دی۔ اس طرح "ہلاس" سونگھنے کا موقع کسی کو
نہ مل سکا۔

اب تخفیف تصدیقہ مقدمات کی جانب توجہ کیجیے۔

حبیب گنج ضلع علیگڑھ ۱۹ اکتوبر ۱۹۳[illegible]ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کوئی چھ سات برس پہلے کی بات ہے کہ میں کسی کتاب پر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ پڑھ رہا تھا۔ اس سے قبل بھی میں نے دو تین مقدمات پڑھے تھے مولوی صاحب کے مقدمات خاص انداز کے ہوتے ہیں جن میں نہ صرف ادبیت ہوتی ہے بلکہ وہ ہر کتاب کے مضامین پر بھی گہری نظر ڈالتے ہیں اور اس طرح نقد و بحث فرماتے ہیں کہ ہر مقدمہ بجائے خود تنقیدات کا موضوع بن جاتا ہے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر تمام مقدمات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ادب کا اور مفید ترین معلومات کا ذخیرہ ہو جانے کے علاوہ تنقیدی اصولوں پر غور کرنیوالوں کے لئے بھی بے حد معاون ہوگا چنانچہ میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں جس زمانے میں کہ وہ اورنگ آباد میں تشریف رکھتے تھے ایک نیاز نامہ ارسال کرکے استدعا کی کہ وہ اپنے جملہ مقدمات کو ایک جگہ کرکے کتاب کی صورت میں شائع فرمادیں۔ انہوں نے

جواباً ارقام فرمایا کہ وہ خود اس کام کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اگر کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

کسی کو مقدمات کے اجتماع اور اشاعت پر آمادہ کرنے کی بجائے بوجہ اس کے کہ محرک میں ہی تھا میں نے خود ہی اس کام کو انجام دینے کا ارادہ کیا اور مولوی صاحب کی خدمت میں اپنے ارادہ کی اطلاع دیتے ہوئے استدعا کی کہ وہ ان تمام مقدمات کے مسودات ارسال فرمائیں جو مختلف کتابوں پر لکھے گئے ہیں

مولوی صاحب نے میرے خط کے جواب میں یہ مشورہ دیا کہ میں خود اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری نہ لوں اور نہ یہ ایسا کوئی ضروری کام ہے اور یہ کہ اُنکے پاس مقدمات کے مسودات موجود نہیں ہیں۔

لیکن میں [illegible] ان کتابوں کی فہرست [illegible] فرمائیں جن پر مقدمات لکھے گئے ہیں آخرکار مولوی صاحب نے صرف چند کتابوں کے نام تجویز فرمائے اور بقیہ کے متعلق تلاش و جستجو کی ہدایت فرمائی۔

میں نے اپنی تلاش اور احباب کی مدد سے مقدمات کی ایک فہرست بنالی مگر یہ ناکافی تھی مجھے معلوم ہوا کہ جناب ہاشمی صاحب، مولوی صاحب کے مقدمات سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اس لئے میں ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا جناب ممدوح نے بڑی مہربانی کے ساتھ متعدد مقدمات کی یادداشتیں لکھوا دیں جن سے مجھے بڑی قیمتی مدد ملی۔

اس کے بعد دیگران کتب کو فراہم کیا گیا جن پر مقدمات لکھے گئے ہیں اور انکی نقلیں بھی کرائی گئیں۔ کتابوں کو فراہم اور نقول کے تیار کرنے میں میرے کرمفرما مولوی

سید عبدالغفور صاحب عابدی نے زیادہ محنت اٹھائی جس کے لئے میں انکا مشکور ہوں
نقول تیار ہو جانے کے بعد میں نے انکو مولوی صاحب کی خدمت میں اس غرض سے
روانہ کیا کہ وہ ایک نظر ملاحظہ فرمالیں انہوں نے مسودات کو واپس کرتے ہوئے بعض
مقدمات کو (جو اس وقت میرے حافظہ میں محفوظ نہیں ہیں) حذف کردینے کا مشورہ
دیا لیکن جو سرمایہ کہ جمع کیا گیا تھا اس میں کوئی کمی کرنیکے لئے جی نہ چاہا کیونکہ ہر مقدمہ
پڑھنے، سمجھنے اور قدر کرنے کے قابل ہے چنانچہ میں نے مشورہ کے خلاف عمل
کرنیکی جسارت کی ہے جسکو امید ہے کہ مولوی صاحب ازراہ عنایت معاف فرمائیں گے

مقدمات جمع ہو گئے اب طباعت کا مرحلہ پیش آیا حیدرآباد میں یہ کام کچھ آسان
نہیں ہے اس میں مجھ سے مختلف وجوہ کی بنا پر ناقابل معافی تساہل بھی واقع
ہوا بعد ازاں میں نے مہتمم صاحب انجمن مکتبہ ابراہیمیہ کو کتاب کی طباعت و اشاعت
پر آمادہ کیا اور انہوں نے اپنی علم دوستی کے ثبوت میں اس کا ذمہ لے لیا مگر انہیں
کاپی کے تیار کرانے میں بہت سی دشواریاں لاحق ہوئیں اور ایک طویل زمانہ نکل گیا

مقدمات پر ایک مقدمہ بھی ضروری تھا اور مولوی صاحب کے مقدمات
پر مقدمہ لکھنے کے لئے کسی بڑی ہستی کی تلاش رہی - ایک مرتبہ مولانا مولوی
حبیب الرحمن خانصاحب شروانی صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور سلطنت
آصفیہ خلد اللہ ملکہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر التماس کی مولانا ممدوح ان دنوں
حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے بڑی عنایت کے ساتھ میری ہمت افزائی فرمائی
اور مقدمہ تحریر فرما دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد مولانا
ممدوح نے حج بیت اللہ کا قصد فرمایا مراجعت فرمائی کے بعد بعض اہم مصروفیتوں

نیز حیدرآباد سے جدا ہونے کے باعث مقدمہ نویسی کا کام انجام نہ پا سکا۔
مولانا کے وطن تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد میں نے عریضہ ارسال کرکے یاد دہی کی اور مولانا نے بکمال شفقت بزرگانہ ایک بہترین مقدمہ تحریر فرما کر ارسال فرمایا مقدمہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوجائیگا کہ مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات پر کس خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کس عالمانہ شان سے نقد و بحث فرمائی گئی ہے ان دونوں بزرگوں کے علم و فضل کی جولانگاہ الگ الگ ہے مگر مقاصد دونوں کے ایک ہیں اور ایک دوسرے سے خوب واقف ہیں لہذا ناظرین لطف اندوز ہوں گے اور اپنی اپنی رائے قائم فرمائیں گے
ہر کتاب کے موضوع بحث کے اعتبار سے اس پر مقدمہ بھی مرتب ہوتا رہا ہے مثلاً اسلامیات، سائنس و فلسفہ، تاریخ و تذکرہ وغیرہ ان میں سے جس موضوع پر جتنے مقدمات ملے ان کو اسی عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے جسکی وجہ سے ہر ایک سلسلہ تنقیدات کا ایک مستقل باب بن گیا ہے اس سے ناظرین کتاب کو یہ بڑی سہولت حاصل ہوجائیگی کہ وہ ہر باب کے تحت اس کے تنقیدی اصولوں کو بآسانی ذہن نشین کرسکیں گے اس کا بڑا افسوس ہے کہ کتاب میں بہت سے غلط الفاظ چھپ گئے ہیں اس لئے ایک صحت نامہ بھی شامل کرنا پڑا کتاب ظاہری حسن و خوبی کے اعتبار سے بھی چنداں خصوصیت نہیں رکھتی مالک مطبع سے اس کی شکایات ناروا ہی ہوگی مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں خود اہتمام یا انتظام عمل میں لا نہ سکا بہر حال میرے لئے یہی غنیمت ہے کہ کسی طرح مقدمات جمع ہو گئے اور وہ اب شائع ہو رہے ہیں یقین ہے کہ مہتمم صاحب انجمن مکتبہ ابراہیمیہ مصداق

"نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل"

بہت جلد اشاعت ثانیہ زیادہ صحت و پاکیزگی کے ساتھ عمل میں لا سکیں گے۔

مولوی عبدالحق صاحب اور ان کے مصنفہ مقدمات کے متعلق کچھ عرض کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے اس فرض کی انجام دہی کے لئے تو کسی قابل شخص کی ضرورت ہے میرا حال تو یہ ہے کہ گذشتہ بارہ چودہ برس سے دفتری مشاغل میں پھنس گیا ہوں دفتری مذاق رچ گیا ہے خیالات کو جمع کرنا چاہتا ہوں مگر ہو نہیں سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب کسی تعارف مزید کے محتاج بھی نہیں ہیں ان کے علمی کارناموں اور زبان اردو کی مہتم بالشان خدمات سے کوئی تعلیمیافتہ ایسا نہ ہوگا جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی نہیں ہے کہ مولوی صاحب ان بزرگوں میں سے ایک ہیں جو صفِ اولیں میں شمار کئے جاتے ہیں انھوں نے زبان اردو پر وہ احسانات کئے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے جب تک کہ زبان اردو زندہ رہے گی مولوی صاحب کا نام بھی زندہ رہیگا یہ وہ حیات جاوید ہے جو صرف علم کی سیوا کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

دنیا میں بہت سے لوگ تعلیم سے بہرہ ور ہیں اور بہت سے علم و فضل میں بھی ممتاز ہیں مگر بڑی فضیلت تو اس میں ہے کہ علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے عوام کی بصیرتوں کو بڑھایا جائے ورنہ ایسے علم و فضل کا کوئی مفاد نہیں جو اس کے حاملوں کے سینوں کو تو منور رکھتا ہو مگر ہزاروں تشنگان علم پر اس کا پرتو نہ پڑتا ہو میرا حافظہ قصور نہ کرتا ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تقریباً ۳۰-۲۰ برس کے پہلے جبکہ مولوی عبدالحق صاحب کا تعلق مدرسہ آصفیہ سے تھا میں نے مولوی صاحب

علمی خدمات اور تجسس و تلاش علم سے واقفیت حاصل کی حیدرآباد بھی عجیب مقام ہے جہاں جاہ و عزت کو پیدا کرنے کے لئے کبھی کسی کے لئے کوئی تنگی نہ رہی ہر وہ شخص اس میں کامیاب ہوا جس نے تھوڑی بہت خصوصیت پیدا کرلی اگر حیدرآباد کی گذشتہ چند سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی یہی وہ وسعت آغوش ہے جس کی وجہ سے حیدرآباد نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر میں بھی پوری شہرت رکھتا ہے اور بڑی عظمت و وقار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے ملک میں مولوی عبدالحق صاحب کے لئے اپنے کو کسی بڑے عہدے کا امیدوار بنا لینا اور اس کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہوجانا کوئی مشکل کام نہ تھا اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً کامیاب ہوتے اور آج سرفہرست کے لوگوں میں سے ہوتے مگر وہ سچا علمی ذوق رکھتے تھے علم کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور عمر بھر متعلم بن کر رہنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے اس ولولے اور اس جوش میں اپنی تمام خواہشات اور تمناؤں کو خیرباد کہا اور بڑی ہمت و مردانگی کے ساتھ اپنے لئے صرف صیغہ تعلیمات کو پسند کیا جہاں وہ اب تک علم کی خدمتوں میں مصروف ہیں انکی نظروں کے سامنے بہت سے موافق و ناموافق زمانے گزرے متعدد ہمت شکن واقعات بھی پیش آئے مگر انھوں نے کسی بات کی کوئی پروا نہیں کی اگر کبھی کوئی پروا کی بھی تو خدمت علم کی کی۔ خود پڑھتے رہے۔ دوسروں کو پڑھایا کیا پھر پڑھنے اور پڑھانے کا عظیم الشان سرمایہ فراہم کیا غرض یہ کہ وہ میدان علم میں ہمیشہ تھمے رہے اپنا فائدہ دیکھا تو خدمت علم کے لئے دیکھا دوسروں کا فائدہ کیا تو خدمت علم کے لئے کیا اور کبھی کسی کا نقصان کیا بھی

تو خدمت علم کے خاطر سے کیا بہرحال اپنے مسلسل علمی ذوق کا ایک ایسا نقش قائم
کر کے چھوڑا جو نہ صرف سلطنت آصفیہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے
قائم رہے گا اور جس پر چلنا باعث فخر و مباہات سمجھا جائیگا۔

مولوی صاحب کا ہر وہ مقدمہ جو عموماً ٹکسالی کتاب پر مرتب ہوا ہے اپنا
مرتبہ آپ حاصل کر چکا ہے بقول مولوی صاحب کے وہ "مقدمہ باز" مشہور ہو چکے
ہیں یہ لقب علمی معنی میں ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہے کہ اردو مقدمہ نویسی کے
فن میں مولوی صاحب کو زمانہ ہمیشہ معلم اول سمجھتا رہے گا۔ مجتمع مقدمات کو
ایک جگہ دیکھ لینے کے بعد یہ معلوم ہو جائیگا کہ وہ بحیثیت مجموعی ایک ایسی مستقل
تصنیف ہے جس میں نہ صرف ادبی لذتیں ہیں بلکہ طریقہ نقد و بحث کے بے شمار
اسلوب بیان مذکور ہیں اور معلومات کے انبار لگے ہوئے ہیں جن سے ہر ذی علم
اور صاحب ذوق لطف اندوز ہو سکتا ہے اور بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔

ہر ایک مقدمہ ایسا ہے کہ اس کے پڑھنے سے لکھنے والے کے تبحر علمی
اور محنت و جانکاہی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور جس تحقیق و تدقیق کے
ساتھ کام لیا گیا ہے حق تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کا حصہ تھا۔ تمدن ہند، معرکہ
مذہب و سائنس، اعظم الکلام کے مقدمات کو پڑھئے اور غور فرمایئے کہ کیسی
باریک بینی اور کیسی خوش اسلوبی کے ساتھ ان کتابوں پر تنقیدیں فرمائی ہیں
اور کیسے کیسے معرکۃ الآرا مسائل پر بحث و تمحیص کی ہے۔ شبلی مرحوم اور عطیہ بیگم
صاحبہ کی باہمی مراسلت پر جس خوبی کیساتھ اور جس انداز میں مقدمہ لکھا گیا ہے
اس کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں تذکرات شعرائے قدیم پر جتنے مقدمات لکھے گئے

کیسے پر لطف اور کتنے قیمتی معلومات کے حامل ہیں۔

غرض یہ کہ ہر ایک مقدمہ ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے اور مصنف کے مرتبہ کو بھی منوالیتا ہے مجھ میں نہ استعداد ہے کہ زیادہ شرح وبسط کے ساتھ عرض کر دیتا اور نہ اتنی فرصت ہے کہ ایسی کوشش کروں جن چند سطور کو میں نے لکھا ہے سمجھتا ہوں کہ وہ دیباچہ کی تقریب میں کافی رہیں اور اس سے زیادہ لکھنا چاہیئے تھا لیکن میری معذوری بھی قابل معافی ہے اور امید کرتا ہوں کہ مقدمات کو پڑھکر استفادہ اور مصنف کی عزیز قدر و منزلت کی جائیگی۔

کیمپ پورلم ۱۹ بہمن ۱۳۱۴ف محمد بیگ

اسلامیات

(۱) مقدمہ اعظم الکلام
(۲) مقدمہ تحقیق الجہاد
(۳) مقدمہ معراج العاشقین

مُقدّمہ

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

حصّہ اوّل

مشتمل بر حالات مصنف

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے
تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و
ثروت و لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا
کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا
ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا۔ اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اُس سے زیادہ
کھوتا ہے۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے ابتدا میں ایک معمولی منشی کی طرح دفتر میں
ملازمت کی اور محض اپنی لیاقت اور محنت سے اعلیٰ رُتبے پر پہنچ گئے۔
اُن کی تعلیم بہت معمولی درجے کی ہوئی تھی۔ لیکن لگاتار مطالعہ اور محنت کی
بدولت اُنھوں نے وہ فضیلت حاصل کی جو بڑے بڑے ڈگری یافتوں اور
صاحبانِ دستارِ فضیلت کو میسر نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی ایک سبق ہے اُن

لوگوں کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے کارنامے نوجوانان ملک کے لئے دلیل راہ کا کام دینگے۔ ان کے آباو اجداد در اصل سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے اور وہاں سے میرٹھ آئے اور پھر وہیں آباد ہوگئے۔ مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں ملازم ہوئے۔ بعد ازاں ان کا تبادلہ سہارنپور ہوگیا جہاں وہ کلکٹر کے دفتر کے ہیڈ کلارک تھے۔ سہارنپور میں یہ محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور تھے۔ کرانی کا لفظ اس زمانے میں انگریزی کلارکوں کے لئے بجائے بابو کے استعمال ہوتا تھا چنانچہ کرانی خانہ منشی خانہ کو کہتے تھے جہاں کلارک کام کرتے تھے۔ چونکہ مولوی محمد بخش انگریزی دان تھے اور کسی قدر انگریزی لباس بھی پہنتے تھے لہٰذا لوگ انہیں کرانی کہنے لگے۔

لہ مولوی چراغ علی مرحوم کے ابتدائی حالات ہمیں زیادہ تر مولوی محمد زکریا صاحب سہارنپوری (حال وظیفہ یاب حسن خدمت سرکار نظام) سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پُرانے دوست اور رفیق ہیں اور مرحوم اور اُن کے خاندان کو اس وقت سے جانتے ہیں جب کہ مرحوم کے والد سہارنپور میں ملازم تھے۔ مرحوم مولوی صاحب موصوف کا بہت اعزاز و احترام کرتے تھے اور مولوی صاحب کے تعلقات اب تک مرحوم کے خاندان سے ویسے ہی چلے جاتے ہیں اور زمانۂ حیدرآباد کے اکثر حالات ہمیں مولوی صاحب موصوف کے بھتیجے مولوی انوارالحق صاحب سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پاس بچپن سے تھے اور مرحوم ان پر بہت عنایت فرماتے تھے۔ نیز دیگر حضرات سے جو جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ اُن کے نام کے ساتھ بعد تحقیق کے لکھ دئے گئے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے معزز ترین عہدہ گورنری جنرلی پر لارڈ ڈلہوزی نئے نئے تشریف لائے تھے۔ یہ صاحب تھے تو کم عمر مگر بلا کے ذہین جفاکش مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ انہوں نے ملک کی آبادی اور آسایش خلائق عامہ کے لئے بہت سے نیک کام کئے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک کام اُن کے ہاتھ سے ایسا ہوا کہ ان کی ساری نیکیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ابتدا سے یہ بات اُن کے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ جہانتک ہو سکے اور جس طرح بن سکے دیسی ریاستوں کو نیست و نابود کر دیا جائے اور ان کے ملک کمپنی کے علاقہ میں ضم کر دئے جائیں۔ وہ اپنے بہادرین رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے۔ وہ اس خیال پر اخیر تک جمے رہے اور بڑے تشدد اور استقلال سے اسے عمل میں لائے۔ لیکن اس سے جو بُرے نتائج پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں اور اُس کا بُرا اثر اب تک رعایا کے دل سے پُورے طور پر زائل نہیں ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی سے قبل کمپنی بہادر کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ تھے۔ وہ جیسے لڑائی میں سخت تھے ویسے ہی فتح کے بعد معتدل مزاج بھی تھے۔ سکھوں سے پہلی لڑائی فتح کرنے کے بعد بیرونی اضلاع کو الگ کر کے پنجاب اُنہیں لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنا انتظام خود کر لیں۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج الگ اپنے زور میں آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ رانی میں اتنی قوت اور دور اندیشی نہ تھی کہ وہ ان سب کو سنبھالے بلکہ اس نے کج رائے اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھ میں پڑ کر ملک کی حالت اور بگاڑ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ ایک ایسی اچھی اور سرسبز سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے اندرونی انتظامات میں دخل دینے سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی

اور مہاراجہ کے دربار کو پورا اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی اور دستور و آئین کے مطابق اپنا انتظام کریں۔ لیکن جب روز بہ روز خرابیاں بڑھتی گئیں تو بمجبوری ایک کونسل مقرر کی گئی کہ اُس کے صلاح و مشورہ سے انتظام ریاست چلایا جائے اور کونسل کا میر مجلس انگریز ہو۔ پنجاب کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ہنری لارنس جیسا پاک نفس نیک دل اور ہوشمند پریزیڈنٹ ملا۔ وہ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے اور اس خوبی اور نیک نیتی سے کام چلایا کہ رعایا ان کی عاشق ہو گئی اتنے میں لارڈ ہارڈنگ ولایت کو سدھارے اور اُن کی جگہ لارڈ ڈلہوزی آئے۔ اور لارڈ ہارڈنگ کے جاتے ہی سر ہنری لارنس رخصت پر ولایت تشریف لے گئے۔ سر ہنری لارنس کے جانے کے بعد ناتجربہ کار انگریزی افسروں نے رعایا کی دلداری کا مطلق خیال نہ کیا اور انتظام کے جوش میں ایسی ایسی غلطیاں کیں کہ لوگوں میں انگریزوں کی طرف سے بددلی اور نفرت پیدا ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور سکھوں میں بڑی خونریز اور خونخوار جنگ ہوئی جس سے ہندوستان اور انگلستان میں تہلکہ مچ گیا اور ایک دفعہ انگریزی حکومت جڑ بنیاد سے ہل گئی۔ آخر انگریزوں کی فتح ہوئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جو ہندوستان کے نقشے میں انگریزی کمپنی کی عملداری کا سُرخ رنگ دیکھ کر پیشینگوئی کی تھی کہ نقشہ کا سارا رنگ سُرخ ہوتا نظر آتا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد پوری ہو کے رہی اور اب پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہو گیا۔ اس جدید صوبے کے انتظام کے لئے ہندوستان سے جہاں اور تجربہ کار اور لایق عہدہ داران منتخب کئے گئے وہاں مولوی محمد بخش کا بھی انتخاب ہوا۔

۱۸۴۹ء میں مولوی محمد بخش محکمۂ بندوبست میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ عہدہ مہتممی بندوبست پر سرفراز ہوئے۔ اور کچھ عرصہ تک صوبہ پنجاب کے

اضلاع ملتان۔ ڈیرہ غازی خاں بنوں وغیرہ میں مامور رہے۔ سرحدی اضلاع کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد ضلع سیالکوٹ میں متعین کئے گئے۔ اس کے بعد ضلع شاہ پور میں اسی اہم کام پر مامور رہے یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہتممی بندوبست جیسا وقیع اور اعلیٰ عہدہ جب کہ آج کل بھی ویسی لوگوں کو شاذ و نادر ہی ملتا ہے تو اس زمانے میں جبکہ نہ ہندیوں کے حقوق تسلیم کئے گئے تھے اور نہ اُن حقوق پر زور دینے والے ابھی میدان میں آئے تھے کیسا کچھ وقیع اور معززنہ سمجھا جاتا ہوگا۔

افسوس ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ مولوی محمد بخش کے حالات اور اُس وقت کے واقعات معلوم نہ ہوسکے۔ لیکن صرف ایک یہی واقعہ مولوی صاحب کی قابلیت اور لیاقت کی کافی شہادت ہے کہ حکومت وقت نے انہیں ایک ایسے عہدے پر جو کسی طرح ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر کے عہدے سے کم نہیں سرفراز فرمایا۔ سُنا گیا ہے کہ مولوی محمد بخش کو اپنی اولاد کی تعلیم کے متعلق بڑے بڑے خیال تھے۔ لیکن اجل نے مہلت نہ دی اور عین عالم جوانی میں (جبکہ اُن کی عمر غالباً پینتیس ۳۵ سال سے زائد نہ تھی) سن ستاون کی مشہور فوجی شورش سے ایک سال قبل یعنے ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا اور سارے منصوبے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ مرحوم نے چار بیٹے چھوڑے جن میں سب سے بڑے مولوی چراغ علی تھے اور اُس وقت ان کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مولوی محمد بخش مرحوم کا مقبرہ اب تک میرٹھ میں موجود ہے۔

مولوی محمد بخش کے انتقال کے بعد ان کے سب اہل وعیال یعنے اُن کی والدہ بیوی اور چاروں بچے (چراغ علی۔ ولایت علی عنایت علی اور منصب علی) میرٹھ واپس آ گئے۔

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی۔ لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی۔ اور سوائے معمولی اُردو۔ فارسی اور انگریزی سے نہ کسی اَور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے۔ اسی زمانہ میں کمشنری گورکھ پور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا وہاں کے خزانے کی منشی گری پر جس کی تنخواہ بیس روپیہ تھی مرحوم کا تقرر ہوا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انہیں ابتدا سے تھا۔ سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ تعلیقات اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ اس کے منشور محمدی۔ مخبر صادق لکھنو وغیرہ میں بھی ان کے اکثر مضامین شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں مولوی محمد زکریا صاحب سہارن پور سے بستی میں محکمہ انجینیری میں مقرر ہوکر آئے اور چونکہ مولوی صاحب کے تعلقات ان سے اور اُن کے خاندان سے قدیم تھے لہذا دونو صاحب ایک ہی جگہ رہنے سہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد مولوی محمد زکریا صاحب بستی کی خدمت سے مستعفی ہوکر لکھنو چلے گئے اور وہاں اُن کا ایک اچھی خدمت پر تقرر ہوگیا وہاں سے انہوں نے مولوی چراغ علی کو اطلاع دی کہ آپ کے والد کے محسن مسٹر گوراوسلی یہاں جوڈیشل کمشنر ہیں۔ اگر آپ یہاں آئیں اور ان سے ملیں تو اغلب ہے کہ کوئی معقول خدمت مل جائے۔ چنانچہ اس اطلاع پر غالباً ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں مولوی چراغ علی لکھنو گئے اور مسٹر گوراوسلی سے ملے۔ اتفاق سے اس وقت جوڈیشل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصرمی کی جگہ خالی تھی لہذا اس وقت اُن کا تقرر اسی خدمت پر بمشاہرہ لسہ ہوگیا۔ کچھ دنوں بطور قائم مقام رہے بعد میں مستقل ہوگئے تھوڑے عرصے کے بعد سیتاپور

میں تبادلہ ہو گیا۔

مولوی چراغ علی کا میلان طبع شروع سے مذہب کی طرف تھا انہوں نے ہمیشہ یا تو عیسائی معترضین کے جواب لکھے یا مذہب اسلام کی حقانیت ظاہر کی۔ چونکہ اس عالم کا یہ قانون ہے کہ قوی تر شئے اپنے سے کم قوی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لئے مولوی چراغ علی بھی خود بخود امام وقت کی طرف جھکے۔ اور وحدت ذوق سرسید رح سے اُن کے تعارف کا باعث ہوئی۔ اگرچہ اب تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ اور تہذیب الاخلاق میں بھی اُن کے بعض مضامین شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ جب سرسید رح لکھنؤ تشریف لائے تو مولوی صاحب مرحوم اُن سے ملنے کے لئے سیتاپور سے لکھنؤ گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب ریاست حیدرآباد سے کچھ کام ترجمہ وغیرہ کا سرسید رح کے پاس آیا تو اُنھوں نے مولوی چراغ علی کو اُس کام کے سرانجام دینے کے لئے منتخب کیا۔ اس بنا پر ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ علی رخصت لیکر علی گڑھ گئے اور کئی مہینے سرسید رح کے پاس رہ کر اس کام کو بکمال خوبی انجام دیا۔ جس کا معاوضہ بھی ریاست سے اُن کو ملا۔ اس کے ایک سال بعد (۱۸۷۷ء) میں نواب سرسالار جنگ اعظم نے بتوسط مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک) مرحوم سرسید رح سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسید رح نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدرآباد چلے آئے۔ جہاں وہ عہدہ اسسٹنٹ رونیو سکرٹری (مددگار معتمد مالگزاری) پر بمشاہرہ چار سو روپیہ مامور ہوئے۔ معتمد مالگزاری اس وقت نواب محسن الملک مولوی مہدی علی مرحوم تھے۔ اس وقت سے مولوی چراغ علی کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔

کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلےٰ قابلیت کا ہونا بالکل ممکن ہے
لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اَور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ
رکھنا چاہیگی اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش
کرے گی تو اُس کی ترقی شاہراہ تمدن پر بہت سست ہوگی۔ دنیا میں کسی
قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اُٹھائے بغیر
دنیا میں اعلیٰ ترقی کی ہو۔ ابتدا ابتدا میں مسلمانوں کی فتوحات اپنی ذاتی قوت
سے دنیا میں آناً فاناً میں پھیل گئی لیکن ان فتوحات کو قائم رکھنے یا وسیع کرنے
کے لئے یہی کافی نہ تھا۔ پھر جب انہوں نے عجم میں قدم رکھا اور امن و جنگ۔
تجارت وسفارت کے ذریعہ سے انہیں روزانہ دوسری اقوام سے سابقہ پڑا
تو اُس وقت سے ان کی ترقی کی بنیاد مستحکم ہونے لگی۔ آخر انہی لوگوں نے
یونان کی علم و حکمت کو زندہ کیا اور تمدن میں ایسی ترقی کی کہ جس سے ایک عالم
میں اُجالا ہوگیا۔ یہی حال یونان و روما اور یورپ و دیگر اقوام کی ترقی کا ہے۔
تازہ مثال جاپان کی ہے۔ وہی جاپان جو اپنے آپ کو غیر ملک والوں کی
ہوا تک نہیں لگنے دیتا تھا اور غیر صورت کو دیکھ کر چونک اُٹھتا تھا آج انہیں
سے اُن کے گر سیکھ کر اُن کا اُستاد بنا چاہتا ہے۔ اہل جاپان کی ترقی کا ایک
راز یہ بھی ہے کہ جو کام وہ خود نہیں کر سکتے تھے وہ اُنہوں نے غیر ملک والوں
سے ملازم رکھ رکھ کر لیا اور پھر خود سیکھ کر اُن کی معلمی سے مستغنی ہوگئے۔ چنانچہ
ابتدا میں اُنہوں نے ریلوے۔ ٹیلیگراف۔ لائٹ ہوس اور بحری فوج کا
انتظام انگریزوں کے سپرد کیا۔ قانونی اصلاح اور فوجی تربیت اہل فرانس کے
ہاتھوں ہوئی۔ تعلیمی معاملات۔ ڈاکخانہ کے انتظام اور زراعت میں اہل امریکہ
سے سبق لیا۔ طبی تعلیم۔ تجارتی قواعد۔ لوکل گورنمنٹ کا دستور اور فوجی افسروں

کی تعلیم جرمن والوں کے حوالہ کی اور سنگ تراشی (مصوری) میں اٹلی والوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ غرض ابتدا میں ان سب سے کام لیا اور پھر خود سیکھ کر ان میں ایسا کمال پیدا کیا کہ آج دنیا کی اعلیٰ دول میں ان کا شمار ہے۔ یہ زمانہ تجربات کا زمانہ ہے اور جاپان نے جو تمدن کی مختلف اور بے شمار شاخوں میں اس قدر جلد اور قابل تعریف ترقی کی ہے اسے اگر انیسویں صدی کا اعجاز کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ سرسالار جنگ اول کی تدبیر اور چارہ سازی اور جاپان کی بیداری کا بالکل ایک زمانہ تھا۔ جاپان نے اپنے ملک کو ہشیار کرنے اور اپنے تمدن کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تدبیر اختیار کی تھی بعینہ وہی تدبیر اس دوربین اور عالی دماغ وزیر نے اس ملک میں اختیار کی اور باہر سے قابل۔ تجربہ کار اور شائستہ لوگوں کو بلا کر کام لیا۔ ان لوگوں نے ملک کے انتظامات کو درست کیا۔ پرانی خرابیوں کی اصلاح کی۔ نئے نئے دفاتر قائم کیے اور ان کو صحیح اصول پر چلایا۔ ملک کے ذرائع آمدنی پر غور کیا۔ اور آمدنی کو بڑھایا۔ تعلیم کو رونق دی۔ تہذیب و شائستگی پھیلائی، اور ملک اور گورنمنٹ کو خاصا مہذب اور شائستہ بنا دیا۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ جاپان اس عرصہ میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور یہ ملک وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرونی امداد بڑی کارآمد اور مفید چیز ہے بشرطیکہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لئے سب کچھ ہوتا چلا جائے تو یہ محض خیال بلکہ جنون ہے۔ اہل جاپان میں حب وطنی کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور ہر جاپانی اس شد و مد اور جوش سے کام کرتا تھا کہ گویا ساری سلطنت کا بار اسی کے سر پر پڑنے والا ہے، اور ہر شخص کی دلی آرزو یہ تھی اور اسی خیال سے

محنت کرتا تھا کہ وہ سارے عالم میں جاپان کی دھاک بٹھا دے اور طرفۃ العین میں اُسے عروس الممالک بنا دے۔ برخلاف اس کے یہاں یہ باتیں ابھی خواب وخیال سے بھی کوسوں دور ہیں۔ دفاتر اور ہر قسم کے سررشتے جو ایک مہذب ملک میں ہونے چاہئیں یہاں بھی موجود ہیں۔ کونسلیں ہیں، کمیٹیاں ہیں، قابل سے قابل ڈگری یافتہ افسر بھی ہیں۔ کمیٹیاں ہوتی ہیں، تجویزیں پیش ہوتی ہیں، رزولیوشن پاس ہوتے ہیں، نئی نئی اسکیمیں جاری ہوتی ہیں، روپیہ وصول ہوتا ہے، ذرائع آمدنی بھی سوچے جاتے ہیں، رپورٹیں بھی لکھی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن حیات کا نام نہیں۔

سرسالار جنگ نے اس تدبیر کے ساتھ بڑی دانشمندی یہ کی تھی کہ ابتدا میں انہوں نے قابل لوگوں کو سرسید رح سے طلب کیا۔ یہ دو عالی دماغ شخص سرزمین ہندوستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے مسلمان اُن پر جس قدر فخر کریں وہ بجا ہے۔ اور ایسے وقت میں ہوئے جبکہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ سرسید رح کے انتخاب اور سرسالار جنگ مرحوم کی قدردانی اور کارفرمائی نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ اس طرح جو لوگ انتخاب کئے گئے انہوں نے اپنے فرائض کمال وفاداری اور قابلیت سے ادا کئے۔ اور وہ ہمیشہ عزت وحرمت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔ اُنہیں میں سے ایک مولوی چراغ علی مرحوم بھی تھے۔

ابتدا میں مولوی چراغ علی کا تقرر مددگاری معتمدی مالگزاری پر بمشاہرہ چارسو روپیہ ماہانہ ہوا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد سات سو روپیہ ہو گئے۔ بعد ازاں عہد وزارت نواب عماد السلطنۃ مرحوم میں جب نواب محسن الملک مرحوم معتمد پولٹیکل وفینانس مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی کا تقرر معتمدی مالگزاری پر

بمشاہرہ پندرہ سو روپیہ ۔ ۱۔ عہد وزارت سر آسمان جاہ بہادر مرحوم میں جب کہ مصالح وقت مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) معتمد مالگزاری مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی صوبہ داری ورنگل پر مامور ہوئے اور پھر صوبہ داری گلبرگہ پر تبادلہ ہوگیا۔ دو سال بعد نواب محسن الملک مرحوم کے چلے جانے پر معتمد مال وفنانس مقرر ہوئے۔

غالباً مولوی چراغ علی سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کو اس طرح بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانبداری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وہ یہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیش نظر رہتے تھے اور انہیں پر سے وہ بلا رُو رعایت فیصلہ کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل حیدرآباد جو ان باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ وہ روزانہ سوائے اہم امور کے بہت کم کام کرتے تھے۔ جب کام بہت سا جمع ہو جاتا تھا تو دو تین روز جم کر کام کرتے تھے اور سب کو ایک ہی دفعہ ختم کر دیتے تھے۔ وہ کبھی طول طویل فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم مسلوں اور مدتوں کے پیچیدہ معاملات کو چند سطروں میں سلجھا دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا معاملے کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ ان کی تحریر جامع دمانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی اور یہی حال اُن کا تمام تصانیف کا ہے۔ لفظ اشد ضروری سے انہیں سخت چڑ تھی، اور اس قسم کے جو مراسلات آتے وہ انہیں اُلٹا کے پھینک دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ سمجھتے سمجھاتے خاک نہیں، خواہ مخواہ مراسلات پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب مرحوم نے لکڑی کا ایک صندوق بنا رکھا تھا، جو اشد ضروری لفافہ آتا وہ اس میں بے پڑھے

ڈال دیتے تھے۔ ایک بار مدار المہام بہادر کے ہاں کمیٹی تھی، اُس میں اُن کے بعض ہمعصر و ہم رتبہ معزز عہدہ داروں نے مدار المہام بہادر کے سامنے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے ہیں یا سوتے رہتے ہیں کہ ہمارے ضروری اور اشد ضروری مراسلات کا بھی جواب نہیں دیتے۔ مولوی صاحب نے کہا ذرا تامل فرمائیے، میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ آدمی سے کہا وہ صندوق لاؤ۔ صندوق آیا اور انہوں نے مدار المہام بہادر سے مخاطب ہو کر کہا کہ سرکار دیکھئے ان صاحبوں کے تمام اشد ضروری لفافے اس میں موجود ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک لفافہ بھی نہیں کھولا، سب کے سب بند پڑے ہیں۔ اب میں ان میں سے کوئی سا ایک اٹھا لیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ان میں سے ایک لفافہ اٹھا لیا۔ اسے کھولا تو اس میں یہ لکھا تھا کہ فلاں تختہ بھیج دیا جائے۔ مراسلہ پڑھ کر سُنا نے کے بعد مدار المہام سے عرض کی کہ اس کا اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ یہ کونسا اشد ضروری کام تھا۔ یہ لوگ اشد ضروری کے معنے نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ لفافوں پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ میں جواب نہیں دیتا۔ پھر فرمایا کہ شاید سال بھر میں دو تین ہی واقعہ اشد ضروری درپیش آتے ہوں گے۔ ان حضرات نے ہر ایک بات کو اشد ضروری خیال کر لیا ہے۔

مولوی طالب الحق صاحب مددگار صدر محاسب جو سرکار عالی کے ایک نہایت متدین، قابل اور تجربہ کار عہدہ دار ہیں اور سر سالار جنگ مرحوم کے زمانے سے اب تک مختلف عہدوں پر رہے ہیں اور خود بھی مولوی چراغ علی مرحوم کے تحت میں کام کر چکے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگرچہ مجھے سرکار عالی میں ایسے ایسے عہدہ داروں کے ساتھ کام کرنے کا سابقہ ہوا ہے جو اپنے اپنے کمال اور

خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے، لیکن مرحوم میں بعض ایسی خصوصیات تھیں کہ پھر کسی میں نظر نہ آئیں۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھے، بڑی غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے، اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے، گویا وہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ مولوی صاحب موصوف نے راقم سے ایک خاص معاملے کے متعلق ذکر کر کے فرمایا (اور اس کی مسل کا بھی حوالہ دیا) کہ مرحوم کی زمانۂ مددگاری میں سر سالار جنگ مرحوم نے مولوی صاحب مرحوم کی رائے سے اس میں اختلاف کیا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا رجحان معتمد (نواب محسن الملک مرحوم) کی طرف ہے۔ اور مولوی صاحب مرحوم کی رائے پر چند سوالات کیئے۔ مرحوم نے نہایت مدلل جواب دیا۔ اس پر کچھ سر سالار جنگ مرحوم نے اعتراض اور سوال کیئے، ادھر سے پھر اس کا جواب ادا کیا گیا۔ کوئی چار پانچ مرتبے ایسے ہی سوال و جواب ہوئے، اور آخر نواب مدار المہام بہادر مرحوم قائل ہو گئے اور یہ تحریر فرمایا کہ میں دیکھتا تھا کہ آپ اپنی رائے کے متعلق کیا دلائل رکھتے ہیں اور بیشک آپ کی رائے صحیح اور درست ہے۔ اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور ان کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے ایک دو لفظ کہہ دیتے تھے جس سے مافی الضمیر ادا ہو جائے۔ جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ نہایت تیز فہم اور صائب الرائے تھے۔

جناب مولوی سید علی حسن خاں بہادر سابق معتمد فینانس و حال وزیر جاورہ جو مولوی چراغ علی مرحوم کے بہترین جانشین ہوئے اور بوجہ اپنی اعلیٰ قابلیت تدین، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے

ہماری قوم کے بے مثل افراد میں سے ہیں راقم سے فرماتے تھے کہ ایک بار نواب سروقارالامرا بہادر مرحوم فرمانے لگے کہ مولوی چراغ علی بھی عجیب وغریب آدمی تھے۔ اور اس کے بعد اُنہوں نے ایک پارسی جنٹلمین کا واقعہ بیان کیا جسے وظیفہ رعایتی یا رقم دینے کے متعلق نواب صاحب مرحوم نے حکم دیا تھا۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے معاملہ کو ڈال رکھا تھا۔ اُس نے آکر نواب صاحب سے شکایت کی کہ معتمد صاحب کچھ تصفیہ نہیں کرتے اور معاملہ کو ڈال رکھا ہے۔ نواب صاحب نے پھر حکم لکھا۔ مولوی صاحب مرحوم پھر چپ سادھ گئے۔ اس نے کچھ عرصہ کے بعد پھر شکایت کی۔ نواب صاحب نے پھر لکھا مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بیچارہ سائل کچھ دنوں تک اپنے معاملہ میں تگ ودو کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی تو پریشان ہو کر پھر نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو دیا دھویا۔ نواب صاحب مرحوم جو مروت کے پتلے تھے فرمانے لگے کہ اچھا جب مولوی چراغ علی یہاں آئیں تو ہمیں یاد دلا دینا۔ غرض وہ تاک میں رہا جس روز مولوی صاحب بارگاہ وزارت میں حاضر ہوئے تو اس نے یاد دہانی کرائی۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ میں نے فلاں معاملہ میں آپ کو تین بار حکم دیا، مگر آپ نے اب تک اُس میں کچھ نہ کیا۔ مولوی صاحب نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا اور مسل صندوق میں سے نکال کر سامنے رکھ دی۔ نواب صاحب نے کسی قدر جھنجلا کے کہا کہ میں مسل کو کیا کروں آپ کو کئی بار لکھا گیا ہے اور آپ نے اب تک ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ مولوی صاحب نے اُس کے جواب میں فرمایا کہ "آپ اس لئے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لٹا دیں۔ آپ کا کام خزانہ کی حفاظت

ہے۔" یہ جواب سُن کر نواب صاحب مرحوم بالکل ساکت رہے، اور پھر کبھی آپ نے مولوی صاحب سے اس معاملہ کے متعلق تحریک نہیں کی۔ یہ واقعہ خود نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کی زبانی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سوائے مولوی چراغ علی کے کوئی دوسرا شخص یہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے اُن کی اخلاقی جرأت اور راست بازی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولوی سید علی حسن صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ اضلاع پر سے جو تختے (گوشوارے) آتے تھے اور اُن پر جو مولوی صاحب مرحوم تنقیح کرتے تھے اس سے اُن کی دقتِ نظر اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ جو عہدہ دار کہ بڑے بڑے دورے کرتے ہر معاملہ کی چھان بین کرتے اور انتظامی معاملات میں باخبر رہتے تھے، اُن سے تعلقدار لوگ اتنا نہیں ڈرتے تھے، جتنا مولوی چراغ علی مرحوم کی گھر بیٹھے تختوں کی تنقیح سے

مطالعہ میں بے حد شغف تھا۔ گویا یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی، اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے جاتے تھے۔ اور انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں، اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سو گئے، اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے اتنے میں سو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔ مسٹر محبوب علی (سپرنٹنڈنٹ مدرسہ حرفت و صنعت اورنگ آباد فرزند مرحوم) اپنی والدہ کی زبانی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتی تھیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو اُن کے سینے پر سے کتاب اُٹھا کے رکھوں ورنہ کتاب کے جلد پٹھے سب ٹوٹ کے رہ جاتے۔ تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک

آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں تو البتہ جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔ اُن کا کُتب خانہ قابل دید تھا، اور اس میں بہت کم ایسی کتابیں تھیں جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہوں، یا جن پر اُن کے نشان یا نوٹ نہ ہوں مطالعہ میں اُنہیں ایسی محویت رہتی تھی کہ کچھ ہو جائے اُنہیں خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مولوی سید تصدق حسین صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ کو جو بہت با وضع اور ہمدرد بزرگ ہیں، علاوہ قدیم تعلقات کے ایک مدت تک شب و روز مرحوم کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، مرحوم کے ملازم کلو کی زبانی فرماتے تھے کہ بلدہ میں مرحوم کا جو بنگلہ ہے اُس میں ڈرائنگ روم کے سامنے ایک شہ نشین ہے۔ اُس کے نیچے تہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹھ کباڑ اور ڈیرے خیمے پڑے رہتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب مرحوم اس شہ نشین پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اتفاق سے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور دھواں نکلنا شروع ہوا۔ ملازموں نے بہتیرا شور و غل مچایا کہ آگ لگی۔ مگر حضرت کو کچھ خبر نہیں۔ غرض آگ لگی اور بجھ بھی گئی، مگر آپ جس طرح کتاب پڑھ رہے تھے پڑھتے رہے اور یہ بھی تو خبر نہ ہوئی کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔ مولوی انوار الحق صاحب نے اپنی چشم دید واقعہ جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کھانا کھا رہے تھے اور اس کے نیچے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور وہ اسی طرح بے تکلف بے ہراس کھانا کھاتے رہے۔ یا تو یہ دونو واقعے ایک ہیں یا کلو کے بیان کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے۔ اور اس سے اُن کی استقلال طبع کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ایک دوسرا واقعہ اسی قسم کا ایک صاحب نے اپنی چشم دید

بیان کیا ہے۔ کہ ایک مقام پر ٹانگہ میں سوار دورہ کر رہے تھے۔ رستے میں ٹانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اُسی میں پڑے پڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ لوگ گئے اور کسی دوسری جگہ سے ٹانگہ کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو آپ اُس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اُس کی تہ تک پہنچتے اور اُس کے مالہ و ماعلیہ کے سُراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے، اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیئے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے، اور لوگوں کو بھیج کر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے، چنانچہ اسی غرض سے مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی کو بغرض تلاش کتب مصر کو روانہ کیا تھا مولوی عبد اللہ صاحب مرحوم نے جو خط مرحوم کو مصر سے لکھا تھا وہ ہم نے خود دیکھا ہے، اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر اُنہوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیئے بہت کم گنجایش چھوڑی ہے اُن کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، اور مواد فراہم کرنے کے لیئے اُنہوں نے کس قدر محنت اور مشقت اُٹھائی ہے۔

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب سابق اسسٹنٹ سکریٹری پولٹیکل فنیانس وناظم مردم شماری (انشوشنٹ رائل اسکول آف مائنز، فیلو آف دی جیولاجیکل سوسائٹی وغیرہ وغیرہ) راقم سے فرماتے تھے کہ جب برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ریاست میں مسٹر کرالی کے کنٹرو جنرل مقرر ہونیکی

خبر آئی تو چونکہ مولوی صاحب مرحوم فنانشل سکرٹری تھے، انھیں فکر ہوئی۔ آخر انھوں نے فنانس پر انگریزی میں جس قدر مستند اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں تھیں سب منگوالیں، اور ان کا خوب مطالعہ کیا اور دو مہینے میں اس قدر عبور حاصل کیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی، اور فنانشل معاملات پر گفتگو ہوئی تو وہ مولوی صاحب کے وسیع معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اسی طرح جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہندی موسیقی پر یورپین لوگوں کو اعتراض ہے۔ تو انھوں نے اسے سیکھنا شروع کیا اور پیانو پر گیتیں نکالنی شروع کیں ان کا ارادہ تھا کہ ہندی موسیقی کو سائنٹفک طور پر مدوّن کریں۔ چنانچہ لکھنا بھی شروع کیا تھا اور اس کا ناتمام سا مسودہ اب بھی موجود ہے۔ لیکن اس کام کے لئے بڑی فرصت درکار تھی لہذا اُسے انجام نہ دے سکے۔ علم ہیئت میں بھی انھیں خوب دخل تھا۔

متعدد علوم اور کئی زبانوں کے عالم تھے۔ چنانچہ سرسید اُن کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں "متعدد علوم میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے، عربی و کالڈی زبان میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے، فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے انگریزی زبان میں بھی انھوں نے تصنیفیں کی ہیں چنانچہ ان کی تصنیف انگریزی زبان میں بھی ہیں جن کا مفصل ذکر ان کی مذہبی تصنیفیں آگے چل کر بیان کیا جائیگا۔ لیکن یہاں اس قدر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی ابتدائی تعلیم خاص کر انگریزی زبان میں بہت کم ہوئی تھی لیکن انھوں نے صرف اپنے مطالعہ کے زور سے انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت اور دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ صرف ہم ان کی مطبوعہ کتب کو ہی دیکھ کر نہیں کہتے بلکہ ہم نے ان کے

ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی دیکھے ہیں۔ اُن کی انگریزی کتابوں پر ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات نے جو زبردست ریویو لکھے ہیں ان میں ان کی انگریزی تحریر کی بھی تعریف ہے۔ ہم بطور نمونہ یہاں ایک دو ریویوؤں سے صرف اُن کی انگریزی دانی کے متعلق چند فقرے نقل کرتے ہیں:۔

اسے ٹی ویم نے جو انگلستان کا ایک مشہور پرچہ ہے اور جس کی ادبی تنقید کی دھوم ہے ان کی کتاب زیر دیباچہ پر ایک بڑا ریویو لکھا اور لکھا ہے کہ "مولوی صاحب کی انگریزی قابل قدر ہے" (بابت ۵ جنوری ۱۸۸۴ء)۔

بمبئی گزٹ جو بمبئی پریسیڈنسی کا بہت قابل قدر اخبار ہے لکھتا ہے "یہ کتاب نہایت عمدہ انگریزی میں لکھی گئی ہے (بمبئی گزٹ بابت ۲۱ جولائی ۱۸۸۳ء)۔

جرنل آف دی انجمن پنجاب نے دو نمبروں میں اس کتاب پر بہت بڑا ریویو لکھا ہے اور اُس میں لکھتا ہے کہ "مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ شرع مذہب اسلام کا بڑا عالم ہے"۔

مولوی انوار الحق صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھ سے سید محمود مرحوم کا خط مولوی چراغ علی کے نام دیکھا جس میں سید محمود مرحوم نے مولوی صاحب کے وسیع معلومات اور ان کی انگریزی دانی اور انگریزی کی بڑی تعریف کی تھی۔

علاوہ مذہبی تصانیف کے جن کا ذکر مفصل طور پر الگ کیا جائیگا یہاں اُن کی بعض اُن تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے سرکاری تعلق اور حیثیت سے لکھیں یہ سب انگریزی زبان میں ہیں۔

(۱) بجٹ (موازنہ) سب سے اول مولوی چراغ علی مرحوم نے تیار کیا۔ اگرچہ موازنہ اب کچھ کا کچھ ہو گیا ہے اور خاصہ ایک دفتر ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کا یہ قول ہے کہ جو اختصار اور صفائی اُس موازنہ میں پائی جاتی ہے وہ موجودہ موازنہ میں نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آج کل موازنہ کی ترتیب میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے لیکن بفوائے الفضل للمتقدم فضیلت کی دستار مولوی صاحب مرحوم ہی کے سر رہے گی۔

(۲) اڈمنسٹریشن رپورٹ (رپورٹ نظم و نسق) بابت ۱۸۸۴ء ۱۸۸۵ء لکھی جو چھ سو سینتیس ۶۳۷ بڑے بڑے صفحوں پر ہے۔ اس قسم کی پہلی رپورٹ ہے۔ اور بعد ازاں جتنی رپورٹیں لکھی گئی وہ سب اسی کی پیروی میں لکھی گئیں۔

(۳) حیدرآباد (دکن) انڈر سر سالار جنگ۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور ریاست کی انتظامی حیثیت سے نہایت قابل قدر اور بے مثل کتاب ہے۔ مولوی صاحب مرحوم نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت اور جان کاہی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر بحث اس میں اُن تمام انتظامات اور اصلاحات سے ہے جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں عمل میں آئیں۔ لیکن جس انتظام اور صیغے پر اُنھوں نے قلم اُٹھایا ہے اُسے ابتدا سے لیا ہے اور اُس کی اصل، تغیرات، وجہ تسمیہ اور تاریخی حیثیت وغیرہ کو محققانہ طور سے بیان کیا ہے اور اُس کے متعلق تمام مواد اور اعداد کو گوشواروں کی صورت میں مہیا کر دیا ہے۔ علاوہ اس تاریخی اور انتظامی حیثیت کے ساتھ ساتھ ممالک محروسہ سرکاری کا مقابلہ آس پاس کے صوبہ جات

سے بھی کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھے بغیر کوئی شخص حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ حالت انتظامی سے پورا واقف نہیں ہو سکتا خصوصاً جن لوگوں کے ہاتھ میں انتظام کی باگ ہے، انہیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری بلکہ لازمی ولابد ہے۔ اس کتاب کو مولوی صاحب مرحوم نے نواب سرسالار جنگ کے نام سے معنون کیا ہے۔ اگرچہ کتاب نواب صاحب مرحوم کے زمانہ میں آپ کی اجازت سے لکھنی اور چھپنی شروع ہو گئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کے اختتام سے قبل راہی ملک بقا ہو گئے بعد میں فاضل مؤلف نے اپنی احسانمندی کے اظہار میں نواب مرحوم کے نام سے اُسے منسوب کیا۔ انگریزی اخبارات نے اس پر بہت عمدہ عمدہ ریویو کئے ہیں اور فاضل مؤلف کی محنت و تحقیق کی داد دی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ اپنے نمبر مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب کے تاریخی اور اعدادی حصہ میں بڑی محنت اور احتیاط صرف کی ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ وہ حصہ ہے جس میں موجودہ نظم و نسق کی کیفیت درج ہے۔ اس میں متجسس ناظرین اُن مختلف محکموں اور سررشتوں کے طرز عمل اور حقیقت کو دیکھیں گے جو سرسالار جنگ کی بدولت ایسے وقت میں ظہور میں آئے جبکہ بے عنوانی اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی اور اُنھوں نے نظم و ترتیب کی صورت قائم کی"۔

اسی طرح اُس وقت کے رزیڈنٹ مسٹر کارڈی نے اپنے خط مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں مولوی صاحب مرحوم کے نام سے اس کتاب کی بہت تعریف لکھی ہے۔

اسی کا ایک ضمیمہ صرف خاص انڈر سر سالار جنگ ہے - جس میں اُن اصلاحات و ترقیات کا ذکر ہے جو سر سالار جنگ کی تدبیر و دانشمندی سے علاقہ صرف خاص میں عمل میں آئیں -

(۴) جاگیرات و جاگیرداران - افسوس یہ کتاب ناتمام رہ گئی - مولوی صاحب ارادہ تھا کہ اس میں تمام جاگیرداران و جاگیرات محروسہ سرکار عالی کی اصل اور تاریخ، اُن کا رتبہ اور آمدنی، پیدا خدمات و حقوق و مستثنیات، اور دیگر تمام ضروری اور مفصل حالات درج کریں۔ لیکن اس کے لیے انہیں مواد بہم پہنچانے میں بہت دقت پیش آئی یہاں کے جاگیردار صاحبان مولوی صاحب کے اس کام کو غالباً شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور مراسلوں کے جواب میں حوصلہ شکن تساہل سے کام لیتے تھے - یہی وجہ ہے کہ مرحوم کی زندگی میں یہ کتاب ختم نہ ہونے پائی - اور اُن کے بعد جو لوگ عہدہ فنانشل سکریٹری پر اُن کے جانشین ہوئے - اُن میں سے نہ کسی کو اس سے دلچسپی تھی اور نہ اتنی فرصت کہ اس کام کو انجام تک پہنچاتا - لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو نہ صرف دلچسپ ہوتی بلکہ بہت سی عمدہ معلومات کا خزانہ ہوتا جو گورنمنٹ اور ملک دونوں کے لیے مفید ہوتا -

غرض مولوی چراغ علی مرحوم نہ صرف بحیثیت ایک مصنف کے بلکہ بحیثیت ایک عام انسان کے بھی ایک عجیب و غریب شخص تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے میں اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے - عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے، اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور پر قدر

کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے دوسرے انہیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ وہ ایسی ہنسی بہلانے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوائے دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جز بز ہوتے تھے، کبھی اخبار اٹھا لاتے، کبھی کتاب پڑھنے لگتے۔ عام طور پر بہت کم سخن تھے، بہت اختصار کے ساتھ اپنا مطلب ادا کرتے تھے، اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے، اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے۔ مثلاً اگر کسی بچے نے کسی پودے کی نسبت پوچھا تو آپ پورا حال اس پودے کا اور پودوں کی نشوونما اور آب و ہوا اور زمین کے اثر کا بیان کر دیتے اور ان چھوٹی چھوٹی مگر مشکل باتوں کو نہایت صفائی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہیں وہ بڑے ہو کر نہیں رہتی۔ بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تو تصنع اور کچھ ادب اور لحاظ ہوتا ہے، پھر مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا، چھوٹا پن اور بزرگی کے خیالات

پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی بتانے والا ہو تو اُس وقت انہیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی بہت سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپیہ پیسہ کی بالکل محبت نہیں تھی بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے، نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے، نہ کبھی کسی معاملہ میں اُن سے بازپرس کرتے، اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے اُن کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ ڈالی مگر خفا ہونا تو درکنار انہوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیونکر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔ مولوی صاحب مرحوم کے بھتیجے مولوی محمد علی صاحب جو نیک سیرتی اور سادگی میں اپنے والد مرحوم اور چچاؤں کی سچی یادگار ہیں، راقم سے فرماتے تھے کہ رات کا کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ جب ہم نے انہیں کام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر سوئے، پھر اُٹھ کر لکھنے یا پڑھنے بیٹھ گئے، اور پھر سو گئے، اور اس کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ دوسرے کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ چونکہ ذیابیطس کی شکایت تھی، پانی زیادہ پیتے تھے، اور یوں بھی رات کے وقت وہ اکثر کام کرتے رہتے تھے لیکن کبھی کسی نوکر کو نہ بلاتے اور خود ہی سب کام کر لیتے تھے۔

غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج کوہ وقار، عالی خیال شخص تھے۔ کبھی اپنا وقت بیکار ضائع جانے نہیں دیتے تھے۔ ہر وقت مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اور ایسے وقت میں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ بات چیت

کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زاید باتوں سے انہیں طبعی نفرت تھی۔ یہ حال غیروں ہی سے نہ تھا بلکہ بیوی بچوں سے بھی یہی کیفیت تھی۔ سب کی سن لیتے تھے مگر اپنی کچھ نہیں کہتے تھے، کبھی کسی سے مناظرہ اور بحث نہیں کرتے تھے، کوئی کچھ کہا کرے، انہیں جو کچھ کرنا ہوتا تھا کر گزرتے تھے۔

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ
} حالی

وقار اور متانت اُن پر ختم تھی، استقلال میں پہاڑ تھے، آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کہیں نہ چوکتے تھے، مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اسلام کے سچے حامی تھے، اور اُن کی عمر اور محنت کا زیادہ حصہ اسی میں گزرا۔ اُن سے پہلے صرف دو شخصوں نے انگریزی زبان میں یوروپین مصنفین کے اعتراضات کی تردید اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی تھیں، ایک تو سر سید جن کی کتاب خطبات احمدیہ کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور دوسرے رائٹ آنریبل مولوی سید امیر علی بالقابہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس مبحث پر کتابیں لکھی ہیں اُس کی اس وقت تک نظیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود اُن کے حریف ریورنڈ کینن میکال نے اُن کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے نہایت بے تعصب تھے اور کسی مذہب و ملت سے انہیں خصومت یا پرخاش نہ تھی، یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، چنانچہ گزشتہ مردم شماری سے قبل جب مردم شماری ہوئی تو انہوں نے مذہب (فرقہ) کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے لفظ شیعہ لکھ دیا، لیکن اپنے

اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھدئے۔ اس سے ان کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے، اور باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔

اس موقع پر یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب ہم مولوی صاحب مرحوم کی حالات کی جستجو میں تھے تو ہمیں مولوی صاحب کے کاغذات میں سے چند خطوط مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم کے بھی ملے جو انہوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پُرزور کتاب براہین احمدیہ کی تالیف میں مدد طلب کی تھی۔ چنانچہ مرزا صاحب اپنے ایک خط میں کہتے ہیں کہ "آپ کا افتخار نامہ محبت آمود . . . . عز ورود لایا۔ اگرچہ پہلے سے مجھ کو یہ نیت الزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثبات نبوت و حقیت قرآن شریف میں ایک عرصہ سے سرگرمی تھی مگر جناب کا ارشاد موجب گرم جوشی و باعث اشتعال شعلہ حمیت اسلام علی صاحبہ السلام ہوا اور موجب ازیاد تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحب فضیلت دینی و دنیوی تہ دل سے حامی ہو، اور تائید دین حق میں دل گرمی کا اظہار فرماوے تو بلا شائبۂ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہیے جزاکم اللہ نعم الجز . . . . ماسوائے اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائج طبع عالی سے جمع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں۔" ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں "آپ کے مضمون اثبات نبوت کی اب تک میں نے انتظار کی، پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا، اس لئے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید

طیار کرکے میرے پاس بھیج دیں ' اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا براہین احمدیہ علی حقانیہ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے ' اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اُس میں درج کروں اور اپنے مختصر کلام سے اُن کو زیب و زینت بخشوں۔ سو اس امر میں آپ توقف نہ فرماویں اور جہاں تک جلد ہوسکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون فرماویں '' اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوت اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ " دوسری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے ' اور اُمید کہ عنقریب آجائے گا اور پنڈت دیانند کی وید بھاش کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں ' اور اُن کا ستیارتھ پرکاش بھی موجود ہے ' لیکن تاہم آپ کو بھی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہوں یا جو وید پر اعتراض ہوتے ہوں ' اُن اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتب مسلّمہ آریہ سماج کی صرف وید اور منوا سمرت ہے ' اور دوسری کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں۔ میں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثبات نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنود کے وید اور اُن کے دین پر بھی سخت سخت اعتراض کیے جائیں کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلاف حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو تب تک گو کیسی ہی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے اُن پر ثابت کیے جائیں۔

اپنے دین کی طرفداری سے باز نہیں آتے، اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اسی میں گزارہ کر لیں گے۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ کے کتاب کے اندر درج کر دوں گا۔" ایک اور خط مورخہ ۱۹ر فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں "فرقان مجید کے الہامی اور کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعث ممنونی ہے نہ موجب ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارے میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے۔ اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائیگا۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہات صداقت قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں، تا اُسے رسالہ میں حسب موقع اندراج پا جائے یا سفیر ہند میں . . . . . لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانہ گزشتہ سے تعلق رکھتے ہوں اُن کا تحریر کرنا ضروری نہیں، کہ منقولات مخالف پر حجت قویہ نہیں آسکتیں۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا جو عندالعقل اُس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیئے۔ بہرصورت میں اُس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی۔ آپ بمقتضا اس کے کہ الکریم اذا وعد۔ وفا مضمون تحریر فرماویں۔ لیکن یہ کوشش کریں کہ کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے۔ اور آخر میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق بخشے کہ منکر کتاب الٰہی کو دندان شکن جواب سے ملزم اور نادم کریں۔ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔" اس کے بعد ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰ر مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں "کتاب (براہین احمدیہ) ڈیڑھ سو جز ہے جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپیہ۔

اور آپ کی تحریر محققانہ ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائیگی"۔
ان تحریروں سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے مرزا صاحب مرحوم کو براہین احمدیہ کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی ہے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو حمایت وحفاظت اسلام کا کس قدر خیال تھا۔ یعنے خود تو وہ یہ کام کرتے ہی تھے مگر دوسروں کو بھی اس میں مدد دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب مولوی احمد حسین صاحب امروہی نے اپنی کتاب تاویل القرآن شائع کی تو مولوی صاحب مرحوم نے بطور امداد کے سو روپیہ مصنف کی خدمت میں بھیجے۔ اسی طرح جو لوگ حمایت اسلام میں کتابیں شائع کرتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح امداد کرتے تھے اور اکثر متعدد جلدیں ان کی کتابوں کی خرید فرماتے تھے، چنانچہ مولوی محمد علی صاحب کی کتاب پیغام محمدی کئی سو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کر دیں۔

وہ میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے، چہرے سے اُن کے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی، چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا، اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ اُن کے اکثر ہم عصر اور ہم رتبہ لوگ اُن کا بہت احترام اور بہت ادب کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے، جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل وصورت کے لوگوں پر اُن کے علم وفضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑتا تھا۔

حیدر آباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے، اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے، وہ اس طرح

سے رہے، جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہوس۔ حالانکہ وہ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن کبھی کسی جھگڑے، کسی سازش، کسی پولٹیکل سوشل تحریک میں اُن کا نام نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے، نہ اپنا کوئی جتھا بنایا اور نہ کسی کے جتھے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز خانگی امور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے، وہ ان سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے، ان کی توجہ اور اُن کا دل کہیں اور تھا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ } حالی

جو لوگ یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، انہیں مولوی چراغ علی مرحوم کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیئے، اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زمین شور میں قلبہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ انہیں مولوی چراغ علی مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے نتائج اب تک بارآور ہیں، اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائیگا۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو } میر

وفات

اگر صد سال مانی ور یکی روز ۔ بباید رفت زین کاخ دل افروز

مرحوم کو ذیابطیس کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، اب اسی کے

اثر سے ایک گلٹی دہنی کنپٹی اور گردن کے درمیان دائرہ کے نیچے نمودار ہوئی، ڈاکٹر ہیر اُن کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ اور ڈاکٹر لاری مشہور سرجن وسابق ناظم محکمۂ طبابت سرکار عالی کی یہ رائے ہوئی کہ عمل جراحی کیا جائے اس وقت تک مرحوم بالکل تندرست اور صحیح معلوم ہوتے تھے اور سرکاری کام میں برابر مصروف تھے۔ چنانچہ حسب مشورہ باہمی ڈاکٹر لاری نے نشتر دیا۔ اس کے بعد صحت میں یک بارگی فرق آگیا اور ضعف طاری ہوگیا۔ بعدازاں دو تین بار پھر نشتر کیا گیا اور ہر بار حالت ردی ہوتی گئی اور زہر آلود خون پھیلتا گیا۔ حالانکہ یہ زخم بہت ہی نازک ہوگیا تھا اور پکے پھوڑے سے زیادہ اس میں تکلیف ہوتی تھی، لیکن جب ڈاکٹر زخم صاف کرتا اور اسے اندر باہر سے صاف کرکے دھوتا تھا، تو مولوی صاحب خاموش اسی طرح بیٹھے رہتے تھے، کیا مجال جو جو زبان سے اُف نکل جائے، یا تیور سے کسی قسم کی درد یا تکلیف کا اظہار ہو، چونکہ حالت ناقابل اطمینان تھی لہذا مولوی صاحب اور اُن کے اعزہ واحباب کی یہ رائے قرار پائی کہ بمبئی جاکر علاج کیا جائے۔ چنانچہ روز سہ شنبہ بتاریخ ۱۱ جون ۱۸۹۵ء مرحوم مع اہل وعیال کے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، حالت بہت ردی ہو چکی تھی، زہر آلود خون جسم میں پھیل گیا تھا۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی، اور حکمت وتدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جان دار نہیں بچ سکتا آخر آپہنچا۔ پندرھویں جون روز شنبہ صبح کے آٹھ بجے سے تنفس شروع ہوگیا اور گیارہ بجتے بجتے

دارفنا کا مسافر زندگی کی پچاس منزلیں طے کر کے راہی ملک بقا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ، وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ

مرحوم بمبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے

نشان نہیں رہتا، لیکن اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں، جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اُس کی اَل اولاد اور یہی اُس کی کمائی ہے۔ اولاد مرحوم کی یہی ہے یعنے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں اور بفضل خدا سب کے سب صحیح سلامت اور بقید حیات ہیں۔ اور اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جاندار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنےٰ اور ذلیل جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے اور مرجاتے ہیں۔ لیکن انسان کا نام اس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے ؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ بلکہ اُن کے کیریکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اور ہم کیا یاد کر رہے ہیں، بلکہ اُن کا کیریکٹر اور اُن کا کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم اُن کی کتابیں شوق سے پڑھتے، اُن کا ترجمہ کرتے اور اُنھیں یاد کرتے ہیں اور اُن کے نیک نام اور کام کی یاد دوسروں کو دلاتے ہیں۔ بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔

مرحوم کی وفات پر تمام اردو انگریزی اخبارات میں اظہار افسوس

وملال کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ہم بخوف طوالت صرف دو تحریروں کی نقل کرتے ہیں۔ ایک نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم (مدار المہام وقت) کا اظہار افسوس جو انہوں نے سرکار کی طرف سے کیا۔ اور جریدۂ اعلامیہ سرکار عالی میں طبع اور شائع ہوا۔ دوسرا سرسید کا نامۂ الم جو اس دردناک خبر کے سنتے ہی انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھا تھا۔ حقیقت میں یہ دونو تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

"مولوی چراغ علی کی وفات سے ریاست کا ایسا بے لاگ، بے لوث، مستقل مزاج، تجربہ کار عہدہ دار جاتا رہا کہ پھر اس کا بدل نہ ملا۔ اور حضر قوم میں سے ایک حامئ ملت اور فاضل محقق گم ہوگیا۔ جن مضامین پر مولوی چراغ علی مرحوم نے قلم اٹھایا ہے اس پر اور بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہوگئے ہیں اور زمانہ آئندہ اس سے بھی بہتر لوگ پیدا کریگا۔ لیکن ایسے دھن کے پکے، دنیا و مافیہا سے بے خبر اور اپنے کام میں ہمہ تن محو، مشکل سے پیدا ہوں گے۔"

(از جریدۂ اعلامیہ احکام سرکار نظام الملک آصف جاہ، جلد بست و ششم نمبر چہل و یکم مطبوعہ ہفدہم امرداد ماہ الہی ۱۳۰۴ف مطابق سی ام ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ)

"نواب مدار المہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال وفینانس سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد ۱۳۰۴ف یہ روز شنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہوکر بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا گئے تھے، انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگزار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج، اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکار عالی مکرر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ طبقۂ عہدہ داراں میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے سرکار کو درحقیقت بہت نقصان پہنچا۔" (صفحہ ۳۰۹ نشان ۱۶۴)۔

(از تہذیب الاخلاق علی گڈھ) سلسلہ سوم جلد دوم۔ مطبوعہ یکم محرم الحرام ۱۳۱۳ھ)

"افسوس! ہزار افسوس! صد ہزار افسوس! کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتہ کی بیماری میں انتقال کیا۔ اُن کا خط خود اُن کے ہاتھ کا لکھا

ؤ ہوا مورخہ نہم جون مقام حیدر آباد سے ہمارے پاس آیا تھا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ
ن ہفتہ سے بیمار ہوں، ڈاڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی ہے، ڈاکٹروں نے اس اندیشہ سے کہ مغز
ورم نہ ہوجائے کلورفارم کا عمل کرکے کاٹا اور بعد میں پھر دوبارہ کلورفارم کا عمل کیا بہت
کمزور ہوگیا ہوں، کھاتا پیتا نہیں، چلنا پھرنا موقوف، مگر اب زخم بھرتا چلا آتا ہے، اور ارادہ
ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے بمبئی جاؤں۔ اس کے بعد بارھویں جون کا بمبئی سے اُنہیں کا
بجا ہوا تار ہمارے پاس آیا کہ میں بمبئی آگیا ہوں۔ افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جب کہ ہم
ض و عذرات اُن کے نام روانہ کر رہے تھے اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے، اُسی وقت
وں نے بمبئی میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی مرحوم ایک بے مثل اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ ہمارے کالج
، ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے، حیدر آباد میں سالار جنگ اعظم نے اُن کو بلایا تھا، اس
نے سے اِس وقت تک متعدد انقلابات حیدر آباد میں ہوئے اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں
اُن کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ اُن کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلے کے یہ بھی
بں معلوم تھا کہ حیدر آباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت
ہ جانتے تھے اور بولتے تھے، عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور
یک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی
ول نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے
ست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ اُن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی نہایت افسوس و رنج
ؤں تنبیہ (انا للہ وانا الیہ راجعون) افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو انہوں نے تہذیب الاخلاق
، لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا، اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"

مرحوم کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ اُن میں سے

چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔
سید محمود مرحوم (خلف سر سیدؒ) نے بھی جو فارسی صنائع میں تاریخ کی صنعت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی۔

حیف چراغ علی از دنیا نہان شد

۱۸۹۵

مولانا حالی مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے۔

زخمے از مرگ چراغ علی آمد بر دل | کہ از و خاطر افگار بصد غم شد جفت
از خرد سال وفاتش چو بجستم محمود | "شد نہان حیف چراغ علی از دنیا" گفت

مولانا حالی نے خود بھی ایک قطعہ مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام اور کیریکٹر کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے۔

آہ آہ! از رحلت بے گاہ اعظم یار جنگ | کز میان رہ زہمرایان عنان پیچید و رفت
حیف دنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع | بزم ما را بزم ماتم باز گردانید و رفت
مستفیدان پر نہ کردہ دامن معنی ہنوز | مشتی از گنجینہ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحاب فیض کلکش ناشدہ سیراب خلق | ساعتی برق ایمانی از افق تابید و رفت
عقدہا نکشودہ ماند و نکتہ ہا نانوشتہ ماند | بہر جوی شیر کوہ بی ستون کندید و رفت
کرد بی آزار خلق اعمال سلطانی ادا | نے زکس رنجید و نی کس را برنجانید و رفت
یاوران قوم را تا زیست یاور بود و یار | ہر چہ بتوانست در تائید شان کوشید و رفت
از دل پر درد او گاہی صدای برنخاست | مدتی چون بحر کاہل در نہان جوشید و رفت
طبع از ادش بہر ملت کہ بینی صلح داشت | در دل خویش و دل بیگانہ در گنجید و رفت
گر زید صد سال کس انجام او مرگست و بس | چون شرر بر وضع دوران تیوان خندید و رفت

مولوی محمد اعظم صاحب چریاکوٹی نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک

...انے تک حیدرآباد میں ملازم تھے اور اب وظیفہ یاب حسن خدمت ہیں ایک
...بعا قطعہ تاریخی لکھا ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

...ی گرامی معتمد کز حسن رایش بید رنگ — یافت آرے در دکن بال و خزانہ آب و رنگ

...لم اخلاص دلی با ملت اسلام داشت — در معیشت بود رفتارش بر آداب فرنگ

...م را جوہر شناسے قدردان اہل علم — طالب حکمت نگہدارندہ آئین ہنگ

...طلو فکرتش مرغ ہما بر کندہ بال — عقل کل در مرغزار جودتش آہوی لنگ

...سبک روحی متینی بود چون کوہ گران — کلک او در دشت معنی برق رفتاری بی درنگ

...رینہا دلش دریای گوہر خیز بود — وقت گویائی دہانش بود شکر بار تنگ

...دنمایاں ناگہاں از گوشہ رخسار او — دانہ ریش قضا چیزی کم از قدر خشنگ

...طہا از بہر اصلاحش برو نشتر زدند — تا شد از نشتر زنیہا کار بر بیمار تنگ

...ت رفتہ شد پس بتر حال او در چند روز — بود گویا صورت تصویر بر پشت پلنگ

...قبت بے وقت مرگ انگلستان گیتی ربود — آنچنانش کز کمین ساحل نشینان را نہنگ

...غرض چون رخت ہستی بست از دنیای دوں — ہاتفی گفت از جلالی، وای اعظم یار جنگ
۱۳۱۴ھ

سید محمد واحد علی صاحب کاکوروی نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک
سنہ عیسوی میں دوسری ہجری نبوی میں کہی تھیں ۔ جو یہ ہیں :۔

۱۔ ہاتفی گفت از سر افسوس — گوہر شب چراغ بود نماند
۶۱۸ ۹۵

۲۔ ہائے اعظم یار جنگ ۔
۱۴ ۱۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام



غدر ۱۸۵۷ء سے مسلمانانِ ہند کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ اگرچہ اقبال کبھی کا منہ موڑ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی برائے نام باریک سا پردہ آنکھوں کے سامنے حائل تھا۔ اس پردہ کے اٹھتے ہی ادبار کی بھیانک اور مہیب تصویر نظروں کے آگے پھر گئی۔ رسی کے جلنے پر بھی بل ویسے ہی رہتے ہیں، نشہ اتر جانے پر بھی خمار کا اثر باقی رہتا ہے سب کچھ چھن جانے پر بھی غفلت وہی رہی۔ فرداً فرداً سب اپنی قسمت کے شاکی اور اپنے حال پر نالاں تھے لیکن بدبخت قوم کے حالِ زار پر کسی کو نظر نہ تھی اور جو کسی کے دل میں درد اٹھا بھی تو اتنی ہمت و سکت کہاں تھی اس پر آشوب دور میں [illegible]

جب کہ ہر طرف یار و اغیار مُنہ کھولے بیٹھے تھے، اور زمین و آسمان دشمن ہو رہے تھے اپنے اور اپنے بھائیوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ قومیت کا خیال سالہا سال سے مٹ چکا تھا، اخوت اور محبت کے اثر دلوں سے محو ہو چکے تھے، البتہ مذہب سے محبت ضرور تھی، مگر وہ بھی نادان دوست کی محبت سے زیادہ نہ تھی۔ حکومت جا چکی تھی، اقبال مُنہ موڑ چکا تھا، دولت سے بہرہ نہ تھا، علم پاس نہ تھا، اغیار تو اغیار خود یار و مددگار جان کے لیوا تھے، آفات کا نزول تھا، ادبار کی چڑھائی تھی۔ ایسے اڑے وقت پر، ایسے نازک زمانے میں، ایسے ہنگامہ رحمت و خیز میں جب کہ نفسی نفسی کا عالم اور عزت و غیرت کا ماتم بپا تھا، اپنے بھائیوں کے کام آنا عین جواں مردی اور اصل انسانیت ہے۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسائیگان	وز سموم نجد در باغ عدن بریان شدن

مسلمانوں کی حالت اس وقت اس بے سروسامان اور لٹے قافلہ کی سی تھی جو ایک لق و دق صحرا میں جا نکلا ہے، جہاں راستہ کا نشان گم ہے۔ زادِ راہ مفقود ہے، ہر طرف سے طوفان بپا ہے۔ مگر اس پر بھی ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں اور نفسانیت پر تلے ہوئے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ غافل اور لاعقل ان کے رہبر و رہنما ہیں۔ اس بے وقت میں انہیں میں سے ایک بندۂ خدا اٹھتا ہے، جو انہیں راستہ دکھانے اور کھوئی دولت کا نشان بتانے پر آمادہ ہوتا ہے، اہلِ قافلہ اس پر ہنستے اور اُسے بیوقوف بناتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ان کے راہ گم کردہ اور رہ گم راہ کن

رہنما اس کے دشمن ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ آپس کے لڑائی جھگڑے چھوڑ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس پر طرح طرح کی بدگمانیاں کی جاتی ہیں۔ اس کی محبت کو عداوت، اس کی ہمدردی کو بدخواہی اس کی دل سوزی کو خود غرضی پر محمول کیا جاتا ہے، وہ جوں جوں ان کی دل دہی کرتا ہے، وہ اس سے اور بدکتے ہیں، وہ جوں جوں اُن کی فلاح و بہبودی کی کوشش کرتا ہے وہ اور اس سے بدظن ہوتے ہیں۔ ایک عرصہ تک اس کی صدا صدا بہ صحرا اور اس کی بے ریا کوشش سعی لاحاصل رہی۔ لیکن آخر اسکی صداقت نے فتح پائی۔ اسکے خلوص نے سب کو قائل کر دیا۔ اسکی بے ریائی نے خود غرضیوں کے طلسم توڑ دیا اور زمانے نے خود کھوٹے کھرے کو پہچان لیا۔ جھوٹ کو زک ہوئی اور میدان سچ کے ہاتھ رہا۔ جاء الحق وزہق الباطل۔

وہ کوئی انوکھا شخص نہ تھا۔ وہ ہمیں میں سے تھا۔ ہماری ہی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی تھی۔ وہ کوئی عالم و فاضل نہ تھا، مال دار اور دولت مند نہ تھا، صاحب جاہ ذی اثر نہ تھا، وہ ہر لحاظ سے ایک معمولی آدمی تھا لیکن ہاں اسے ایک دل ملا تھا۔ جس میں درد تھا اور واقعات سے متاثر ہونے کی صلاحیت تھی۔ لیکن کیا کسی اور کے دل میں درد نہ تھا؟ ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ اس سے زیادہ ہو۔ لیکن اگر نرا درد ہی درد ہوا تو پھر انسان اس کے جذبہ اور زور میں اپنے تئیں نہیں سنبھال سکتا وہ بے صبر ہو جاتا، بے کل ہو کے بے اثر کر دینے نکل جاتا ہے یا ایسا حواس باختہ ہو جاتا ہے کہ اس کی بہت سی خیر خواہش بانزیادہ حد تک پہنچ جاتی ہے، مگر اس درد کے ساتھ اُسے

دماغ بھی ویسا ہی عطا ہوا تھا۔ درد اس میں حرکت اور اشتعال پیدا کرتا تھا اور عقل اس کی تحریک پر اسے سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ یہی ایک سچے مذہب اور خصوصاً اسلام کی تعلیم کا ماحصل ہے کہ انسان نہ تو جذبات ہی سے ایسا مغلوب ہو جائے کہ دنیا کے کام کا نہ رہے اور نہ درد سے خالی عقل ہی کا بندہ ہو جائے کہ ایک بگولے کی طرح دنیا میں مارا مارا پھرے۔ اس لئے ایسے نازک وقت میں قوم کو سنبھالنا ایک ایسے ہی شخص کا کام تھا جس کے سینہ میں درد بھرا دل ہو اور اس کے ساتھ ہی روشن دماغ رکھتا ہو۔ ریفارمر اور مجتہد ہونے کا حق ایسے ہی شخص کو حاصل ہے۔

آج یہ اسی کا طفیل ہے کہ ہم مسلمانوں میں ایک حرکت سی دیکھتے ہیں اسی نے ہمیں قومیت اور ہمدردی کا سبق پڑھایا۔ اسی نے ہمیں علم سیکھنے کا شوق دلایا۔ اسی نے ہمیں اپنے مذہب کی حقیقت سے واقف کیا اور دین و دنیا کو ساتھ ساتھ لے چلنے کی تعلیم دی۔

باوجود ان تمام بیش بہا اور بے نظیر خدمات اور احسانات کے جو سرسیدؒ نے اپنی قوم پر کئے اس نے اپنی مثال سے دنیا میں پھر ایک بار ثابت کر دیا کہ علم و فضل دستار فضیلت میں نہیں، حکمت و دانش یونیورسٹی کی ڈگریوں میں نہیں، لیاقت و قابلیت امتحان سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر بالفرض یہ سب کچھ ہو بھی تو کیا ہو کیا کتابوں کے تودے اور عمامۂ فضیلت کے وزن سے انسان بنتا ہے؟ نہیں بلکہ

کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

بعض رہنمایان اسفار" اب تک اسی خام خیالی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ایسے شخص کو جس نے کبھی باقاعدہ نصاب نظامیہ پڑھ کر فضیلت کی دستار حاصل نہیں کی، کیا حق حاصل تھا کہ وہ تفسیر لکھے، یا جس نے کبھی علوم کی تحصیل کی نہیں اس کو علوم کی اشاعت اور اس کے متعلق رائے دینے کا کیا منصب تھا۔ لیکن ان کو کولھو کے چکر سے باہر نکل کر اور آنکھوں پر سے اندھیری اُٹھا کر ذرا دنیا کو دیکھنا چاہیے۔

لیکن بڑی مشکل یہ تھی کہ قوم میں ایک خرابی نہ تھی کہ جس کی اصلاح کیجائے کوئی ایک بیماری نہ تھی جس کا علاج ہو۔ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہ تھی اور سر سے پاؤں تک روگوں بھری تھی۔ یہ اسی کا دل و دماغ تھا کہ ہمت نہ ہارا اور ہر خرابی کے مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ وہ اس دُھن میں ایسا لگا کہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ یہ جہاد کا وقت تھا۔ اور اس نے جہاد کیا۔ اور جہاد بھی کیا جہاد اکبر۔ یہاں اس کے بے مثال احسانات گنوانا ایک قصہ طویل ہو جائیگا مختصر یہ کہ اگرچہ اُس نے ہر قسم کی اصلاحات پر کمر باندھی، لیکن اس کی دوربین نظر نے یہ بھی دیکھ لیا کہ جہاں مسلمان عزت و حکومت، علم و دولت کھو چکے ہیں، وہاں وہ اپنے سچے مذہب کو بھی فراموش کر چکے ہیں۔ اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ اور سارے فساد کی اصل ہے۔ چنانچہ اس نے جان توڑ کر اس خرابی کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی ساری ہمت و قوت اس میں صرف کر دی۔

دنیا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی، اس کی نیرنگیاں کبھی کم نہیں ہوتیں، اور ہمیشہ کسی نہ کسی نئے دور کا زور و شور رہتا ہے۔ ایسے زمانے میں

بھی یورپ میں علم و حکمت کا وہ سیلاب آیا کہ اس نے پچھلے دوروں پر پانی
پھیر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ جب کبھی خاص زمانے میں کسی خاص طرف
میلان ہوتا ہے تو اس میں مبالغہ بھی بے حد ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت بھی بہت
کچھ ہوتی ہے۔ اور اس لئے انسان کی گزشتہ کوششوں کے مقابلہ میں اس
خاص لحاظ سے بہت بڑی ترقی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے اثر سے بڑے
بڑے تغیر و انقلاب ہوتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کا بیر قدیم سے چلا آرہا ہے
اب اس دور میں سائنس نے نیا چولا بدلا اور سارے عالم میں کھلبلی مچا دی تھا
تو اول اول مذاہب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کی عالمگیر اور حیرت انگیز
ترقی دیکھ کر ششدر سے رہ گئے۔ مگر پھر وہ سنبھلے اور سنبھل کر اپنے بچاؤ کی فکر کرنے
لگے۔ یہ ترقی یافتہ اقوام کی حالت تھی۔ لیکن وائے بر آن قوم جس پر جہالت
اور تعصب چھایا ہوا ہو جس کے مجتہد اور مصلح اپنے مقتدیوں سے زیادہ ناواقف
اور جاہل ہوں! ہمارے علما کی حالت اس وقت اصحاب کہف کی سی تھی۔
وہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو وہیں سمجھ رہے تھے جہاں وہ تھے زمانہ کا تغیر اور اس
دور کی خصوصیت ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی اور آتے تو کیونکر جو یہ
سمجھ کر رات کو سویا اور صبح ہوتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اسے کوئی کیونکر سمجھا
سکتا ہے کہ اس اثنا میں کئی صدیوں کا پھیر پڑ گیا ہے اور زمانہ میں ایک نیا دور
شروع ہو گیا ہے۔

یہاں آلات حرب سے بدل گئے ہیں اور ہم ہیں کہ اپنی بوسیدہ تلوار،
ڈھال اور تیر و ترکش سنبھالے مقابلہ کے لئے چلے جا رہے ہیں۔ اور

چونکہ غنیم کی قوت کا اندازہ نہیں ہے اس لئے اسے بے حقیقت سمجھتے ہیں اور اپنی قوت پر نازان ہیں۔

سرسید رح نے دیکھا کہ اور تو ہم سب کچھ کھو چکے ہیں۔ کہیں ایسا نہو کہ عزیز مذہب بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ اور ہم کہیں کے نہ رہیں۔ وہ مذہب کی قوت اور اثر سے خوب واقف تھا اور جانتا تھا کہ ہم مذہب ہی کے بل پر دنیا میں اُٹھے تھے اور اب بھی اگر سنبھلے تو اسی کے سہارے سے سنبھلیں گے۔ اور اس لئے اپنی تمام اصلاحون کی بنیاد مذہب پر رکھی۔ اور ساتھ ہی ان تمام توہمات باطلہ کے مٹانے کی کوشش کی جو مسلمانون کی غلطی سے مذہب کا جزو بن گئے تھے اور ان تمام الزامات کو نہایت تحقیق اور شد و مد کے ساتھ رفع کیا جو اس نئے زمانہ میں اسلام پر ہر طرف سے وارد ہو رہے تھے۔ اس نے ان الزامات کا جواب مُلّانون کی طرح کج بحثی سے نہیں دیا بلکہ اس نے اس کے لئے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ پرانے ہتیار بے کار ہو چکے تھے۔ اور اس دم دعوی کے ساتھ اسلام کی حقانیت ثابت کی جس کی نظیر اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس کام میں بعض اور بندگان خدا نے بھی جو اسلام سے محبت رکھتے تھے سرسید رح کا ہاتھ بٹایا۔ اور جس عظیم الشان کام کو سرسید نے انجام دیا تھا۔ اسی کی پیروی میں بھی ان لوگون نے اپنی اپنی بساط کے موافق اسلام کی خدمت کی۔ ان سب میں زیادہ محقق، وسیع النظر اور زبردست مصنف، مولوی چراغ علی (نواب اعظم یار جنگ بہادر) مرحوم تھے ان کی تقریباً تمام تصانیف اسلام کی

حمایت میں ہیں، ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا مطالعہ کس قدر وسیع اس کی نظر کیسی غائر اور اس کی تحقیق کس پایہ کی تھی۔ وہ لفاظی اور عبارت آرائی کچھ نہیں جانتے اور نہ ان کو فصاحت و بلاغت سے کچھ سروکار ہے، جیسا کہ اکثر مذہبی تصانیف کے مصنفین کا قاعدہ ہے مگر ان کی کتابیں معلومات علمی سے لبریز ہیں۔ واقعات کی تنقید و تنقیح، صحیح نتائج کے استخراج میں انہیں کمال حاصل ہے۔ وہ کبھی اپنی بحث سے الگ نہیں ہوتے، کبھی کوئی غیر متعلق بات نہیں کہتے اور نہ کبھی الزامی جواب دیتے ہیں۔ بلکہ امر زیر بحث کو ہمیشہ مد نظر رکھتے اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر ایک وسیع نظر ڈالتے ہیں، تمام واقعات متعلقہ کو جمع کر کے اُن کی تنقید کرتے اور حتی الامکان قرآن مجید سے استدلال کرتے اور نہایت صحیح اور عجیب نتائج استنباط کرتے ہیں اور اسی ضمن میں وہ بڑے بڑے مستند لوگوں کی رایوں کو پیش کرتے ہیں یا اُن کی غلطیوں پر نظر ڈالتے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ جس بات کو وہ لیتے ہیں اس پر اس خوبی اور جامعیت سے بحث کرتے ہیں کہ پھر اس میں کسی اور اضافہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ البتہ ایک کسر ان کی مذہبی تصانیف میں ضرور نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تحریر میں گرمی نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرد مہر منطقی ایک ایسے بحث پر جس سے اُسے دلچسپی ہے بحث کر رہا ہے۔ اور واقعات اور دلائل و براہین پیش کر کے بال کی کھال نکال رہا ہے حالانکہ مذہب کو منطق و استدلال سے اتنا تعلق نہیں جتنا کہ انسان کے جذبات لطیفہ یا وجدان قلب سے ہے اور اس لئے مذہب پر بحث

کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان رسمی قیود سے باہر نکل کر نظر ڈالے اور اس میں وہ جوش اور حرارت ہو جو ایک سرد مہر منطقی یا ایک کالیاں دینے والا میں نہیں ہو سکتی۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو نہ تو مذہب کے اس حصے سے بحث تھی اور نہ وہ غالباً اس بحث کے اہل تھے۔ بلکہ ان کا مقصد مذہب کے صرف اس حصہ سے تھا جس کا تعلق امور دنیا سے ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مذہب اسلام کسی طرح انسان کی دنیاوی ترقی کا حارج نہیں بلکہ اس کا ممد و معاون ہے اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اس میں مولوی صاحب مرحوم کو پوری کامیابی ہو گئی ہے۔

ان کی مذہبی تصانیف کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ تعلیقات۔ یہ رسالہ پادری عمادالدین آنجہانی کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں ہے۔ مرحوم نے اس رسالہ میں اس امر کو ثابت کر کے دکھایا ہے کہ پادری صاحب کے ماخذ سب کے سب غلط اور پوچ ہیں۔ اور ایسی کم زور بنیاد پر اعتراضات کی عمارت کرنا خلاف دانشمندی ہے۔ اسی ضمن میں احادیث کی تنقید اور صحت و غیر صحت پر بحث کی ہے۔ اور بعض منصف مزاج یورپین فاضلوں کی رایوں کا اقتباس بھی درج کیا ہے نیز مسیح و اناجیل اربعہ پر تفصیلی رد و قدح کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسیح کی سوانح عمری نہایت غیر معتبر ہے۔ اور چاروں انجیلیں تاریخی اعتبار سے گری ہوئی ہیں۔ (مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۲ء)

۲۔ تحقیق الجہاد۔ یہہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر یہہ بہت بڑا اعتراض کیا گیا ہے کہ یہہ مذہب جہاد کے ذریعہ یعنے بزور شمشیر دنیا میں پھیلایا گیا ہے۔ مرحوم نے نہایت خوبی اور بسط کے ساتھ جہاد کی حقیقت اور ماہیت پر بحث کی ہے۔ اور یہہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ تمام حالت مجبوری میں اور اپنے بچاؤ کے لئے تھیں ان سے ہرگز اسلام کا بہ جبر پھیلانا یا کفار کا قتل کرنا مقصود نہ تھا۔ اس ضخیم کتاب میں یہہ بحث اس شرح وبسط اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ کی گئی ہے کہ آج تک کسی نے اس مسئلہ پر اس خوبی کے ساتھ بحث نہیں کی تھی۔ تمام بڑے بڑے یوروپین مصنفین مثلاً سر ولیم میور، ڈاکٹر اسپرنگر، ماکس ڈاڈ۔ ہیوز۔ سیل، ڈاکٹر سیموئل رین، باسورتھ اسمتھ وغیرہ نے جو اس بحث پر تحریریں لکھی ہیں، ان کے اقوال نقل کرکے اُن پر تنقید کی ہے اور ان کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ مرحوم کی یہہ کتاب درحقیقت نہایت قابل قدر ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ یہہ کتاب دنیا میں اپنی نوعیت اور طرز کی ایک ہی کتاب ہے۔

۳۔ ریفارمز انڈر مسلم رول۔ اس کتاب کے متعلق ہم آخر میں مفصل بحث کرینگے

۴۔ محمد دی ٹرو پرافٹ۔ (محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں) یہہ کتاب بھی انگریزی زبان میں ہے اور یہہ مرحوم کی تصانیف میں بڑے پایہ کی ہے۔ اس کتاب میں آنحضرت صلعم کے لائف اور کیرکٹر کے متعلق تمام شکوک اور اعتراضات کو

عالمانہ اور محققانہ تحقیق سے رفع کیا ہے۔ اور بڑے زور شور سے
اس امر کو ثابت کیا ہے کہ محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں۔
افسوس ہے کہ یہہ کتاب ابتک کامل نہیں ملی، کچھ کچھ مطبوعہ حصے
کہیں کہیں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ نہ یہہ معلوم ہوا کہ یہہ کتاب
طبع کہاں ہوئی تھی۔ خود مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی
موجود ہیں مگر وہ بھی کسی قدر ناقص ہیں۔ یہہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک بار
یہہ کتاب کسی وجہ سے چھپتے چھپتے رہ گئی تھی اور مصنف نے دوبارہ
بعد ترمیم و اضافہ کے چھپوائی، چنانچہ ہمارے پاس ہر دو مطبع کے پروف
موجود ہیں اگر کسی صاحب کے پاس یہہ کتاب کامل موجود ہو تو اس
قابل ہے کہ چھپوادی جائے ورنہ کم سے کم اس کا ترجمہ ضرور طبع کردیا
جائے۔ آجکل کے زمانہ میں اور خاص کر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں
کے لئے ایسی کتابوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔

۵۔ اسلام کی دنیوی برکتیں۔ اس رسالہ میں مرحوم نے یہہ ثابت کیا ہے کہ
اسلام دنیا میں کن کن برکات کے نزول کا باعث ہوا ہے۔ اور اہل عالم کو اس
سے کیا کیا نعمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ یہہ کتاب پنجاب میں کئی بار طبع ہوچکی ہے بہت
دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔

۶۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ ایام الناس ایک اردو کا چھوٹا سا رسالہ ہے قرآن مجید پر
ایک یہہ اعتراض بھی کیا جاتا تھا کہ اس میں بعض ایسی قوموں کا ذکر ہے جن کا دنیا میں کبھی وجود ہی نہ
تھا اور یہہ محض بے بنیاد قصے اور کہانیاں ہیں۔ مرحوم نے نہایت غور تحقیق و تدقیق اور کاوش سے ان

اقوام کا تاریخی ثبوت ہم پہنچایا ہے اور قدیم یونانی اور عبرانی کتابوں سے مدد لی ہے۔ اور ثبوت میں ان قدیم مورخوں کی تاریخوں کو پیش کیا ہے جنمیں ثمود و عاد کا ذکر ہے اور وہ سب نزول قرآن پاک سے کئی صدیوں پیشتر کی تصنیف ہیں۔ یہ رسالہ صرف ایک دفعہ طبع ہوا ہے اب نہیں ملتا۔

مرحوم نے کئی رسالے مثلاً بی بی ہاجرہ۔ ماریہ قبطیہ۔ تعلیق نیا زنامہ وغیرہ ناتمام چھوڑے لیکن ان سب سے زیادہ قابل قدر اور بے مثل کتاب "العلوم الجدیدة والاسلام" ہے جسے وہ اپنی آخری عمر میں لکھ رہے تھے۔ اور جس کا ابتدائی حصہ تہذیب الاخلاق سلسلہ جدید کی جلد دوم کے ابتدائی پرچوں میں چھپ چکا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی بے وقت موت نے اس بے نظیر کتاب کو پورا نہ ہونے دیا یہ کتاب درحقیقت مصنف نے سرسید مرحوم کے ایک سوال کے جواب میں لکھنی شروع کی تھی۔ اس کی پوری حقیقت ظاہر کرنے کے لئے ہم یہاں سرسید مرحوم کا وہ خط نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے اس تصنیف کے موضوع پر بحث کی ہے۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب کو جو مضمون لکھنا ہے وہ نہایت ہی مشکل اور نہایت دلچسپ اور نہایت مفید و بکار آمد ہے۔ ابھی تک انہوں نے صرف تمہید ہی تمہید لکھی ہے۔ فلسفہ کے طرفداروں اور مخالفوں کا حال لکھا ہے ان کے نام اور ان کا زمانہ بتایا ہے۔ پھر علماء اسلام میں جو بڑے بڑے فلسفی

گزرے ہیں ایک ایک کو گنایا ہے۔ اس کے بعد اب وہ
اصل مضمون کی تحریر پر متوجہ ہونگے جس کو ہمارے ناظرین
اخبار پڑھ کر امید ہے کہ تعجب کرینگے۔ نواب اعظم یار جنگ
درحقیقت ایک لاحل سوال حل کرنے پر مستعد ہوئے ہیں
معلوم نہیں کہ ہمارے ناظرین پرچہ کو اس کا کہ وہ کیا سوال
ہے خیال ہے یا نہیں اس لئے ہم سوال کو بطور یاد دہانی
کے اس مقام پر چھاپتے ہیں تاکہ ان کو معلوم ہو کہ کیسا
مشکل لاحل سوال ہے۔ اور اس کا جواب جو ہو وہ کیسا
قابل توجہ اور ہماری قوم کے لئے فائدہ مند ہوگا مدت
سے یہ سوال کیا گیا ہے اور آج تک کسی نے اس کا جواب
نہیں دیا خدا کرے کہ نواب صاحب ممدوح پورا اور
قابل تشفی جواب دیں۔

سوال مذکور یہ ہے۔

اکثر لوگوں کی رائے میں یہ مسلّم ہے کہ یورپین علوم و
فنون کی تعلیم عقاید اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے
اور ان کی رائے میں اس کا علاج ان علوم کے ساتھ
دینی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا ہے۔ اگر یہ رائے
صحیح ہے تو یورپین علوم و فنون کے ان مسائل اور
ان کے دلائل کو جو اس برگشتگی کا باعث ہیں بیان کرنا چاہیے

اور اُن کتب وغیرہ اور ان مقامات کا نشان دینا ضرور ہے جن کے تعلیم میں داخل کرنے سے اس برتنگی کی روک ہو سکے مع اس بیان کے کہ کس وجہ سے وہ کتابیں اور مقامات روک ہو سکیں گی۔ اگر یہہ رائے صحیح نہیں تو جہاں تک مفصل اور دلیل سے اس کی عدم صحت کا بیان ممکن ہو بیان کیا جائے"

(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۳ مطبوعہ یکم ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ)

اس کے بعد سر سید مرحوم نے اس کتاب کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:-

جس سوال کا جواب نواب اعظم یار جنگ بہادر کو لکھنا ہے۔ اس جواب کے قبل انہوں نے بہت سی تمہیدات قائم کی ہیں۔ ہم سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اصل سوال کا جواب کب آئیگا۔ واضح ہو کہ نواب صاحب ممدوح کا ایک خط ہمارے پاس آیا ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے جواب کے مضامین کی ترتیب کیونکر ہے ہم اس خط کو جہاں تک کہ ترتیب مضامین سے متعلق ہے ذیل میں چھاپتے ہیں"

انتخاب خط

وہ لکھتے ہیں کہ "چھٹی صدی تک کے حکمائے اسلام کی فہرست
بھیج دی گئی ہے (جو چھپ بھی گئی ہے) اس کے بعد
تھوڑا اسا ذکر اس انقلاب عظیم کا ہے جو ایشائی اسلامی
دنیا میں چنگیز خاں کی طرف سے ہوا اور اس کی وجہ
سے تصنیف و تعلیم علوم حکمیہ بند ہو گئی۔ اس کے بعد
حال کے زمانہ تک کے اہل حکمت و منطق کی فہرست
مختصر سی ہے اس کے بعد تصنیفات یعنی کتب مصنفہ
علوم حکمیہ و معقولات کا بیان ہے اس کے بعد اسلام
میں مختلف فرقے پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ اور معتزلہ
اور دیگر متکلمین کے استاد مذکور ہوئے ہیں۔ اس کے
بعد کتب علم کلام و عقائد کی تفصیل ہے ان سب کے
بعد اب اصل بحث آتی ہے کہ علم کلام و عقائد کے
رو سے کون کون سا مسئلہ حکما و فلاسفہ کے خلاف
ہے اور انہیں مسائل کے متعلق علوم جدیدہ میں
ان کی تائید ہوتی ہے یا مخالفت۔ اور بتایا
گیا ہے کہ علوم جدیدہ ان مسائل اختلافیہ میں
علم کلام کی تائید میں ہیں اور علم کلام کے ذکر

کے قبل یہ میں لکھنا بھول گیا ہوں کہ علوم دینیہ کیا کیا ہیں اور وہ کہاں تک فلسفہ وحکمت کے اعتراضات کی تردید کر سکتے ہیں۔ فقہ و تفسیر و حدیث حکما کے مقابلہ میں کچھ کارآمد نہیں ہیں اور اس غرض سے علم کلام ایجاد کیا گیا تھا مگر اب وہ بھی مفید و کارآمد نہیں رہا۔ اخیر پر اس سوال کا جواب ہے جو اس مضمون کی ابتدا میں تھا۔ اس کے بعد میں کچھ اس کا ذکر ہوگا کہ اب تک اس قسم کی کتابیں جن میں تطبیق بین الحکمتہ والاسلام ہوتی ہے کیا کیا تصنیف ہوئیں اور آئندہ کس قسم کی کتابیں تصنیف ہونی چاہئیں۔ غرض کہ یہ ایک مختصر سی کیفیت اور فہرست مضامین رسالہ ہے جو آپ کی اطلاع کے لئے عرض کی گئی۔ والسلام۔

(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۳ مطبوعہ یکم ذیحجہ ۱۳۱۳ھ)

افسوس ہے اسی زمانہ میں مولوی چراغ علی مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ جب سرسید کو نواب صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر پہنچی تو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں جو آرٹیکل اس حادثۂ جاں گداز پر لکھا ہے اس میں اس مضمون کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے۔

افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لا اِلٰہ سوال کا جواب جو

انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا
اور اب اُمید نہیں ہے کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو
حل کریگا۔

(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۴ مطبوعہ
یکم محرم ۱۳۱۳ھ)

اِس ناتمام رسالہ کے متعلق ہم نے کسی قدر تفصیل سے اس لئے بحث
کی ہے کہ ناظرین کو اس مضمون کی اہمیت معلوم ہو جائے نیز یہ بھی ظاہر ہو جائے
کہ مرحوم اس پایہ کے شخص تھے کہ اُن کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں
میں کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس سوال کے جواب پر قلم اُٹھائے۔ اس کتاب
کے ناتمام رہنے میں مرحوم کا کچھ قصور نہ تھا۔ یہ اللہ کی مرضی تھی کہ انہیں ایسے
وقت میں اُٹھا لیا جب کہ انہیں ابھی بڑے بڑے کام کرنے تھے۔ اور افسوس
کہ جن لوگوں کی نظریں اس اہم سوال کے جواب پر لگی ہوئی تھیں اُنہیں مایوس
ہونا پڑا۔ علاوہ مذکورہ بالا تصانیف کے مرحوم کے متعدد رسالے مثلاً غلامی،
تسرّی، تعدد ازدواج، ناسخ و منسوخ، ردشہادت قرآنی برکتب ربانی مصنفہ
سر ولیم میور وغیرہ دستیاب ہوئے ہیں جو بڑی محنت و تحقیق سے لکھے گئے
ہیں۔ چونکہ اس مقدمہ کے لکھنے کے بعد ملے، لہذا انشا اللہ پھر کسی وقت
اس پر بحث کی جائیگی۔

اب ہم کتاب زیر دیباچہ یعنی "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام کے مجوزہ
اصلاحات سیاسی و تمدنی و فقہی زیر حکومت اسلام" پر کسی قدر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں

اِس کتاب کا باعث تصنیف یہ واقعہ ہوا کہ انگلستان کے ایک پادری کینن ملکم میکال نے کن ٹم پورے ری ریویو بابت ماہ اگست ۱۸۸۱ء میں ایک مضمون اِس عنوان سے لکھا تھا کہ "کیا زیر حکومت اسلام اصلاحات کا ہونا ممکن ہے" اس مضمون میں پادری صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ حال کے بالکل نامناسب ہے اسلامی سلطنت میں کسی اصلاح کی توقع رکھنی فضول ہے کیونکہ اِسلامی سلطنت درحقیقت آلہی سلطنت ہے جس کے تمام قواعد خواہ مذہبی ہوں یا تمدنی دیوانی یا فوجداری سب خدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اس لئے اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ لہذا جب تک مسلمان مذہب اسلام کو ترک نہ کر دیں گے اس وقت تک وہ ترقی نہیں کرسکتے۔ پادری صاحب نے اس مضمون میں (نیز اپنے دیگر مضامین میں بھی) سخت تعصب، بے تمیزی، زبان درازی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔ ایسے روشن زمانے میں جب کہ یورپ میں ماہرین سائنس نے تعصب کے جنون کو بہت کچھ دھیما کر دیا ہے ایک ایسے عالم شخص کے قلم سے ایسے مضامین کا نکلنا ایک تعجب خیز امر ہے۔ خاص کر دولت عثمانیہ کے خلاف پادری صاحب نے بہت کچھ زہر اُگلا ہے اور وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ اُس کا وجود یورپ میں باقی رہے اس بارے میں وہ مسٹر گلیڈ سٹون آنجہانی اور مسٹر اسٹیڈ اڈیٹر ریویو آف ریویوز کے ہم خیال ہیں۔ ریورنڈ موصوف کے اس مضمون کے جواب میں مولوی چراغ علی مرحوم نے یہ کتاب لکھی، اور درحقیقت نہایت پُرزور

مدلل اور جامع کتاب لکھی ہے جس میں اُن تمام بڑے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو عموماً اور اکثر اسلام پر ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہوتے ہیں اب تک کسی شخص نے ان اعتراضات کا جواب اس طرز سے اور اس جامعیت کے ساتھ نہیں دیا تھا۔

اِس کتاب کو مصنف مرحوم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں پولٹیکل (سیاسی) اصلاحات کا ذکر ہے اور دوسرے حصہ میں سوشل (تمدنی) اِصلاحات کا اور کتاب کے شروع میں مصنف نے ۱۴۰ صفحات کا ایک مقدمہ لکھا ہے جو ایک محققانہ اور عالمانہ تحریر ہے۔

اِس سے قبل کہ ہم اس کتاب کے مضامین پر نظر ڈالیں ہم اس دھوکے کو اُٹھا دینا ضروری سمجھتے ہیں جو ناظرین کو "اصلاحات" کے لفظ سے پیدا ہوگا۔ مولوی صاحب مرحوم کا مقصد صرف اِس قدر ہے کہ اسلام ترقی اور اصلاح کا مانع نہیں ہے، اور خلیفہ وقت بلحاظ اقتضائے زمانہ پولٹیکل اور سوشل امور میں جدید اصلاحات کے جاری کرنے کا مجاز ہے، اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں احکام مذہب کی رو سے مسلمان اس زمانہ میں ترقی نہیں کر سکتے، اُن کی احکام الٰہی و رسول کے حوالے سے تردید کی ہے۔ اُن کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ خدا و رسول نے ہرگز اس قسم کی اصلاحات کی مخالفت نہیں کی اور اُن کا ہونا ہر زمانے میں ممکن ہے اور بس۔ اب رہی یہ بحث کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا کن اسباب سے انحطاط ہوا، اور وہ کون سے ذرایع ہیں جو ان کی ترقی

باعث ہو سکتے ہیں، اس کتاب کے موضوع اور مولوی صاحب کے مقصد سے خارج ہے۔ اس زمانہ میں یہ سرسید احمد خاں، مولوی جمال الدین افغانی اور مصطفیٰ کامل پاشا کا حصہ تھا، اور جن لوگوں کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ ان تینوں بزرگوں کے حالات اور اعمال کو مطالعہ فرمائیں۔

کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے فقہ کے مذاہب اربعہ و اصول فقہ پر بھی بحث کی ہے اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ علم فقہ محض ایک ظنی علم ہے اور اس میں آب و ہوا، رسوم و عادات، انسانی خواہشات و ضروریات سیاسی و تمدنی حالات و معاملات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور ایک حد تک انہیں امور کے اختلاف کی وجہ سے مذاہب فقہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ علاوہ اس کے بانیان مذاہب فقہ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ کر سکتے تھے کہ ان کا اجتہاد قطعی ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُن کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ آئندہ آنے والی نسلوں کو اپنے اجتہادات کا ایسا ہی پابند کر دیں جیسا کہ اپنے زمانے کے لوگوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانوں میں ایک ہی مسئلہ پر مختلف فتوے دیے گئے ہیں اور اس اختلاف کی وجہ زیادہ تر اقتضاء ضروریات زمانہ تھیں۔ مقلدین کا یہ کہنا کہ چار ائمہ فقہ کے بعد کسی کو حق اجتہاد کا نہیں ہے کسی طرح قابل قبول نہیں ہے اکثر یورپین مصنفوں نے جو مقلدین کے اقوال کے مطابق ان چار ائمہ کے اجتہادات کو قطعی اور ناقابل تبدیل خیال کر کے اسلام کے متعلق استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے مولانا بحر العلوم نے بہت بڑی اور

سچی بات کہی ہے کہ مقلدین کا یہ خیال سراسر حماقت ہے اور یہ لوگ ان میں ہیں جن کی نسبت حدیث پیغمبر صلعم میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بغیر علم کے فتوے دیتے ہیں، خود گم راہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گم راہ کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ایسا کہنا گویا علم غیب کا دعویٰ کرنا ہے جو سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔"

اب فقہ کی بنیاد صرف چار چیزوں پر ہے۔ قرآن۔ حدیث۔ اجماع اور قیاس۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ کوئی پولیٹیکل (سیاسی) اور سوشل (تمدنی) قانون یا ضابطہ ہے بلکہ اس کی اصل غایت قوم عرب میں نئی روح پھونکنی، قومیت کی شان پیدا کرنی اور دنیا کو اخلاقی و مذہبی تعلیم دینی تھی۔ لیکن چونکہ اس وقت عرب اور دنیا میں بعض ایسے قبیح اور مذموم رواج جاری تھے جن کا تعلق سیاست و تمدن سے تھا لہذا اُن کا استیصال کرنا یا اُن کی اصلاح کرنا اس کا فرض تھا اور اس لئے اس کے متعلق چند معقول، معتدل اور منصفانہ ہدایات کی گئی ہیں۔ آیات احکام کو جو کلہم دو سو بیان کی جاتی ہیں یہ سمجھ لینا کہ وہ باضابطہ پولیٹیکل اور سول قواعد ہیں صحیح نہیں ہے اکثر یہ کیا گیا ہے کہ آیات کے واحد الفاظ ناقص جملوں اور الگ الگ فقروں کی تعبیر کر کے قانون بنا لیا گیا ہے اور قرآن کی اصل تعلیم اور منشار کو نظر انداز کر دیا ہے۔

رہی حدیث سو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے اور رطب و یابس صحیح و سقیم کا ایک ایسا طومار ہے کہ اس میں کھرے کھوٹے کا پہچاننا محال

ہوگیا ہے۔ صحاح ستہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ اِن نیک نیت بزرگوں نے احادیث کی صحت کا معیار راوی کی صداقت اور اس کے اعلیٰ اخلاق اور اتّقا اور سلسلہ روایت کو پیغمبر صلعم یا صحابہ تک پہنچنے کو قرار دیا ہے۔ مضمون حدیث سے بحث نہیں کی عقلی اصول سے پرکھنا دوسروں کا کام ہے۔ اور اس لئے تمام حدیثیں ایسی نہیں ہیں جن کا ماننا لازم ہو۔ آنحضرت نے کبھی اپنے متبعین کو احادیث کے جمع کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی اور نہ کبھی صحابہ نے ایسا کرنے کا خیال کیا۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کا کبھی یہ منشا نہ تھا کہ وہ ملک کے پولیٹکل و سوشل قوانین میں مداخلت کریں۔ ہاں البتہ اُن امور میں جو آپ کی روحانی اور اخلاقی تعلیم کے مخالف تھے آپ نے ضرور مداخلت کی اور اس کی اصلاح فرمائی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ایسا نظام جو غیر متیقن اور ناقص احادیث پر قایم ہے قطعی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔

اجماع کے متعلق بڑے بڑے فقہا کو اختلاف ہے یا بعض مجتہدین یا فقہا نے جو شرائط قائم کی ہیں اُنہیں دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اجماع ایک ناقابل عمل اور ناممکن اصول ہے۔ اس پر مصنف نے اپنے مقدمہ میں مفصل بحث کی ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ فقہ کا یہ اصول کہاں تک کارآمد اور قابل عمل ہو سکتا ہے۔

قیاس۔ اُس استدلال کو کہتے ہیں جو قرآن یا حدیث یا اجماع سے کیا جائے۔ علت قیاس کے لئے اُن میں سے کسی ایک کا ہونا ضرور ہے لیکن یہ تمام استدلال شبہ سے خالی نہیں۔ اور نہ ہیں ہو سکتے ہیں۔ مگر

باوجود اس کے قیاس کو فقہ میں بہت بڑا دخل ہے۔ فقہا کو اجماع سے زیادہ قیاس میں اختلاف ہے اور بڑے بڑے جیّد فقہا اور علما، نے اس کے ماننے سے انکار کیا ہے۔

غرض یہ کہ اگرچہ اسلامی فقہ کے بعض ضابطے اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے بہت مناسب اور معقول تھے۔ لیکن موجودہ ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ کوئی شئی سوائے قرآن پاک کے قطعی اور ناقابل تبدیل نہیں۔ لہذا اس زمانے میں بھی اجتہاد کا وہی حق حاصل ہے جو پہلے زمانہ میں تھا۔ بشرطیکہ وہ احکام قرآن سے مطابق ہوں اور مصنف کی رائے میں یہ حق اجتہاد سلطان روم کو بحیثیت خلیفہ حاصل ہے۔ بحیثیت خلیفہ کے سلطان روم کسی مذہب فقہ کے مقلد نہیں ہیں۔ خلفائے راشدین ان مذاہب فقہ سے پہلے گزرے ہیں اور بعد کے خلفا کے زمانے میں مختلف ممالک اسلامیہ میں مختلف فقہی تغیر و تبدل ہوتے رہے ہیں اور اس لئے سلطان روم بحیثیت خلیفہ کے موجودہ ضروریات و حالات کے مطابق ضروری تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ اور غالباً اسی خیال کی بناء پر مصنف نے اپنی کتاب کو سلطان عبدالحمید خاں کے نام سے معنون کیا تھا۔

مصنف نے اپنی کتاب میں تمام سیاسی، تمدنی اور فقہی اصلاحات کی بنا قرآن پر رکھی ہے اور تمام اُن اعتراضات کو جو مخالفین کی طرف سے اسلام پر وارد کئے گئے ہیں نیز اُن غلطیوں کو جو مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں قرآن سے رد کیا ہے۔ قرآن روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے ہے تو وہ قانونی ضابطہ نہیں ہے اور اس لئے آزادی رائے اور علمی و اخلاقی و

قانونی تغیرات کا مانع نہیں ہے۔

مصنف نے دو واقعے ایسے بیان کئے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم دنیاوی معاملات میں اپنی رائے کو کبھی قطعی اور ہر حالت میں قابل پابندی نہیں سمجھتے تھے دوسرے آپ نے صاف طور سے آزادی رائے کی اجازت دی ہے۔

پہلا واقعہ امام مسلم سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلعم مدینہ کو آئے تھے تو آپ نے دیکھا کہ بعض لوگ کھجوروں میں نرو مادہ کا جوڑ لگا رہے ہیں آپ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ لوگ آپ کے ارشاد کے مطابق اس سے باز رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجوروں کی فصل خراب رہی جب اس کی خبر آپ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ "میں محض بشر ہوں۔ جب میں مذہبی معاملہ میں کچھ ہدایت کروں تو اس پر عمل کرو۔ لیکن جب میں دوسرے معاملات میں کچھ کہوں تو مجھے محض بشر سمجھو" (مقدمہ حصہ اول صفحہ ۴۴)

یہ واقعہ بیّن ثبوت اس بات کا ہے کہ آنحضرتؐ نے سول اور پولیٹیکل معاملات میں اپنی رائے کو کبھی ناقابل تبدیل اور قطعی قرار نہیں دیا بلکہ اس میں کامل آزادی عطا فرمائی ہے۔ دوسرا واقعہ ترمذی۔ ابو داؤد اور دارمی سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے جب معاذ بن جبل کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو اس سے سوال کیا کہ تم لوگوں کے معاملات کو کیوں کر چکاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کلام اللہ کے مطابق" پھر فرمایا "اگر تمہیں کلام اللہ میں کوئی بات نہ ملے تو" جواب دیا کہ میں پیغمبر کی نظیر سے کام لوں گا" کہا کہ "اگر کوئی ایسی نظیر نہ ملے تو"

اس کے جواب میں معاذ نے کہا کہ "میں اپنی رائے پر عمل کرونگا (اجتہد رائی)"
آنحضرت صلعم نے معاذ کے اس معقول جواب پر خدا کا شکر ادا کیا۔ (مقدمہ
حصہ اول صفحہ ۲۵)

معاذ کے جواب پر خدا کا شکر ادا کرنا بتاتا ہے کہ آنحضرت صلعم دنیاوی
معاملات میں آزادی رائے کو کس قدر دل سے پسند فرماتے تھے۔

مصنف نے کتاب کے دو حصے کیے ہیں، ایک پولٹیکل یعنی سیاسی اصلاحات
دوسرا سوشل یعنی تمدنی حالات۔

پہلے حصہ میں اِن اُمور پر بحث کی گئی ہے:

۱۔ پادری میکال صاحب کے خیال میں اسلامی سلطنتیں آلہی سلطنتیں
ہیں جن کے قوانین وضوابط میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ مصنف نے اس
قول کی تردید کی ہے۔ اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ پہلے چار یا پانچ خلفاء اسلام
کی حکومت جمہوری قسم کی تھی اسی لئے پہلے چار یا پانچ خلفاء "خلفائے راشدین"
کہلاتے ہیں اور اُن کے بعد کے "خلفائے جور" یا "ملک عضوض" تھے چونکہ
ابتدائی زمانے میں سیاست اور حکومت کے چلانے کے لئے کوئی قانونی
ضابطہ نہ تھا۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد خلفائے عباسیہ کے عہد میں کچھ تو
جان ومال کی حفاظت کچھ کاروبار سلطنت کے چلانے کے لئے اور کچھ بادشاہوں
اور خلیفوں کی خواہشات پورا کرنے کے لئے قرآن پاک کی آیتوں کی طرح طرح
کی تعبیریں اور تاویلیں کیں اور اپنے مطلب کے موافق استدلال کئے اور
جھوٹی سچی حدیثیں پیش کر کے دنیا پرست فرمان رواؤں کے اعمال کو جائز

قرار دیا۔

شریعت اسلام نہ تو پیغمبر اسلام نے لکھی ہے نہ آپ نے لکھوائی ہے نہ آپ کے زمانے میں لکھی گئی ہے اور نہ پہلی صدی ہجری میں مرتب ہوئی۔ اور جس قدر اصول اور رواج اور کاروبار سلطنت اور جان و مال کی حفاظت کے لئے قواعد اس میں درج ہیں وہ قرآن کے احکام پر مبنی نہیں ہیں۔ لوگوں نے عموماً اور یورپین نے خصوصاً قرآن اور شریعت کو گڈ مڈ کر دیا ہے اور اس لئے ساری خرابی اس عدم امتیاز سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر اس فرق کو سمجھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جو انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہو بلکہ ہیئت اسلام میں بذاتہ ایک ترقی ہے اور اس کے اصول ایسے جاندار ہیں کہ ان میں جدید حالات اور عقل و حکمت کی مطابقت کی کامل صلاحیت موجود ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض پادری صاحب کا یہ ہے کہ اسلام کا حکم غیر مسلموں کے حق میں یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا غلامی یا موت۔ اور یہی سلطان روم کی حکومت میں ہوتا ہے۔

مصنف نے اس کی تردید بڑے زور و شور سے کی کہ نہ آنحضرت صلعم کی ایسی تعلیم ہے اور نہ قرآن میں ایسا کوئی حکم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام میں غیر مسلموں سے کبھی رواداری یا مسالمت کا برتاؤ نہ کیا جاتا۔ اسکے بعد مصنف نے قرآن کی مدنی اور مکی صورتوں میں سے کوئی (۴۳) آیتیں پیش کی ہیں جن میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب میں کامل آزادی عطا کی گئی ہے۔

علاوہ اس کے فقہ کو الٰہی کلام ہونے کا حق نہیں جو وہ ایسا حکم جاری کرے۔
یہاں تک کہ کثر فقہ کے کتب میں بھی ایسا چنگیزی حکم نہیں پایا جاتا۔ ہدایہ
اور دیگر کتب فقہ سے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے اور جہاں جہاں اِن
فقہا نے قرآن کی آیات سے تجاوز کیا ہے اور استدلال میں غلطی کی ہے۔
اُسے صاف طور پر دکھایا ہے۔

۳۔ اِس کے بعد اس امر پر بحث کی ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ
میں جس قدر جنگیں ہوئیں وہ سب اپنی حفاظت کے لئے تھیں۔ اِس بحث
پر مصنف نے ایک الگ کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عنقریب طبع ہونے والا ہے
لہٰذا اس کی بحث زیادہ تر تفصیل کے ساتھ اُس کتاب میں آئے گی۔

۴۔ پادری میکال کا ایک اور بڑا اعتراض یہ ہے کہ "شرع اسلام
نے غیر مسلموں کے حق میں مساوی حقوق عطا کرنے کی ممانعت کردی ہے" علاوہ
دیگر براہین کے مصنف نے اس کی تردید میں آنحضرت صلعم کے دو فرمان پیش
کئے ہیں جو آنحضرت صلعم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں صادر
فرمائے ہیں جن میں آنحضرت صلعم نے تمام مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے کہ
وہ ان کی مدد کریں اور کسی قسم کی تکلیف نہ دیں۔ اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے
تو انہیں بچائیں اور وہ نوابنے اپنے مذہب پر رہیں۔ عیسائیوں کے گرجاؤں
کی حفاظت کریں۔ کسی زائر کو زیارت سے نہ روکیں۔ گرجا گر اگر مسجد
یا مکان نہ بنائیں۔ اگر کوئی دشمن مسلمانوں پر حملہ کرے تو عیسائیوں کے لئے
ضرور نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کی حمایت میں لڑیں۔ اگر کوئی عیسائی عورت

مسلمان سے شادی کرے تو اپنے مذہب پر قایم رہ سکتی ہے اور اس اختلاف مذہب کی وجہ سے اسے تکلیف و ایذا نہ پہونچائی جائے۔ اور پھر یہ حکم دیا ہے کہ جو اس کی پابندی نہ کرے گا وہ پیغمبر اور خدا کی نظروں میں نا انصاف اور نافرمان ٹھہریگا۔ ایسی بے نظیر رعائتوں پر بھی اگر مسلمان جابر اور متعصب کہلائیں تو صریح نا انصافی اور تاریخ کا خون کرنا ہے۔

اسی ضمن میں مصنف نے دار الحرب اور دار الاسلام۔ جزیہ۔ حقوق ذمیاں، رفیق و مملوک، شہادت غیر مسلم، تعمیر گرجا پر بڑی لطیف اور دلچسپ بحثیں کیں اور نہایت مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اسلام نے مسلم و غیر مسلم دونوں کو قانونی حقوق مساوی طور پر دیئے ہیں۔ چونکہ پادری سیکال کا حملہ اسلام پر عموماً اور ترکی پر تخصیص کے ساتھ تھا لہذا مصنف نے معاملات ترکی پر بحث کر کے فرمایا ہے کہ سلطنت عثمانیہ عیسائیوں کے حق میں نہایت نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرتی ہے اور بعض حالتوں میں مسلمانوں سے زیادہ ان کے ساتھ رعایات مرعی رکھی جاتی ہیں۔ اور اس بارے میں بڑے بڑے یورپین مصنفین اور مدبرین کی رائیں پیش کی ہیں جو معاملات سلطنت عثمانیہ سے خاص واقفیت رکھتے ہیں یا جنہیں بحیثیت سفیر ہونے کے ایک مدت دراز تک وہاں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک فہرست ان بڑے بڑے عیسائی عہدہ داروں کی دی ہے جو ترکی سلطنت میں مامور ہیں۔ خصوصاً اس ضمن میں مصنف نے جو معاصر رقم وارنا کا ایک واقعہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں سے بڑھ

کوئی قوم دنیا میں عیسائیوں سے ایسا شریفانہ برتاؤ نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ خود عیسائی بھی اپنے ہم قوموں سے ایسی رعایت کی توقع نہیں کر سکتے۔ لکھا ہے کہ ہنیاڈیس نے جو رومن کیتھولک مذہب پر تھا برین کووچ سے جو گریک چرچ کا تبع تھا دریافت کیا کہ اگر فتح تمہاری ہوئی تو کیا کرو گے۔ اس نے جواب دیا کہ میں ہر شخص کو مجبور کروںگا کہ وہ رومن کیتھولک ہو جائے۔ اس کے بعد اس نے سلطان سے یہی سوال کیا تو سلطان نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے قریب گرجا بنواؤں گا اور انہیں اجازت دونگا کہ خواہ وہ مسجد میں عبادت کریں یا صلیب کے سامنے سر جھکائیں۔ جب اہل سرویہ نے یہ جواب سنا تو انہوں نے بہ نسبت سٹین چرچ کے ترکوں کی اطاعت کو بہت غنیمت سمجھا (حصہ اول صفحہ ۱۸) اسی طرح سلطان سلیم نے اول بار رہا چاہا کہ عیسائیوں کے مذہبی رسوم کو بند کر دے یا انہیں تہ تیغ کر ڈالے۔ لیکن مفتی نے ہمیشہ منع کیا کہ ایسا کرنا احکام قرآن کے خلاف ہے۔ غرض مصنف نے مختلف تاریخی شہادتوں اور بڑے بڑے اہل الرائے کی رایوں سے اس امر کو بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ ترکی کا برتاؤ عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا رہا ہے اور اب پہلے سے بھی اچھا ہے۔

اسی ضمن میں مصنف نے جزیہ کا ذکر کیا ہے جس پر پادری میکال نے بہت کچھ زہر اگلا ہے اور لکھا ہے کہ عیسائی جزیہ دے کر ایک سال کے لئے اپنی جان بچاتا ہے اور ایک سال اور اپنی گردن پر سر قایم رکھنے کا مجاز ہوتا ہے۔ ذمیوں کے حقوق کا مصنف نے بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے

اور قرآن اور اقوال و اعمال آنحضرت صلعم سے بڑے شد و مد کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے جو حقوق غیر مسلم رعایا کو عطا کئے ہیں وہ کسی قوم نے اپنی غیر قوم کی رعایا کو نہیں دیئے۔ اور یہ ٹیکس جسے پادری صاحب "حق زندگی" سے تعبیر کرتے ہیں درحقیقت از روے شرع اسلام ان لوگوں کی حفاظت جان و مال کے لئے ہے جو مسلمانوں پر فرض ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے۔ شرع میں یہاں تک رعایت ہے کہ اگر دو سال کا ٹکس جمع ہو جائے تو صرف ایک سال کا لیا جائے اور گزشتہ سال کا معاف کیا جاوے۔ مسلمانوں کو ذمیوں سے زیادہ مصیبت بھگتنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ملک کی حفاظت کے لئے لڑائیاں لڑتے اور اپنا خون بہاتے ہیں۔ پادری صاحب نے یہ اعتراض خاص کر ترکی پر کیا ہے۔ حالانکہ وہاں کی حالت یہ ہے کہ ہر مسلمان جوان پر فرض ہے کہ وہ پانچ سال تک فوج میں کام کرے اور سات سال بحری فوج میں اور اس کے بعد سات سال ریزرو میں رہتا ہے۔ عیسائی ان تمام تکلیفوں سے بری ہے۔ ترک اگر ان شقتوں سے بچنا چاہے تو اسے دس ہزار پیاسٹر یعنی ۹۰ پونڈ ادا کرنے ہوں گے حالانکہ عیسائی صرف ۲۵ پیاسٹر یعنی چار شلنگ ۲ پنس ادا کر کے تمام تکلیفوں سے محفوظ اور تمام رعایتوں کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مصنف نے اس پر بڑی طول طویل اور عالمانہ بحث کی ہے۔

۵۔ پادری میکال نے ایک بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ شرع اسلام کا یہ قانون ہے اور بے شمار علماء کا اس پر فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ

وعدے یا معاہدے کا توڑ دینا روا ہے۔ پادری صاحب کا یہ اعتراض جس قدر بے بنیاد اور لغو ہے وہ ظاہر ہے۔ قرآن میں معاہدے کی کامل پابندی کی سخت تاکید ہے اور پیغمبر خدا صلعم نے اس کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ عیسائیوں کو آپ نے بذریعہ تحریر جو حقوق دیئے اس کا ذکر ہو چکا ہے اور یہی حال خلفاء راشدین کا تھا چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے فوج کو نصیحت فرمائی تو اس میں یہ بھی فرمایا کہ "جب تم کسی سے معاہدہ کرو تو اس پر قائم رہو اور اسے پورا کرو" اسی طرح حضرت عمرؓ نے جو ایک ذمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے تھے وفات کے وقت یہ وصیت کی کہ ذمیوں کے ساتھ اپنے معاہدوں اور اقراروں کی پابندی کرو۔ ان کی حمایت میں ان کے دشمنوں سے لڑو اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ اُن پر نہ ڈالو" اس کے علاوہ اسلامی تاریخ موجود ہے اُسے اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے غیر قوموں سے کیسے کیسے سلوک کئے کہ آج تک اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۲۔ ایک بڑا اعتراض پادری میکال کا یہ ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ مصنف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اول تو یہ قرآن کا حکم نہیں ہے دوسرے خود فقہا میں اِس مسئلہ کے متعلق اختلاف ہے۔ بلکہ بخلاف اس کے قرآن میں معافی کا حکم ہے۔ البتہ ایسے مرتد کو جو بغاوت کرتا ہے اور جنگ پر آمادہ ہے، "قتل کر دینے کا حکم ہے" یہ امر ارتداد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بغاوت کی وجہ سے ہے۔ جن فقہا نے قتل کا فتوے دیا ہے مصنف نے ان کے وجوہ پر بحث کی ہے اور ان کے استدلال کو ضعیف اور غلط ثابت کیا ہے

خدا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد عیسائیوں کے قانون کو جو مرتد اور کافر کے متعلق ہے دکھاکر بتایا ہے کہ اسلام میں بمقابلہ مذہب عیسائی کے کس قدر نرمی اور رعایت کا برتاؤ رکھا گیا ہے۔

اسی ضمن میں مصنف نے پادری میکال اور دیگر معترضین کے اعتراضات دربارۂ غیر مساوات غیر مسلمین کو بیان کرکے سب کے جواب کمال خوبی سے ادا کئے ہیں اور کامل طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے نہایت منصفانہ برتاؤ کی اجازت دی ہے اور عموماً مسلم اور غیر مسلم کو یک ساں حقوق دیئے ہیں اور یہ بات کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اور اسی کے ساتھ سلطنت ترکی پر جو متعصبانہ حملے کئے گئے ہیں ان سب کی اصل حقیقت کو دکھا کر اور بڑے بڑے مدبرین یورپ کے آرا پیش کرکے معترضین کی غلط بیانیاں ثابت کی ہیں۔ ہم نے عمداً اس مقدمہ میں سلطنت ترکی سے بحث نہیں کی۔ اِس لئے کہ اب ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ یورپین دول اب ینگ ٹرکس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہیں، اور ایک اسلامی دولت کی ترقی میں حائل ہوتی ہیں جیسا کہ اب تک ہوا یا اس میں سہولتیں پیدا کرتی ہیں۔ یورپ میں ترکی سلطنت مسیحی دول کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور اگر آپس کی رقابت ان کی سدراہ نہ ہوتی تو کبھی کی اُن کا شکار ہو چکی تھی۔ اِس نئے دور کا خیر مقدم اگرچہ بڑی خوشی سے کیا گیا ہے لیکن اُن کا دل جانتا ہے کہ اب اُن کا وہ زور نہیں چل سکتا جو سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں انہیں حاصل تھا کہ جو چاہا دباؤ ڈال کر لکھوا لیا اور جس طرح چاہا سلطنت کو نقصان

پہنچا کر اپنے لئے رعاتیں حاصل کرلیں۔

دوسرا حصہ اس کتاب کا سوشل یعنی تمدنی اصلاحات سے متعلق ہے اس حصہ میں مفصلۂ ذیل اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

۱۔ اسلام میں عورتوں کی حالت۔

۲۔ تعدد زوجات۔

۳۔ طلاق۔

۴۔ غلامی۔

۵۔ تسری۔

اگرچہ یہ مسائل اس قسم کے ہیں کہ اُن پر سالہا سال سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے اور مخالفین کو بار بار معقول اور مدلل جواب دیئے جا چکے ہیں، لیکن فاضل مصنف سے پہلے کسی عالم نے اِن مسائل پر عالمانہ اور محققانہ بحث نہیں کی تھی۔ مصنف کا استدلال صرف قرآن پاک سے ہوتا ہے۔ اِس چھوٹی سی کتاب کے پڑھنے والے کو اسلام کی اصل حقیقت اور اس کی خوبیوں اور نکتوں پر اس قدر عبور ہو جاتا ہے کہ سینکڑوں کتابوں کے پڑھنے سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ساری کتاب علمی معلومات سے بریز ہے اور ایک سطر بے کار نہیں۔ اس کتاب پر ریویو کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ مصنف کے حق میں ظلم کرنا ہے۔ غلامی پر اس سے پیشتر سرسید احمد خاں مرحوم ایک بیش بہا اور بے مثل کتاب لکھ چکے تھے، لیکن جس انداز سے مصنف نے اس مضمون پر بحث کی ہے ناظرین اُسے دیکھکر بے اختیار مصنف کی قابلیت اور محنت

کی مادو ہیں سگے۔ غرض کہ فاضل مصنف نے ایسا بڑا کام کیا ہے کہ اس کا جس قدر
شکریہ کیا جائے کم ہے۔ اس کتاب کے متعلق (جو انگریزی میں ۲۴۰ صفحہ پر ہے)
یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

لیکن میکال نے جو اعتراضات مختلف مضامین کے ذریعہ سے
اسلام اور ترکی سلطنت پر کئے ہیں اُن سے بہت کچھ بوئے تعصب آتی ہے
اور اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ رایٹ آنریبل مسٹر
جسٹس امیر علی کے ایک جوابی آرٹیکل کے جواب میں جو مضمون میکال نے
انگلستان کے مشہور رسالہ "نائن ٹینتھ سنچری" میں بھیجا تو اڈیٹر نے صرف اس
وجہ سے اُسے نہیں چھاپا کہ پادری صاحب موصوف اپنے مضامین میں اس قدر
بدزبانی اور بدلگامی سے کام لیتے ہیں کہ جس سے مسلمانوں کے دلوں کو صدمہ
پہنچتا ہے۔ اور پادری صاحب کے جواب طلب کرنے پر اڈیٹر رسالہ مذکور
نے ان کی تحریرات سے اس کا کافی ثبوت بہم پہنچایا ہے[1] جس سے غالباً
انھیں کچھ ندامت نہ ہوئی ہوگی۔

لیکن میکال اور ان کے بعض ہم نوا یورپین مصنفین کا یہ کہنا کہ اسلام
اپنے پیرؤوں کو چھٹی صدی کے بدؤوں سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں
دیتا اور مسلمان کبھی ترقی نہیں کر سکتے جب تک وہ مذہب اسلام کو ترک نہ کر دیں
ایک حیرت انگیز اور سخت حیرت انگیز امر ہے۔ یہ کس قدر جرارت اور دلیری

---

[1] دیکھو رسالہ نائن ٹینتھ سنچری بابت ماہ ــــــ سنہ مطبوعہ لندن۔

کی بات ہے، گویا دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنا، اور تاریخی واقعات کا خون کرنا ہے۔

کیا مسٹر میکال اور اُن کے دوست بھول گئے ہیں کہ موجودہ ترقی اور تمدن کی بنیاد اہل اسلام کی ڈالی ہوئی ہے۔ مذہب عیسوی ہمیشہ عقل و آزادی کا دشمن رہا حالانکہ برخلاف اس کے اسلام نے مردہ علوم و فنون کو جگایا، آزادی کو بڑھایا، غلامی کو مٹایا، نئی تحقیقات کی بنیاد ڈالی۔ جدید اکتشافات سے خزانۂ علم کو معمور کیا، اوہام باطلہ اور بطلان پرستی کی بیخ کنی کی، مذہب و سائنس میں تطبیق دی اور یورپ کے گھپ اندھیرے میں مشعل علم سے نور پھیلایا، علم حکمت و آزادی کا علم دنیا میں بلند کیا اسی کے طفیل سے رفتہ رفتہ وہ ترقی ہوئی کہ جس کے چکا چوند میں مسٹر میکال اور اُن کے دوستوں کی آنکھیں اس قدر خیرہ ہوگئیں کہ اب وہ اپنے محسنوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ مذہب عیسوی نے علوم و فنون اور آزادی اور علمائے پر جیسے جیسے ہولناک ظلم و ستم کئے ہیں اُسی قدر اور اُس سے زیادہ اہل اسلام نے ان پر احسان کئے ہیں اور اس پر بھی اس روشنی کے زمانہ میں وہ مورد الزام ہے۔ کیا ریورنڈ میکال اور اُن کے دوستوں کو یاد نہیں کہ عیسائی علما ہر فلسفی اور طبعی کو "کافر" "دہریہ" اور "مرتد" کا خطاب دیتے تھے۔ اور اس کے بعد ایک اور نہایت نفرت انگیز اور سخت لفظ ان لوگوں کے لئے ایجاد کیا گیا تھا وہ لفظ "محمدن" تھا چنانچہ راجر بیکن پر جس کے احسانات سے انگلستان اور یورپ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا محض طبعی اور فلسفی ہونے کی وجہ سے "مسلمان" ہونے کا اتہام لگایا گیا

تھا اور مسیحی علماء نے اسے مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ تحریریں اب تک موجود ہیں گویا لفظ "مسلمان" طبعی اور فلسفی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اور آج انہیں کے سپوت ہیں جو علی الاعلان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمان اسلام پر قائم رہ کر دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا اور یہ کہ اسلام دشمن علم و آزادی ہے۔

بہ بیں تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا

نوٹ:۔ اس کتاب کے ترجمہ کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ مصنف نے خود بھی اس کتاب کا اردو ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن انجام کو نہ پہنچا سکے صرف ابتدائی چند اوراق کا ترجمہ کر کے رہ گئے۔ اتفاق سے وہ اوراق ترجمہ ہمارے ہاتھ آگئے لہذا ہم نے تبرکاً اس قدر حصہ اپنے ترجمہ کا خارج کر کے مصنف کا اصل ترجمہ داخل کر دیا ہے۔ چنانچہ صفحہ (۱) سے صفحہ (۱۴) تک خود مصنف کا ترجمہ ہے۔ مصنف مرحوم کا ترجمہ پنجاب ریویو کے ضمیمہ میں چھپا تھا (ملاحظہ ہو پادری رجب علی کا مشہور رسالہ پنجاب ریویو کا ضمیمہ جلد نہم نمبر ۴ بابت ماہ اپریل ۱۸۸۷ء) اس اردو ترجمہ میں علامہ مصنف نے چند حاشیے بھی اضافہ کئے ہیں جو اصل انگریزی کتاب میں نہیں ہیں چنانچہ مقدمہ حصہ اول فقرہ (۱۴) صفحہ ۸ میں جو تفصیلی نوٹ فقہ حنفیہ لکھا گیا ہے وہ اصل انگریزی کتاب میں موجود نہیں ہے اس لئے ہم نے اردو ترجمہ میں نقل کر دیا ہے۔

مقدمہ تحقیق الجہاد

واشنگٹن ارونگ امریکہ کے ایک مشہور مصنف اور ادیب نے
آنحضرت صلعم کی بھی لائف لکھی ہے اس کے پہلے ہی صفحہ پر آنحضرت کی
ایک تصویر دی ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔
یہ تصویر مصنف کے اصلی خیال کا فوٹو ہے جسکی پہلے سے یہ رائے ہو وہ ایک
ایسے بڑے مصلح اور نبی اور بنی نوع انسان کے محسن کی لائف کیا خاک لکھے گا
اور یہ کچھ ارونگ ہی پر موقوف نہیں۔ یورپ میں یہ خیال عام طور پر پھیلا
ہوا ہے اور پولیٹیکل مصلحتوں نے بہی کام کیا ہے جو بھس میں چنگاری کرتی
ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں صدیوں سے جنگ و جدل
چلی آرہی ہے اور اگرچہ یہ جنگ و جدل ملکی ہے لیکن اس نے اپنے ساتھ مذہب
کو بھی سان لیا ہے۔ تلوار والے تو تلوار سے کام لیتے ہیں اور اہل قلم اپنے
دل کی بھڑاس یوں نکالتے ہیں۔ غرض یہ منحوس جنگ ایسی ٹھنی کہ ختم ہونے
کو نہیں آتی کمزور کا قاعدہ ہے کہ جب ہاتھ سے کام نہیں نکلتا تو زبان سے
کام لیتا ہے۔ عیسائیوں کو شکستیں کیا ہوئیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو بدنام
کرنا شروع کیا اور بدنام بھی کیا۔ کچھ کسر لگا نہ رکھا۔ جس زمانے میں آنحضرت

صلعم کی شہرت ہوئی تو روما کے ایک پوپ نے آنحضرت کے حالات دریافت
کرنے کے لئے ایک مشن عرب کو بھیجا۔ معلوم نہیں وہ مشن پہنچا یا نہیں پہنچا مگر
جو رپورٹ اس نے لکھکر بھیجی وہ کذب وافترا کی ایک پوٹ ہے۔ سچ نام
کو نہیں اور ایسی ایسی باتیں اور واقعات تصنیف کئے ہیں کہ الف لیلہ بھی اسکے
سامنے مات ہے۔ اور افسوس کہ یہ رسم اب تک جاری ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں
جاتا کہ کوئی نہ کوئی کتاب یا اخبار یا رسالے میں کوئی ایسا مضمون شایع ہوتا
ہو جس سے مسلمانوں کی دل آزاری نہ ہوتی ہو اگر وہ تمام کتب و تحریرات جمع کیجائیں
جو عیسائیوں اور خاص کر اہل یورپ نے اسلام بانی اسلام اور اہل اسلام کے
خلاف لکھی ہیں تو وہ ایک ایسا بڑا انبار کذب وافترا اور دروغ و بہتان کا ہوگا
کہ روٹر اور ٹائمز اس کے ایک صفحہ کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔ بات یہ ہے کہ
مسلمانوں کو کامیابی ہوئی آناً فاناً اور کامیابی پیدا کرتی ہے حسد اور خصوصاً
جب عیسائی ان کے آگے ہر جگہ ناکامیاب اور پسپا ہوتے گئے تو حسد کی آگ
اور بھڑک اٹھی اور بغض و کینہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ سارا فساد اسی کا ہے
گو اس وقت یورپ کی تہذیب و شائستگی اور سائنس کا آفتاب عین نصف النہار
پر ہے مگر تعصب کے جراثیم رگ رگ اور ریشے ریشے میں کچھ ایسے سرایت
کر گئے ہیں اور گوشت پوست میں کچھ ایسے پیوست ہو گئے ہیں کہ تیز سے تیز
شعاعیں بھی انہیں ہلاک نہیں کر سکتیں۔ آج کل اسے مذہبی تعصب نہیں کہتے
بلکہ یہ تعصب ایک دوسری ہولناک اور مکروہ صورت میں ظاہر ہوا ہے
جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اسے پالیٹکس یا ڈپلومیسی کہتے ہیں۔ اس کے لئے

ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں اور ہو کہاں سے ہمارے یہاں یہ سیاسی چالبازیاں اور عیاریاں تھیں کہاں ۔ جو لفظ ہوتا ۔ اگرچہ صدہا انقلاب ہوگئے حالات بدل گئے اور جو آگے تھے وہ پیچھے اور جو پیچھے تھے وہ آگے ہوگئے مگر افسوس ابھی تک دلوں میں کدورت وہی چلی آتی ہے درد جاتا رہا مگر کسک باقی ہے سانپ کبھی کا نکل گیا مگر یہ کم بخت ابھی تک لکیر پیٹے جاتے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ کسی کو کسی پر پھبکا نہ دیتے ہوں ۔

اسلام کی ترقی اشاعت کو جو بجلی کی رو کی طرح تمام عالم میں دوڑ گئی عیسائی دیکھکر حیران و ششدر رہتے تھے اور جب وہ اپنے نبی علیہ السلام کے حالات عہد جدید میں پڑھتے تھے تو ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی تھی ۔ حضرت عیسیٰ وعظ کرتے کرتے اس دنیا سے اٹھ گئے مگر اپنی قوم پر کچھ اثر ڈال نہ سکے یہاں تک کہ ان کے حواریوں کی یہ حالت تھی کہ پتا کھڑکا اور دہڑکا ، خطرے کے نام سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے ۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ جو لوگ اسلام لائے انہوں نے ہر طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں اور ظلم سہے گھربار چھوڑا بال بچے چھوڑے مگر مذہب نہ چھوڑا یہاں تک کہ اپنے مذہب کے لئے جانیں تک قربان کر دیں ۔ وہ بت جو گھروں میں خدا بنے بیٹھے تھے اور جو یہودیوں کی کوشش سے نکلے نہ عیسائیوں کی سعی سے ۔ انہیں وہ خود بخود پھینک پھینک کر اسلام میں داخل ہونے لگے ۔

اس غیر معمولی ترقی اور اثر کو دیکھ دیکھکر عیسائی حیران ہیں کہ یہ کیا ہو گیا ۔ جو کوئی نبی نہ کر سکا وہ پیغمبر اسلام سے کیونکر ہوگیا ۔ بس اس امر

یہ قیاس کر لیا کہ رسول اللہ صلعم نے اسلام بجبر پھیلایا اور اپنے ذہنوں میں وہ تصویر کھینچ لی جو ائرونگ واشنگٹن نے اپنی کتاب کے پہلے صفحہ پر دی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے اور ایسا کھلا واقعہ ہے جس کے لئے مزید تحقیقات یا پرانے کھنڈروں یا قدیم کتبوں یا بھوج پتروں کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کبھی آنحضرت کے زمانے میں یا اس کے بعد بجبر یا بزور شمشیر نہیں پھیلایا گیا بلکہ جس رواداری۔ مسالمت اور اعتدال کے ساتھ مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی اور جو فیاضانہ برتاؤ انہوں نے غیر اقوام کے ساتھ روا رکھا دنیا میں اسکی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ مجھے اس کے متعلق اس مختصر مقدمہ میں کسی شہادت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اسپر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں اور ان واقعات سے ہماری اور غیروں کی تاریخیں بھری پڑی ہیں اور جسے مذہبی پہلو سے اس مسئلہ کو دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

معترضین کو "جہاد" کا حربہ ایسا مل گیا ہے کہ اُسے جا و بیجا ہر موقع پہ پیش کر دیتے ہیں گویا اُسے مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کے لئے ایک ہیجا بنا رکھا ہے اور یہ ایک ایسا ڈراونا اور خوفناک لفظ ہو گیا ہے کہ اہل یورپ اسے سن کر اس طرح چونک اُٹھتے ہیں جیسے کبھی نپولین کے نام سے وہاں کے تاجدار سہم جایا کرتے تھے۔ لیکن کیا درحقیقت یہ لفظ ایسا خوفناک ہے! جہاد کیا ہے؟ اپنی حفاظت کے لئے ہاتھ پیر ہلانا اور حتی المقدور کوشش کرنا کب؟ جب جان و مال ننگ و ناموس اور مذہب پہ آ بنے۔ کون سا قانون ہے جو اس کی اجازت نہیں دیتا اور کونسا انسان ہے جو ایسے وقت

اپنی حفاظت نہیں کرتا۔ مدافعت اور اپنی حفاظت ایک قدرتی فعل ہے اور بڑے بڑے انسان سے لیکر ادنیٰ سے ادنیٰ کیڑے مکوڑے تک وقت پڑے پر اپنی حفاظت اور مدافعت میں سعی کرتے ہیں۔ اسلام نے کہیں بجبر یا بزور شمشیر کسی کو مسلمان بنانے کی اجازت نہیں دی اور نہ آنحضرت صلعم نے کبھی ایسا کیا نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔ جن لوگوں نے آنحضرت کے حالات کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہے کہ ابتدائی تیرہ سال آپ پر کیسے مصیبت کے گذرے ہیں۔ قریش نے ان کے ساتھ کیا کیا نہ کیا طرح طرح سے آپکی توہین و تحقیر کی۔ جسمانی مالی اور روحانی صدمے پہونچائے، ادائی نماز سے روکا، یہاں تک کہ تھوکا، کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالی، آپ کی گردن میں آپ ہی کے عمامے کا پھندا ڈال کر کعبہ سے باہر نکال دیا، تلقین و تعلیم سے باز رکھا اور ہر قسم کی اذیتیں اور صعوبتیں پہنچائیں۔ آپ کے پیرووں پر بڑے بڑے ظلم توڑے اور کوئی دقیقہ ان کے ستانے اور ان کی زندگی تلخ کرنے کا اٹھا نہ رکھا آپ کے اور تمام مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں ایک جتھا قایم کیا اور آمد و رفت میل جول اور تمام تعلقات باہمی قطع کر دئے۔ آخر انہیں مایوس و مجبور ہوکر اپنے وطن مالوفہ کو خیرباد کہنا پڑا اور آوارہ وطن ہوکر مکہ سے دور جاکر پناہ لی مگر ظالموں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور پہلے سے زیادہ ظلم و تعدی پر آمادہ ہوگئے اور فوجیں لے کر حملہ آور ہوئے اسپر بھی اگر آنحضرت صلعم خاموش صبر و تحمل کئے بیٹھے رہتے تو وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے۔ اسوقت آپ کا فرض عین تھا کہ اپنے تئیں اور اپنے رفقا کو ہلاکت سے بچاتے اور یہی کیا

اور یہی کرنا چاہیئے تھا اور ایسا کرنا بدرجہ مجبوری تھا کیونکہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا، اس لئے آنحضرت صلعم کے تمام غزوات دفاعی تھے۔

اس مسئلہ پر جس شرح وبسط اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس کتاب میں بحث کی ہے آج تک کسی نے اس پر ایسی غائر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اس زمانہ میں جبکہ جدید خیالات اور جدید فلسفہ ہمارے ملک میں گھر کرتا جاتا ہے اور اسلام اور اہل اسلام پر نئے نئے اور دلاویز طریقوں سے حملے کئے جارہے ہیں اور مسلمان انہیں پڑھ پڑھ کر اپنے اعتقادات و خیالات میں ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں ایک ایسی محققانہ کتاب کی بیحد ضرورت تھی۔ نئے تعلیم یافتہ تو خیر نشانہ ملامت ہیں ہی مگر اُن پر اپنے علما کو کیا کہا جائے جو اپنے کلام سے (خواہ وہ کسی نیت سے ہو) معترضین کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک عالم محدث کو جنہوں نے علوم دینی کو اردو میں شائع کرکے اسلام کی بڑی خدمت ادا کی ہے اور خاص کر کل صحاح ستہ کا اردو میں ترجمہ فرما کر ہند کے اہل اسلام پر احسان کیا ہے جب کوئی صحیح حدیث نہ ملی تو اپنی طرف سے ایک حاشیہ اس مضمون کا جڑ دیا کہ رسول کریم کے غزوات حصول فتح اور پھر اشاعت اسلام کی غرض سے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ اسے کیا کہا جائے۔ بہرحال ایسی حالت میں مولوی چراغ علی مرحوم کی کتابیں پیاسے کے لئے آب حیات مریض کے لئے نوشدارو اور مارگزیدہ کے لئے تریاق کا کام دیں گی۔ مرحوم اس ضرورت کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے اور جبکہ مقلد اور غیر مقلد سنی، و شیعہ تو تو میں میں

میں مصروف تھے وہ ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے دین و ملت کی ادا کر رہے تھے کہ اسکی نظیر ان کے بعد پھر نظر نہ آئی۔ بعض مدعیان حمایت دین و ملت کی آنکھیں اب کھلی ہیں اور دن ڈھلے پر ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور اس کے متعلق مشورے اور کمیٹیاں ہو رہی ہیں لیکن انہیں خبر نہیں کہ مدت ہوئی اسکی بنیاد سر سیدؒ ڈال چکے اور مولوی چراغ علی مرحوم اسکی تکمیل بھی کر چکے۔ اور خبر کیوں نہیں شاید اس کا اعتراف کرتے شرماتے یا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اعتراف کرو یا نہ کرو چلنا اسی نقش قدم پر پڑیگا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤ مگر بنیاد وہی ہوگی۔

مولوی صاحب مرحوم کا طریقہ تحریر سب سے الگ اور نرالا ہے وہ کبھی جوش میں آکر فصاحت کے دریا نہیں بہاتے دوسروں کو الزام نہیں دیتے عبارت کی رنگینی یا لطائف ادبی کا خیال نہیں کرتے اور نہ ناظرین کے جذبات کو مشتعل دیکر اپنی بات منواتے ہیں۔ وہ نفس معاملہ کو نہایت ٹھنڈے دل اور غور سے دیکھتے ہیں اس کے متعلق تمام واقعات جمع کرتے ہیں اور سوائے قرآن پاک اور افعال و اعمال آنحضرت صلعم کے کسی دوسری خبر پر اپنے استدلال کی بنیاد نہیں رکھتے۔ ان کا مطالعہ ایسا وسیع ان کی نظر ایسی غائر اور ان کی تحقیق ایسی گہری اور ان کی منطق ایسی مستحکم ہوتی ہے کہ جس مضمون پر وہ قلم اُٹھاتے ہیں پھر کسی دوسرے کے لئے ایک لفظ کی گنجائش نہیں چھوڑتے انکا زور جذبات انسانی پر نہیں بلکہ استدلال عقلی پر ہے وہ جذبات کو ابھار کر جوش میں لانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ناپائدار ہے بلکہ ازراہ تحقیق وہ مضمون کو

اس پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ اگر پڑھنے والا غور سے پڑھے تو اسکی صداقت
اس طرح ذہن نشین ہو جائے کہ پھر اس کا نقش نہ مٹ سکے۔ وہ شاعر نہیں محقق ہیں
وہ فسانہ نگار نہیں منطقی ہیں وہ واقعات اور اصل حقیقت سے بحث کرتے ہیں
تخیل و بلند پروازی سے کام نہیں لیتے۔ وہ اپنی تائید میں شاہان اسلام کے
تاریخی واقعات اور فقہا کی رائیں پیش نہیں کرتے بلکہ آیات قرآنی افعال و
اعمال رسول صلعم کو سند گردانتے ہیں۔ وہ کسی الزام یا اعتراض کو الزامی جواب
دیکر لفظی ہیر پھیر سے نہیں ٹالتے بلکہ جرأت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے اور
زور سے اسکی تردید کرتے ہیں اور یہی طریقہ ان کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے
اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی تصانیف تعلیم و تحقیق دین اسلام کا ایک ایسا بے بہا
مجموعہ ہیں کہ ان کو غور سے پڑھنے کے بعد حقیقت و حقانیت دین اسلام پر اسقدر عبور
ہو جاتا ہے کہ سالہا سال کی محنت اور صدہا کتب کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا
اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مرحوم نے اسلام کی ایسی بڑی خدمت کی ہے کہ ہم سب
کو ان کا بہت شکر گزار اور ممنون ہونا چاہیئے۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے
کہ مولوی عبداللہ خان صاحب ان کتابوں کا ترجمہ کرا کر اور بڑی محنت سے
اون کے مضامین ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر (جو اب تک طبع نہیں ہونے تھے) ترتیب
دے رہے اور شائع کر رہے ہیں۔

اب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جن موتیوں کی تلاش میں بڑے بڑے
شناور غواصی کر رہے ہیں وہ در اصل مرحوم کی خوشہ چینی کر رہے ہیں خواہ کوئی
[illegible] کرے یا نہ کرے خواہ ان کی کتابوں کا حوالہ [illegible]

اس کتاب میں مرحوم نے کمال تحقیق سے کام لیا ہے اور اس مضمون مختلف پہلوؤں پر ایسی خوبی سے بحث کی ہے کہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون کس قدر وسیع ہے اور فاضل مصنف کی جانفشانی دماغ سوزی اور انتہائی تلاش کا حال کھلتا ہے۔

اس کا ترجمہ مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب (مترجم فلسفہ تعلیم ہربرٹ اسپنسر) نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بہت بامحاورہ صاف اور شگفتہ ہے۔

پبلشر نے بھی اس کتاب پر بہت محنت کی ہے جا بجا ایسے حوالوں کا اضافہ کیا ہے جو مصنف کی نظر سے رہ گئے تھے اور بجائے ایک ادھ کے کئی ایک حوالے ہوگئے ہیں جس سے مصنف کے خیال کو بہت تائید ملتی ہے بعض حوالے جو انگریزی کتاب میں غلط چھپ گئے تھے ان کی بھی تصحیح کی ہے۔ عربی اسماء و اعلام کی جیسے کچھ مٹی انگریزی کتابوں میں خراب ہوتی ہے وہ ظاہر ہے ان ناموں کی صحت میں بھی بڑی احتیاط کی گئی ہے۔ کہنے کو تو یہ معمولی سا کام معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل اسمیں بڑی محنت اٹھانی پڑتی ہے اور بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام ایسا مشکل ہے کہ بعض مترجمین تو اس مشکل سے ڈر کر ترجمے ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مولوی عبداللہ خان صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اول تو انہوں نے اس بے نظیر کتاب کا انگریزی سے اردو ترجمہ کرایا اور پھر اسکی صحت اور چھپائی میں خاص طور سے محنت کی ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مقبول ہوگی۔

مقدمہ معراج العاشقین

حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ کا فیض سرزمین دکن پر عام ہے۔ انکا مزار مرجع خلائق ہے اور ان کی تصانیف ابتک لوگ تلاش کر کر کے شوق سے پڑھتے ہیں۔ حضرت ان بزرگان دین میں سے ہیں جن کی تصنیفات و تالیفات کثرت سے ہیں اور تقریباً سب کی سب فارسی میں ہیں لیکن تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے بعض رسالے ہندی یعنے دکھنی اردو میں بھی تصنیف فرمائے ہیں۔

حضرت برہان الدین غریب اپنے مرشد کامل حضرت سلطان الاولیا رخواجہ نظام الدینؒ کے حکم سے چارسو بزرگوں کے ساتھ دکن کی جانب روانہ ہوئے اور یہاں پہنچ کر دولت آباد (روضہ) میں قیام فرمایا اس مبارک اولوالعزم قافلے میں بندہ نوازؒ کے والد بزرگوار سید یوسف معروف بہ شاہ راجو قتالؒ بھی تھے[1] والد ماجد کے ساتھ خود حضرت اور آپکی والدہ ماجدہ بھی تشریف رکھتی تھیں۔ اس وقت آپکی عمر چار پانچ سال کی تھی۔ ابتدائی تمام تعلیم و تربیت آپ کی یہیں ہوئی۔ ابھی آپ کی پندرہ سال کی

---

[1] بعض مورخین کو اس سے اختلاف ہے اور لکھا ہے کہ سید یوسف اس کے بعد آئے ہیں ۱۲

تھی کہ والد نے رحلت فرمائی حضرت راجو قتالؒ کا مرقد خلد آباد میں اب تک موجود
ہے۔ والد کے انتقال کے بعد برداشتہ خاطر ہو کر والدہ ماجدہ کے ہمراہ دہلی واپس تشریف
لے گئے۔ سولہ سال کی عمر میں حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر
ہوئے اور شرف ارادت حاصل کیا علوم باطنی کی تحصیل حضرت شیخ سے اور علوم
ظاہری کی مولانا شرف الدین کیتھلی سے کی جب حضرت شیخ نصیر الدینؒ کا وقت قریب
آیا تو آپ نے خلعت خلافت حضرت بندہ نواز کو عطا فرمایا حضرتِ شیخ نے ۷۵۷ھ
میں رحلت فرمائی اور ان کی بجائے آپ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور مریدوں
اور طالبوں کو تسلیم و تلقین فرمانے لگے ایک مدت اسی میں مصروف رہے ۸۰۱ھ
میں تیمور نے دہلی پر حملہ کیا۔ فتح کے بعد ایک قیامت برپا ہوگئی۔ سیری، جہاں پناہ
اور پرانی دہلی میں آگ کے شعلے بلند ہوئے اور سارے شہر میں قتل و غارت کا بازار
گرم ہوا۔ اس کشت و خون اور فساد کے عالم میں حضرت مع اہل و عیال کے ترک
وطن کر کے دکن کی طرف روانہ ہوئے اس وقت حضرت کی عمر اسی سال کی
تھی بھیلسہ، گوالیار، بھانڈی اور گجرات کے دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے
دولت آباد (خلد آباد) پہنچے۔ دولت آباد سے ۸۱۵ھ دارالند تشریف لے گئے
سلطان فیروز شاہ کو جب حضرت کے آنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے امراء
و اعیان سلطنت کو بھیج کر بڑے عزت و احترام سے گلبرگہ بلایا۔ اور حضرت تادم وصال
وہیں مقیم رہے۔ سنہ وفات ۸۲۵ ہجری ہے۔ وصال کے وقت حضرت

تاکہ معلوم ہو کہ ان کا تعلق دکن سے کہاں تک تھا۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ چار پانچ سال ہی کی عمر میں یہاں آ گئے تھے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر تک یہیں رہے۔ اور اس کے بعد دلی تشریف لے گئے۔ اسی سال کی عمر میں ۸۰۱ھ آپ نے پھر دکن کی طرف مراجعت فرمائی اور اپنی عمر کے آخری پچیس سال یہیں بسر کئے اور اس سر زمین کو اپنی تعلیم و تلقین کی برکت سے فیض پہنچاتے رہے یعنے زندگی کا ابتدائی اور آخری زمانہ دکن ہی میں بسر ہوا صوفیائے کرام کی تعلیم کسی خاص فرقے سے مخصوص نہیں ہوتی۔ ان کا فیض عام ہوتا ہے۔ بلکہ طبقۂ عوام کے لوگ ان کی خدمت میں زیادہ حاضر ہوتے۔ اور طالب فیض ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے سمجھانے کے لئے انہیں کی زبان میں ان سے باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اور انہیں کی زبان میں تعلیم و تلقین بھی کیجاتی ہے حضرت کا معمول تھا کہ نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث اور تصوف اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ اور گاہے گاہے درس میں کلام اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم بھی ہوتی تھی جو لوگ عربی اور فارسی سے زیادہ واقف نہ تھے۔ ان کے سمجھانے کے لئے آپ دکھنی زبان میں بھی تقریر فرماتے تھے چونکہ حضرت کو تصنیف و تالیف کا خاص شوق تھا۔ اور آپ کے قلم سے ایک سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں نکلی ہیں اس لئے یہ قیاس کچھ بیجا نہیں کہ عام لوگوں کے سمجھانے کے لئے آپ نے بعض رسالے دکھنی اردو میں بھی تصنیف کئے ہوں۔

میرے پاس حضرت کے متعدد رسالے اس زبان میں تصنیف کئے ہوئے

موجود ہیں لیکن مجھے ان کے شائع کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اس لئے کہ ہمارے قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنی تصانیف کو بعض مشاہیر اور نامور بزرگان دین سے منسوب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رح اور غوث الاعظم حضرت عبد القادر جیلانی رح کے نام سے فارسی دیوان شائع اور رائج ہیں۔ اسی طرح اور بزرگوں کے نام سے مختلف قسم کی کتابیں اور رسالے لکھ کر منسوب کر دئے گئے ہیں۔ اس بنا پر مجھے ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ جو رسالے میرے پاس موجود ہیں وہ حقیقت میں حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہیں یا نہیں کیونکہ بعض رسالے جن کی نسبت متعدد ذرائع سے اور متواتر روایتوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضرت نے دکھنی میں لکھے تھے تحقیق کرنے سے ثابت ہوا کہ اصل فارسی میں موجود ہیں اور یہ اُن کا ترجمہ ہیں یہ ممکن ہے کہ حضرت نے بعض رسالے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں تصنیف فرمائے ہوں لیکن جب تک کوئی قطعی شہادت اس کی تائید میں نہ ہو یہ قیاس زیادہ قابل قبول نہیں ہوسکتا لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوا۔ اور کھوج میں لگا رہا کہ جب کسی رسالہ کے متعلق یہ تحقیق ہو جائے کہ یہ حضرت ہی کی تصنیف ہے تو شائع کروں۔ اس اثنا میں مولوی غلام محمد صاحب انصاری وفا مدیر تاج نے ایک رسالہ معراج العاشقین کا پتہ ڈاکٹر محمد قاسم صاحب کے کتب خانے سے لگایا اور جب انہوں نے مجھے یہ نسخہ دکھایا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے نکال کے دیکھا تو ایک ہی کتاب کی دو نقلیں تھیں

البتہ کہیں کہیں الفاظ اور عبارت کا اختلاف تھا جو قلمی نسخوں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں ایک بات کام کی نظر آئی کہ اس کے آخر میں یہ تحریر ہے کہ یہ ایک قدیم نسخے سے جس کا سنہ کتابت ۹۰۶ھ ہجری تھا نقل کیا گیا ہے اصل عبارت یہ ہے۔

"این نسخہ شریف راقم حقیر سراپا تقصیر سید محمد نصیر در قلعہ نصرت آباد ساگر من مضافات دار الظفر بیجاپور بتاریخ ہفتم ماہ رمضان المبارک ۱۱۷۶ھ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و شش ہجری از نسخہ متبرکہ قدیم کہ مکتوبہ ۹۰۶ھ نہ صد و شش ہجری بود نقل نمود"

اس سے مجھے بہت کچھ اطمینان ہوا اور ایک حد تک اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے زبان بھی قدیم ہے۔ اس کے علاوہ عشق نامہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ تصوف کی ایک ضخیم کتاب ہے جو حضرت خواجہ صاحب کے مرید محمد عبداللہ بن محمد عبدالرحمن چشتی نے احمد شاہ بہمنی (۸۲۸ھ تا ۸۶۲ھ) کے زمانے میں تصنیف کی۔ اس میں حضرت کی تصانیف معراج العاشقین اور ہدایت نامہ کا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے۔ اس میں کثرت سے خواجہ صاحب کے ملفوظات اور آپ کے وعظ و تذکار کے حالات درج ہیں۔

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی نہ کیا جائے تو کم سے کم اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ ۹۰۶ھ سے قبل کی تصنیف ہے۔ حضرت بندہ نواز کا سنہ وفات ۸۲۵ھ ہجری ہے۔ یعنے اس رسالے کی کتابت حضرت کی وفات سے ۸۱ سال بعد کی ہے۔ اس سے بھی یہ امر قرین قیاس بلکہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ہو یہ حضرت

ہی کی تصنیف ہے۔ اگران تمام قیاسات اور شہادتوں سے قطع نظر کرلی جائے توبھی اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ اگر حضرت کی نہیں توان کے کسی ہم عصر یا اس سے قریب زمانے کی تصنیف ضرور ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ قدیم اردو کا نہایت قابل قدر نمونہ ہے اوراس سے قبل کی تحریری زبان کا نمونہ ملنا دشوار ہے۔ اگرچہ یہ کوئی ادبی کتاب نہیں ہے اوراول سے آخر تک سراسر تصوف ہے تاہم اُس زمانے کی زبان کا تھوڑا بہت پتہ ضرور لگتا ہے اورموجودہ حالت میں یہ کچھ کم نہیں بلکہ بہت غنیمت ہے۔

جب یہ دو نسخے میرے ہاتھ آگئے اورمصنف اورزمانے کے متعلق کافی اطمینان ہوگیا۔ تومیں نے حضرت وفا کی فرمائش سے ایک صحیح نسخہ مرتب کرنا شروع کیا۔ قلمی کتابیں جیسی کچھ غلط لکھی ہوتی ہیں۔ وہ ظاہر ہے لیکن دکنی زبان کی کتابیں بسوائے خاص خاص نسخوں کے، سب پر سبقت لے گئی ہیں عام غلطیوں کے علاوہ جو اکثر بے سواد کاتب کرجاتے ہیں ان کا املا ایسا عجیب وغریب اور خط اس قدرخراب ہوتا ہے کہ صحیح لفظ بھی غلط نظر آتے ہیں اوران کی صحت میں بھی ایسی ہی دشواری پیش آتی ہے جیسے غلط الفاظ کی صحت میں۔ بات یہ ہے کہ اہل علم اورخاص لوگ عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھتے تھے اوردکنی کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے تھے۔ دکنی زبان میں کتابیں ایسے لوگوں کے لیے لکھی جاتی تھیں جو کم علم تھے یا عربی فارسی سے واقف نہ تھے۔ یہی لوگ ان کتابوں کو شوق سے پڑھتے اورنقلیں کرتے تھے۔ ایک نقل سے دوسری نقل میں غلطیوں کا اوراضافہ ہوجاتا تھا۔ اور کتاب غلط در غلط ہوجاتی تھی سوء اتفاق سے یہ دونوں

نسخے بہت ہی غلط بداملا اور بدخط ہیں۔ اگرچہ پرانی دکنی کتابیں پڑھتے پڑھتے مجھے اس کام کی رکتان آگئی ہے تاہم ان مسخ شدہ اور غلط نسخوں کی تصحیح میں بہت وقت پڑی بعض بعض جملوں اور لفظوں کی تصحیح میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ کہیں قیاس سے کام نکل آیا اور کہیں سیاق عبارت سے باوجود اس کے اب بھی بعض مقامات مشکوک اور قابل تصحیح رہ گئے ہیں۔ اگر اس رسالے کا کوئی اور نسخہ ہاتھ لگ گیا تو آئندہ اس کی تصحیح میں آسانی ہو جائے گی بہرحال بُرا بھلا جو کچھ بن پڑا وہ پیش ہے۔ آخر میں بعض اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی گئی ہے۔

عبدالحق

سائنس و فلسفه

۱۔ مقدمہ معرکۂ مذہب و سائنس
۲۔ مقدمہ مبادی سائنس

مُقَدَّمہ
کتاب معرکۂ مذہب و سائنس

۱

جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب شاہنامہ کو پڑھا ہے، انھیں جنگ سہراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہوگی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں آمادہ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ بڑا الم ٹریجیڈی واقع نہ ہوتی۔

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے

مصنف کا زورِ علم اور تبحرِ شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون
پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور
انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں
بند کر دیا ہے*۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔ پڑھنے
والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونہیں ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان ہمیشہ یہی
دھکڑ پچڑ اور ردوکد میں رہے گا؟ کیا وہ یونہیں اندھیرے میں ٹامک
ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اور نورِ ہدایت کبھی نہ پہنچے گا؟ رستم و سہراب کے
حال سے تین شخص واقف تھے ایک سہراب کا ماموں ژندہ رزم
جسے اس کی ماں نے اسی غرض سے اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ دوسرا
ہجیر۔ تیسرا کیکاؤس۔ لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے۔ پہلا

---

* میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی
ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان
میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہٖ قائم
رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات
و علمی مباحث۔ دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو کی بضاعت زبان میں
ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا مگر مولوی ظفر علیخاں صاحب نے جو در حقیقت
قابل مبارکباد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے لیکن یہ اسی سے
ممکن ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جس کی زبان میں اس قدر تیزی ہو جیسی فاضل مترجم کو حاصل ہے

درحقیقت نیک نیت ہے اور اسی کام کے لئے آیا ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ کہے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ دوسرا طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہوگیا اور اس نے جان بوجھ کر اس راز کو چھپایا۔ تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا۔ اسی طرح کی تین قوتیں مذہب و علم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں یعنی جہالت مخالفت حق اور نفسانیت۔ لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن شکر رہے گی۔ حق کا بول بالا ہوگا۔ دونو مخالف ایک دوسرے کو جانیں اور پہچانینگے۔ ظلمت کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے گا۔ دوستی دشمنی سے۔ رنج راحت سے۔ اور ٹیڑھی بجڈھی کاڈی سے مبدل ہوجائے گی۔ اور انسان کی کشمکش اور الجھن کا خاتمہ ہوجائے گا۔ کیونکر؟ اسے ہم آگے بیان کریں گے ؂

۳

بچے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں۔ اس کا ہاتھ پاؤں مارنا۔ غوں غاں کرنا۔ ڈر سے سہم جانا۔ پیار کرنے سے ہمک کر آنا۔ ماں کی محبت۔ غیروں سے وحشت۔ غرض یہ دہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قوی کا غلبہ ہوتا ہے اور دماغی قوی ادنی حالت میں ہوتے ہیں۔ جب بڑا ہوکر سیانا ہوجاتا ہے تو احساس اور خواہش کا دور شروع ہوتا ہے اور اعلیٰ دماغی قوی کے نشو و نما سے نظام جسمانی کی قوت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ احساس کی قوت بڑھ جاتی ہے اور حسی عدود اعصابی کی ساخت اور توسیع میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ یہ حالت جوانی

دیوانی کی ہے۔ جب شباب کامل ہو جاتا ہے تو تمیز حیوانی۔ احساس اور خواہشات عقل کی تابع ہو جاتی ہیں اور دماغی قوی اپنا رنگ دکھاتے ہیں ؛

لہٰذا انسان کی نشو و نما کی تین صورتیں ہوئیں۔ حیوانی۔ احساسی اور عقلی۔

قوۃ الحیوانیہ کے ذریعہ سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے۔ اور پھر اُسے اپنے افعال۔ جذبات و خیالات اور ارادے میں صرف کرتا ہے۔ مثلاً جسمانی ورزش (یعنی اعصابی حرکت) سے بھوک لگتی ہے۔ سخت رنج و الم یا غصہ یا دیگر جذبات کی وجہ سے آدمی نڈھال ہو کر کام سے رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے لئے ہمیں غذا کی ایسی ہی ضرورت ہے۔ جیسے انجن کو ایندھن کی یہی ایندھن یا غذا اعضلات یا اعصابی ریشہ میں بدل جاتی ہے۔ جب ہماری قوت صرف ہو جاتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن حساب پورا کرنے کے لئے ایندھن طلب کرتا ہے اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق آجائے گا اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتہ حیات ٹوٹ جائے گا۔

قوۃ الحیوانیہ قوت جمع کر لینے کے بعد اسے حیوانی۔ حسّی یا عقلی حصے میں صرف کر سکتی ہے تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشو و نما اور اس کے انتقال سے اپنی نسل کے نمو میں صرف کرتے ہیں ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا کی تلاش اور گھر کی ساخت

اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے
حاصل کرتا ہے چاہے تو اپنے جسمانی حصے کی تکمیل میں صرف کر سکتا ہے اور
چاہے تو دماغی تکمیل میں ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جانوروں
سے ملتی جلتی ہے۔ وہ بہت بڑی مقدار قوت کی حاصل کرتا ہے اور اسے
وہ عضلات، گوشت اور خون کے بنانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کا
صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی نسل کو بڑھائے۔
تعلیم کا یہ اثر ہے کہ وہ اس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے اور
خون کی لہر تمام سطح پر پہنچاتی ہے جس سے خاکستری رنگ کے عروقی
مادہ میں اکساد پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت
ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی ہے رات میں نیند اس کی تلافی کر دیتی ہے اور
دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تلطیف[1] گہری ہو جاتی ہے اور اکساد
کے لئے زیادہ گنجائش نکل آتی ہے۔ جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی
اور بڑھاتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بطور فضلے کے خارج بھی کرتا رہتا
ہے جو پیشاب پسینہ وغیرہ کے ذریعہ سے نکل جاتی ہیں لیکن جس قدر قوت
کہ جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راہ سے خارج نہیں
ہو جاتی۔ بلکہ دماغی ورزش سے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ دماغ
میں رہتے ہیں اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لیے بہت سا

---

[1] تلطیف۔ نرمی نمودن۔ مہربانی کردن۔

حصہ قوت کا صرف ہوتا ہے یہ قوت اس طرح مستتر رہتی ہے۔

صرف غذا کے ذریعہ سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر حس کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے۔ اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ۔ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جس طرح برف آس پاس کی اشیاء سے ایک مقدار حرارت کی جذب کر لیتی ہے۔ یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے اور جب برف پانی کی شکل میں مبدل ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستتر رہتی ہے۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ اور زیادہ قوت جذب کرتا ہے۔ اس طرح انجماد و سیلان اور تبخیر قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے۔ جو روشن جسم کے اجزائے صغیر کی کپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتلی میں پہنچتی ہیں۔ اور پیچھے کی طرف ریٹنا (تشبکہ) پر جا کر لگتی ہیں۔ اور اپنی حرکت دماغی اعصاب تک پہنچاتی ہیں جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں۔

آواز بھی ہوا کی حرکت ہے۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگاتے ہیں تو ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو وہاں سے قسم (جوف طبل) میں تموج پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا کو نجتی ہیں۔ اور وہاں وہ موسیقی کے خیال سے مبدل ہو جاتی ہیں۔

[illegible] اعصاب قوت میں منتقل ہو جاتا ہے ہم اس حصے کی

قوت کو جو سرخی کی شعاعوں سے متشکلہ پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے بتا سکتے ہیں
لیکن نہیں کہہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے۔ لہذا وہاں پہنچ کر
یہ مستتر رہتی ہے جس طرح کہ سورج کی قوت کوئلے کی تہوں میں مستتر ہوتی
ہے۔ اور اس وقت صرف ہوتی ہے جب وہ جلتا ہے اسی طرح سرخ روشنی
کی موجوں کے صدمے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں پہنچ جاتی ہے
اور وہاں جا کر خیال میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اور حالت منفعلہ میں رہتی
ہے۔

جہاں ادراک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ مادر زاد
اندھے کے دماغ میں سرخی کا کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنے
کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچی جس سے سرخی کا خیال پیدا ہوتا ہے
نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور عالم خیال اور عالم مادی دونوں میں
یہ حالت یکساں ہے۔

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا سنا سونگھا یا چکھا نہیں اس کی نسبت
ہم خیال بھی قائم نہیں کر سکتے۔

عالم خیال یادداشتوں کے مجموعے یا اس کے صرف کا نام ہے
یہ یادداشتیں ادراکات کے آثار باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے گا
تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو حسن کا خیال ہے جب ایک مصور
کوئی تصویر بنا رہا ہے۔ اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے۔ تو یہ قوت
اس کے دماغ پر سے فوراً نکل آتی ہے۔

جانور کا فعل اضطراری ہوتا ہے۔ جسے تمیز حیوانی کہتے ہیں وہ احساس ظاہری کے تابع ہوتی ہے۔ تعقل سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصاب دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ خیال شامل مسل رہتا ہے۔ ادراک عقل کا دروازہ ہے، احساس علم ہے بیرونی اشیاء کا جو جسمانی اثر سے حاصل ہوتا ہے۔ ادراک میں یہ اعصابی اثر ایک مرحلہ اور طے کرتا ہے اور بوجہ اس توافق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی مظہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات آوازیں ہمارے کان تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم آوازیں سنتے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن جونہیں کہ رکاوٹ رفع ہو جاتی ہے احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اکسادو واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچے تھے خیال کی صورت قائم ہو جاتی ہے۔

وہ اعصاب دماغی جو احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذبات لطیف کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے مثلاً میں نے ایک شئے دیکھی۔ اس کا ادراک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبہ کو تحریک ہوئی دل دھڑکنا اور دم گھٹنا شروع ہوا۔

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دارالخلافہ ہے اور

اسی کی وجہ سے انسان وحیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ اور مہذب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے بھیل یا گونڈ کی زندگی کا انحصار اُس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لئے اُس کی قوۃ حیوانیہ بہ نسبت دماغ کے جسم پر زیادہ تر صرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصار زندگی عقل پر ہے اور اس لئے اس کی قوۃ الحیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کمزور کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوۃ حیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہو جاتا ہے یعنی قوۃ حیوانیہ دماغی مادہ کی پرورش میں لگ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جسقدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسیقدر عقلی فعل کمزور ہو جاتا ہے اور جسقدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہو جاتی ہے۔

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں لیکن جذبات انسانی کچھ ایسے قابل وقعت نہیں سمجھے جاتے حالانکہ یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ لہذا اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہوتے ہیں اور ہمارے رنج و راحت کا حساب انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے جذبات ہماری عقل کو ابھارتے ہیں

کہ ایسا ڈھنگ نکال لے کہ اُن خوشگوار اثرات کا پھر اعادہ ہو سکے لیکن بخلاف
اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے یا بعض آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ
وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذبات عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے
پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کا نام نہ آنے پاوے۔
مطالعہ میں اگر لطف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقی کا خاتمہ ہو جائے
بال بچوں عزیزوں اور دوستوں سے محبت نہ ہو تو کوئی خاندان ہو
بلطف محبت ہو۔ شکل رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو
فنون لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔
جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان
کی نشو و نما انسان کی بہبودی اور ترقی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے
جیسی قوائے عقلی کی نشو و نما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ
وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن بعض اوقات
ان میں اَن بن ہو جاتی ہے۔ مثلاً خواہش کا رجحان ایک خاص طرف
ہے۔ مگر عقل کہتی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں اور یہی بنائے مخاصمت ہوتی
ہے۔
جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ غصہ کرنے سے
دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مارے شرم کے تمام سطح جسم پر خون
دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی
پیدا ہو جاتی ہے۔ اور دماغی امراض سے عقل میں فتور آ جاتا ہے اکثر

بد باطن کے چہرے کو دیکھئے پھٹکار برستی ہے بخلاف اس کے
ایک نیک نفس زندہ دل کے چہرے کو ملاحظہ کیجیے جیسے پھول
کھلا ہو۔

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعہ سے
دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی کیسے چڑچڑے اور غصہ ور ہو جاتے ہیں۔
قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف
جب طبیعت نڈھال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں
غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زنانہ
ہے اور دوسری مردانہ۔ اگر صرف عقل ہی کی نشو ونما اور ترقی زیادہ
ہوگی تو جذبات محدود اور کمزور ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی
طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان
ذکی الحس اور بزدل عزیزا ور کم عقل ہو جاتا ہے۔

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال
پر لانا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہیں نہ کہ تنازل کرنے
کے لئے۔

عقل انسان میں تشخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذبات
رتیت اور اُنس بحیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے اور بحیثیت
جذبات کے دنیا بھر اور دل کے ایک ہے پرندہ عقل ودماغ
آدمی اپنے ابنائے جنس سے بھاگتا اور صحبت سے نفرت کرتا ہے

اور تنہائی میں خوش رہتا ہے لیکن پرزور جذبات والے آدمی کے لئے
تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا گھل مل جاتا ہے کہ اس میں
بے رفتہ رفتہ رنگ تشخص غائب ہو جاتا ہے اور خیالات کو باقاعدہ
ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی۔ پُرزور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار
اور آزاد سا ہو جاتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا جہاں
عقل ہی عقل ہوتی ہے۔ اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی
حفاظت اور اپنا ہی خیال ہوتا ہے جو خودغرضی تک پہنچ جاتا ہے
جذبات ہمیں صرف اپنی ایک ذات تک نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی
طرف بھی مائل کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں اور اشیائے قدرت سے
محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں اور اس کے
ذریعہ سے دماغی قوی اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا۔ ظاہر اور باطن میں موافقت
قائم رکھنا۔ ایک دوسرے کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا جسم کے افعال
کو عقل و جذبات کے زیر حکومت رکھنا مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں
تمدن۔ پالٹیکس اور اتحاد مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے
ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور
برابر بڑھائے۔ باہم اعتدال قائم رکھے۔ اور قوت حیوانی کو دماغی اور
احساسی حصہ جسم کی پرورش اور نشوونما میں یکساں صرف کرے۔

۳

حیات کے دو مقصد ہیں۔ ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائش نسل۔ قوت کے انجذاب کے لئے ضرور ہے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے اور اس غرض سے کہ وہ مادہ اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے حیات کے لئے ضرور ہے کہ اس میں معرفت طبعی ہو۔ جہاں ساخت اعضا ادنے درجہ کی ہے وہاں یہ کم ہوتی ہے اور جہاں ساخت پیچیدہ ہوتی ہے وہاں زیادہ ہوتی ہے۔

بقول لب منز کے حیات حجریات میں سوتی ہے۔ پھولوں میں خواب دیکھتی ہے اور انسان میں جاگتی ہے۔

اس معرفت طبعی میں ارادہ ہونا چاہئے زندہ رہنے بڑھنے اور نسل کے بڑھانے کا۔ نیز طبعی تمیز ہونی چاہئے جس کے ذریعہ سے وہ سمجھے کہ کیونکر زندہ رہنا بڑھنا اور نسل بڑھانی چاہئے۔ بغیر اس تمیز کے ترقی حیات کے لئے مناسب اور غیر مناسب اشیاء کا انتخاب کرنا ناممکن ہے اور بغیر اس ارادہ کے کہ زندہ رہنا چاہئے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

تمیز طبعی افزایش اور نشو ونما کا پیمانہ ہے۔ اس کا تعلق ہر وجود کی ضروریات سے اس طور پر ہے کہ حیات کے ان دو مقاصد کے لئے کافی ہو۔ کیونکہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کی قوت ایسی شئے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی اور قوت کی تولید ضائع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشو و نما کے لئے روشنی کی ضرورت

ہے اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں لگا دیا جائے تو جو قوت اس نے زمین سے حاصل کی ہے وہ اس شئے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں مل سکتی جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہو جائے گی تو وہ مرجھانا شروع ہو گا۔ اور مر جائیگا۔

پودے کی نشو و نما کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ ہیں۔ وہ اُسے کچھ تو اُس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے ؛

حیوانی زندگی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک جگہ نہیں بلکہ دُور پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کے جمع کرنے کے لئے اُسے حرکت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اُسے دی گئی ہے۔

حیوانات کو ایک اور محرک شئے عطا ہوئی ہے جو پودوں میں نہیں یعنی خوشی کا احساس یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی کامل نشو و نما کا باعث ہوتا ہے اور ایک احساس تکلیف کا ہے جو اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے اگر اُسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے کی بھی کوشش کریگا اور اس طرح اس کی حیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حواس ارادہ کو اکساتے اور تمیز طبعی کو سبق دیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے منقسم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہے۔ چھوٹا بچہ انڈے کے اندر نہ صرف خیال کرتا ہے بلکہ اس سے

فعل بھی صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نکلنے کے لیے خول توڑتا ہے۔ اور باہر نکلتے ہی دانہ چننے کے لیے چونچ کھولتا ہے۔ قید کی حس نے اس کے ارادے کو ابھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئے اور خول ٹوٹ گیا۔ لیکن یہ تمیز طبعی کا کام تھا تجربہ سے کچھ علاقہ نہیں کیونکہ اس سے پیشتر وہ کون سے ایسے محبس توڑ کر باہر نکلا تھا۔ اسی تمیز نے اس کی چونچ کھلوائی۔ یہ ننھا سا جانور زندہ ہے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسے زندگی دی گئی ہے اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہے۔ چھوٹا بچہ دنیا میں ارادے تمیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہے۔ زندہ رہنا اس کے لئے لطف ہے۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہے۔ اس خواہش کا پورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہے۔ خواہش کا پورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہے اور اس کی طلب اس کی پہلی کوشش ہے۔ کس تجربہ نے اُسے یہ بتایا ہے کہ منہ اور گلے کے ذریعہ سے دودھ کا پینا اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے یہ تمیز طبعی ہے جس نے اُسے اس فعل پر آمادہ کیا جس سے اس کی بھوک کا احساس رفع ہوا۔

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو ان کے حیواتی نشو و نما کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو حیوان کے اردگرد پائی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کی ذاتی نشو و نما یا اس کی نسل کی افزائش کا تعلق ہے۔ یا تو اسے خوشی دیتی ہے یا تکلیف۔

نظام اعصابی ایک بڑا قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے۔ تمام جسم پر

حسی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوٹتے ہیں جس میں باریک باریک، عصابی جڑیں ہوتی ہیں اور آپس میں خوب ملی ہوئی ہیں۔ سب سے بیرونی عصبیہ جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دماغ تک پہنچاتی ہیں۔ اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں اور ان خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے حیوانات خیالات پر سے کام نہیں کرتے ہیں۔ سوائے اس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد کے مفید ہوں۔ یعنی ذاتی فلاح اور افزائش نسل ؛

انسان اور بھی کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف ہے دوسرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کرسکتے ہیں۔ فطرت نے لباس اور پناہ دے رکھی ہے۔ مثلاً ان کے بال یا پر یا خول ہوتے ہیں یا زمین کے اندر کھوؤں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ جہاں گرمی سردی کا گزر نہیں۔ لیکن جسم انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت دوسرے حیوانات کے احساس کرنے میں بہت تیز ہے۔ اور تاہم وہ دنیا میں بے بال و پر کے ننگا منگا آتا ہے لہذا اسے مصنوعی لباس کی ضرورت ہوئی لیکن لباس کے تیار کرنے کے لئے اُسے ایسی قوت عطا کی گئی ہے جو دیگر حیوانات کی تمیز طبعی سے اعلیٰ ہے ؛

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لئے ضروری ہے۔ ہر حیوان کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اُس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور یہ قوت اس ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے ؛

بھیڑ مادّہ اور قوت کو غذا کے ذریعہ سے اپنے میں جذب کرتی ہے
اور وہ قوت اُون کی شکل میں مادّہ کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں بھی
مادّہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور دماغ پیدا
کرتا ہے جو اسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے
اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی وسعت
محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن
ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو۔ مگر کثرت
سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی
آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو
ہماری زندگی کے اس حصہ کو منور کرتی ہے جسے حیوانی یا مادّی زندگی
سے کچھ تعلق نہیں ہمیں رنگوں کے تناسب حسن صورت اور آوازوں
کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے حیوانی زندگی کو ان کی مطلق
ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس میں حیوانی احساس
کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہیے۔ کیونکہ اگر
ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیز دوں۔ احساسات
اور قوت ارادی کا محض بیکار رہجاتا ہے۔ انسان ایسی اشیاء سے بیحد
مسرت اور لطف حاصل کرتا ہے۔ جنھیں اس کے حیوانی احساس سے کچھ
تعلق نہیں۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ دھنک کو دیکھکر کتے یا
گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان اس سے لطف اٹھاتا

ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے دیکھنے سے اُس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ جو اس کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں۔ لوری یا گانا سننے سے انھیں بھی مزہ ملتا ہے۔ خوب صورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں۔

انسان کی ساخت میں حصہ اسفل میں حیوانی آلات ہیں اور حصہ اعلیٰ میں روحانی آلات۔ حصہ اسفل کو ہاضمہ اور توالد سے تعلق ہے اور حصہ اعلیٰ قوت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ جسے حصہ اسفل توالد و تناسل میں صرف کر دیتا ہے حصہ اعلیٰ میں دماغ یعنی مقام عقل ہے۔ قوت حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی جنبش سے فطرت حیوانی یا فطرت روحانی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔

وحشی اقوام میں قوت حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہے اور دماغ بیکار رہتا ہے لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں قوت حیات زیادہ تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہے اور شہوانی زندگی کمزور رہ جاتی ہے۔ کیونکہ سخت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بیکار ہوتے ہیں اور ان کی درستی کے لئے دوسرا اعصابی مادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ ذرات جو توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں بنتے بند ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جس قدر دماغی محنت کی جائے گی اسی مناسبت سے وہ توالد و تناسل کے مزاحم ہو گی۔ کیونکہ دماغی محنت میں وہ تمام قوت صرف ہو جاتی ہے جو بصورت دیگر اُن

ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں۔

جب توجہ فطرتِ حیوانی کی طرف ہوتی ہے اور جذبات وعقل کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہے تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہے۔ جیسے دوسرے حیوانات میں تمیز طبعی اُس وقت وہ مسرت جو حصول علم۔ ورزش عقل احساس حسن وغیرہ سے ہو سکتی ہے زائل ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب عقل پر بہت زور دیا جاتا ہے تو رنج وراحت کا وہ احساس جو اُن چیزوں سے حاصل ہوتا ہے جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں تیز ہو جاتا ہے اور فطرت حیوانی کمزور ہو جاتی ہے۔

رنج وراحت کا ادراک کیا ہے؟ یہ درحقیقت قوت کی تحلیل کا نام ہے چنانچہ دوسرے حیوانات کی زندگی کو دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہے انہیں نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوشخط کتاب دکھاؤ اسے کچھ لطف نہ آئیگا کیونکہ اس کے دماغ میں کوئی شئے اُسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہے۔ اُس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہے جس میں شعاعیں آئیں اور نکل گئیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی قوت سے ایک روحانی قوت بھی ہے اور روحانی توالد و تناسل کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے، مگر اس طرح نہیں جیسے ہم عالم مادی میں پاتے ہیں۔

پانسو برس ہوئے ایک بڑے دانشمند نے ایک کتاب لکھی تھی اس کے خیالات ننھے ننھے بیج تھے جو ڈال دیئے گئے۔ میں نے اس کتاب

کو کھولا اور پڑھا۔ اُن بچوں نے میرے دماغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھولے پھلے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات وہی باتیں وہی تخیل نسلاً بعد نسلٍ پیدا ہوا اور بڑھا اور زمانہ کی مناسبت سے ان میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہا۔ گویا یہ سب اُن اصلی خیالات کی زندہ اولاد ہیں جو اُس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

قطع نظر اس قیاس کے ہم مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قوت ہی کے تغیر و تبدل سے روشنی حرارت اور برق جیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دماغ میں بھی تغیر و تبدل سے قوت افعال ارادہ ادراک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانی زندگی میں رنج و راحت سے قوت کی تحلیل کا پتہ لگتا ہے اور ہم اُس قوت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشو و نما پاتی ہے اُس قوت سے کر سکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی۔ روحانی زندگی میں رنج و راحت قوت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوت کہ جذب ہوتی ہے وہ خیالات کے سلسلہ سے نشو و نما پاتی ہے۔

مقصد حیات جس کے کارکن رنج و راحت ہیں حیوان کی نشو و نما اور اس کی نسل کی افزائش ہے۔

روحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشو و نما ہے جسم میں

قوت کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفاع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشو ونما ہوتی ہے حیات کے ذریعہ سے روحانی زندگی بڑھ سکتی اور نشو ونما پا سکتی ہے۔ ہر درخت اور حیوان کی نشو ونما کی ایک حد ہے۔ تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے جنہیں مادی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت میں لئے جا رہی ہے وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدنی اور پولٹیکل ترقی ہے اور اسی پر اُسے ساری ہمت اور قوت صرف کر دینی چاہیئے۔ اس خیال کی بنا پر بنی نوع انسان کل ایک ہیں جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آئندہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربے اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ ہے اور آئندہ زمانہ موجودہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ غرض تمام توجہ اور خیال انسان کی آئندہ ترقی پر ہونا چاہیئے۔ اور نیکی اور برائی اسی میں ہے جس سے عام بنی نوع انسان کی بہبودی یا مضرت متصور ہو۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقی جسمانی انحطاط کا باعث ہوتی ہے جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جو وحشی اقوام میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک وحشی قوم کے بدقوارہ ضعیف اور مریض افراد بچپن ہی میں مر جاتے ہیں۔ مہذب

ممالک میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں۔ کیونکہ سائنس ان خرابیوں کی حفاظت کرتا انھیں پھیلاتا اور آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ وحشی اقوام میں از روئے انتخاب فطری ضعیف اور مریض خود بخود مر جاتے ہیں۔ مہذب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا اور اس لئے قوم میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

سب سے ادنیٰ جانداروں میں سب سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے بعض چھوٹے جاندار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچے پیدا کر دیتے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں بلوغ تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے۔ غریب لوگ جنہیں جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام کم لینا پڑتا ہے۔ ان کے کثرت سے بال بچے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جنہیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے تمدنی ترقی تقسیم کار میں ہے۔ غیر متمدن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا وہ اب بیس شخص کرتے ہیں پہلے ایک ہی شخص لوہار۔ بڑھئی۔ درزی۔ موچی۔ معمار ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا۔ بڑھئی کا دوسرا۔ درزی کا تیسرا۔ موچی کا چوتھا۔ معمار کا پانچواں اسی طرح ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو مل گیا۔ اس سے اور ترقی ہوئی تو

ایک ہی پیشہ کی کئی شاخیں ہوگئیں اور ہر شاخ کا کام علیحدہ علیحدہ شخص کرنے لگے اور روز بروز کام کی تقسیم کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے۔ دوسرا لکھتا ہے۔ تیسرا صاف کرتا ہے چوتھا اسے صحیح کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا درحقیقت یہ تقسیم کار ترقی کی علامت ہے؟

انسان یہاں کچھ ایسے جھگڑوں اور مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کی خوشی کا دارو مدار زیادہ تر اس کی ذات پر ہے۔ اسے یہ خیال ہرگز تسلی نہیں دے سکتا کہ آئندہ دو ہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی یہ تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس خیال سے اُس کی تکلیف یا درد میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ایک ایسی قوم میں جو اعلیٰ درجہ کی مہذب نہیں خوشی کی مقدار بہت زیادہ ہے بہ نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ہے ایک گنوار یا کھیت کے مزدور کو دیکھو کیسا خوش اور مگن ہے۔ برخلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ۔ مثلاً لندن پیرس۔ شکاگو۔ نیویارک میں جو چشم و چراغ عالم کہلاتے ہیں۔ وہاں اُمرا خوشی کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں دولت صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ قعرِ ذلت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہٰذا محض تمدنی و پولٹیکل ترقی اور محض یہ خیال کہ آئندہ کسی بعید زمانے میں یہ تکلیف اور رکاوٹیں رفع ہو جائیں گی انسان کے دل کو تسلی نہیں دے سکتا۔

اب دوسرا جواب مذہبی عقیدہ میں ہے۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور اُبھارتا ہے بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق عام بہبودی سے ہو۔ اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہے اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک دیگا۔ اور تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جائے گا۔ انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقی کا باعث ہوگا۔ اُن قویٰ اور امتیازات کا وجود جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممیز کرتے ہیں قطعی ہے۔ دوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ اُن کی ذاتی نشو و نما یا ترقی کا باعث نہ ہو۔ گھوڑا کبھی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی نشو و نما کے لئے ضروری نہیں ہے پس وہ چیزیں جن کے لئے انسان کی حیوانی فطرت خواہشمند ہے ضرور حقیقی وجود رکھتی ہیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جن کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت دوڑتی ہے ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہے۔ تمیز طبعی ایک قسم کی خواہش ہے جو ہمارے وجود کے قانون کا اتباع کرتی ہے اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہے۔

انسان کی مذہبی تمیز کا سراغ لگانا اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگانا ہے۔ جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی

فطرت کی آواز ہے۔ جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اُس کی حیات و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے اسی قسم کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے۔ مثلاً ہر طریقہ گورنمنٹ صحیح اصول پر قائم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصولوں کو پائمال کر دیتا ہے تو اس طریقہ گورنمنٹ میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے یعنی جب یہ مجموعہ توہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ کسی ایک صداقت میں مبالغہ کیا جاتا ہے اور اسے آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے بالکل روگردانی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہوتا ہے۔

۴

انسان میں دو طبعی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک تو ہر واقعہ کے سبب دریافت کرنے کی جستجو ہے، دوسرے منتہائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے۔

انسان کے دماغ پر دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی

اشیاء کو خواص کے ذریعے یعنی حس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیاء اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے اگر کسی میں کوئی حس نہیں تو اس حس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مادرزاد اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت قائم ہے۔ حاصل کرتا ہے۔ یہ مسرت۔ غصہ اور خواہش کے ادراک ہیں۔

یہ ادراکات مفرد اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آ سکتے گویا معرفت طبعی کے انتہائی سالمات ہیں۔ جن کے ملنے اور ترکیب پانے سے بے شمار مختلف صورتیں قائم ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں ادراکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدا میں انھیں حاصل کرتا ہے۔

علت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تمیز طبعی انسان کو علت و معلول کی تلاش پر ابھارتی ہے۔ کیونکہ اس کی صداقت کا اُسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی ناممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی۔ اور حکمت و سائنس اور علم اخلاق کا مطالعہ بیکار ہوگا۔

علت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علت اولیٰ کہلاتی ہے [illegible] کرتی ہے

اُسے علت ثانیہ کہتے ہیں اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم جو ساکن ہے ٹکرائے اور اُسے حرکت دے تو اس کی علت ثانیہ پہلے جسم کی قوت متحرکہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی علت ہے۔ علل ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علت اولیٰ پر جاکر ختم ہوتا ہے اور انسان فطرتاً علل ثانیہ کے سلسلہ میں اُس مصدر حرکت کو ٹٹولتا ہے۔ جو خود بخود پیدا ہوئی اور جسے وہ علت اولیٰ کہتا ہے۔

علت کا خیال مفرد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اُس کا تعلق جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علت کے خیال کے لئے کافی نہیں کیونکہ اس کے متعلق یہ تصور کرنا ممکن ہے کہ وہ سلسلہ علت و معلول سے بالکل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگرچہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہم اُسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم ان تمام اشیاء کو جو ہیں الگ کر دیں۔ نیز ہم یہ فرض کریں کہ کوئی اور ایسی شے نہیں ہے جو ان کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اُس نے حصہ لیا ہو۔ تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لئے بالکل ناقابل تصور ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہے۔

جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہے تو اُسے اس حالت کے

کرنے کے لیے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو اس سے بالکل الگ ہو۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلۂ علت و معلول سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں ہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں۔

کیا یہ عقیدہ قابل اعتماد ہے یا محض دھوکا ہے؟

اگر یہ دھوکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان علت کا خیال اس واقعہ سے متعلق کرتا ہے جو دوسرے واقعہ سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہے چاند کی تبدیلی اور موج کی مد ایک ہی وقت میں پائی گئی۔ [illegible] نے چاند کی تبدیلی کو موج کی مد کا باعث قرار دیا۔ لیکن یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کمی بیشی موج کی مد و جزر کی تابع ہے۔

ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہے۔ اس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یکسانی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور تاہم علت کا خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا دن رات کے بعد آتا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ رات دن کی علت یا سبب ہے۔

علت و معلول کا نتیجہ تجربہ سے اور پختہ ہو جاتا ہے۔ تجربہ یقین کا معلم ہے جس طرح احساس تمیز طبعی حیوانی کا۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علت کا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ وجود کے خیال میں یہ ضرور نہیں ہے کہ قوت کو خیال بھی ہے۔ قوت کا تصور ہو سکتا ہے لیکن یہ ہم نہیں مان سکتے کہ

کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہے اس طرح قوت کا خیال تو ہم میں ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

علت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشو و نما بلکہ ہماری اعلیٰ ہستی کی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔ حیوان کو علت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف علل ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ گو تجربہ سے بندوق دیکھکر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نالی میں سے گولی نکلی تو مجھے چوٹ لگے گی یا مر جاؤں گا لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور اس لئے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کر سکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربے نے اُسکے غلط ثابت نہ کر دیا؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جہالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کریگا۔ اسی قدر اُسے ترقی ہو گی حیوان جو علل ثانیہ تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اسی حالت میں ہے۔

ادنیٰ سے ادنیٰ دماغ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں قوت ہے اور اُس قوت کا مقام ارادہ ہے اور یہیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گو انسان ارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے جہاں ارادہ رکا ہم چلتے سے رُک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اس کے تمام افعال اس مختار قوت پر مبنی ہیں اُس کا یہ خیال کہ اُس کے افعال ارادی بعید اسباب کا نتیجہ نہیں وہ سخت

منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

عالم مادی میں انسان ایسی اشیاء میں تغیرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔ وہ ایسی حرکات دیکھتا ہے جس کا باعث وہ نہیں ہے اور ایسے نتائج دیکھتا ہے جن میں اس کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہے جس پر اسے کوئی قدرت نہیں۔ جو اس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو اس سے زیادہ قوی ہے۔

انسان میں قوائے دماغی مادہ پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسط انسان حرکت میں آتا ہے انسان اس کے سبب دریافت کرنیکی ٹوہ میں رہتا ہے اور اسے وہ ایک ایسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھتا ہے جو اس سے باہر ہے اور اسی قسم کی ہے جیسی اس میں ہے۔ ایک ادنے عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب (علل) میں پھنس کے رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہے۔ سمجھ قریبی اور درمیانی سلسلہ اسباب سے ہوتے ہوئے خود ذرا سرچشمہ حرکت تک پہنچ جاتی ہے۔

باصرہ ایسی حس ہے جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہے۔ لیکن سب میں ایک سی قوت بصارت نہیں ہوتی صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت یا خوبی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہے یہی حالت چشم بصیرت کی ہے۔ بعض معلومات کے ذریعہ سے عقل کو زیادہ تیز

اور خوبی ہے ، سمجھتے ہیں لیکن ادنٰے اسباب یا علل کے خول سے نکل کر قوت ادلٰے کے منظر تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یافتہ عقل کا کام ہے ۔

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہے اس لئے اس نے اس قوت کو جو نیچر میں پائی جاتی ہے اپنی قوت ارادہ کے مثل سمجھا تو اس کا ایسا سمجھنا جائز ہے جب اس نے ایسے معلومات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انہیں ایک ایسی قوت مختارے منسوب کرنا جو مادہ کے اندر اور باہر ہے بالکل جائز ہے یہی خدا کے خیال کی اصل ہے ۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں ، اور درختوں ، دریاؤں ، پہاڑوں ، بادلوں اور ہواؤں میں ہوں یا خواہ ایک علت اعلٰی ہو جو کائنات کا خالق اور قائم رکھنے والا ہے ۔

اس مسئلہ میں بنی نوع انسان کے عام اتفاق کو گزشتہ زمانہ کے الہام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغرٰی کبرٰی سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچی ہیں ۔ الہام انسان کی ذات اور اصول علت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ الہام ہر ذی عقل پر ہوتا ہے ۔

اب ہم انسان کی دوسری تمیز طبعی پر توجہ کرتے ہیں جو انسان کو منتہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے ۔

جمادات و نباتات سب میں قوت انتخاب پائی جاتی ہے ۔ ہر شئے دوسری اشیاء میں سے اسی سے ملتی یا اُسے جذب کرتی ہے جو اس کے لئے مفید ہے ۔ جمادات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے گرد

کی اشیاء میں سے وہی چیزیں اور اسی قدر اپنے میں لیتی ہیں جو ان میں
مل سکتی اور اُس کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ اور یہ کی کیمیاوی ترکیب
کو دیکھیے۔ ہر دوا دوسری سے گھل مل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا
حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیاء سے وہی اجزا اور وہی
قدر حصہ جذب کرتا ہے جو اس کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے۔ یہی حال
دیگر حیوانات اور انسان کا ہے۔ لیکن انسان میں دو حصے ہیں مادی اور
غیر مادی۔ کبھی تو وہ اُن چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادی خوشی
اور مادّی نشو ونما کے لئے مفید ہیں۔ اور کبھی وہ اشیاء جو قوائے حصہ غیر
مادّی کی نشو ونما اور مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ اس میں
یہ دو حصے پائے جاتے ہیں اس لئے اس کی قوت انتخاب ڈانواں ڈول
رہتی ہے کبھی تو وہ اُن چیزوں کی طرف جاتا ہے جو مادّی خوشی کو بڑھاتی
ہیں اور کبھی اُن اشیا کی طرف جو اس کی غیر مادی مسرت میں اضافہ کرتی ہیں
غرض انسان ان دو کششوں کے درمیان واقع ہے جدھر زیادہ زور ہوتا
ہے اُدھر ہی کھنچ جاتا ہے۔ ایک طرفہ مچیلیاں دو کشمکش آپس میں ہے۔
انسان میں یہ تخالف عجیب وغریب ہے۔ حیوانی زندگی کا مقصد
خاص اور محدود ہے۔ لہذا تمام تمیزات حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں
کوشش کرتی ہیں لیکن اس میں جو دوسری قوت ہے وہ اُسے بعض اوقات
اس دائرہ سے نکال کر ایک دوسرے عالم میں لے جاتی ہے جہاں اُس
پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے۔

جس طرح تمیزات طبعی مادی زندگی کی فلاح کے لئے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح اور ایک غیر مادی حصہ کی فلاح میں بذریعہ انتخاب مدد دیتا ہے۔ اور یہ انتخاب ایک تمیز کرتی ہے جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کے سامنے بہت سی اشیائیا احساسات آتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشیا انتخاب کی جاتی ہیں جنہیں تجربہ اور تمیز طبعی اعلیٰ خیال کرتی ہے تخیل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہیں۔ اور اس مجموعہ سے ایک منتہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے اور پھر انہیں اس طرف متوجہ کرکے ارادے کو اس کے حصول کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

دیگر حیوانات میں تخیل بہت ادنٰے درجہ میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیوانی خوشی یا خطرہ کو پیش کرتا ہے اور انہیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیر کرکے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے لیکن انسان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ بھی شہوانی زندگی تک محدود رہتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات کو پیش کرتا ہے لیکن تخیل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک حواس کی قائم مقام ہو سکتی ہے اور چاہے سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے اور اس کی مدد سے غیر مادی حصہ

اپنی سماعت اور اجازت کو بلاقید مکان وزمان ان غیر مادی صور تک پہنچا سکتا ہے جنہیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے اس پر زور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے۔ نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعیت کے سامنے اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے مشعل ہوتی ہے جس سے رستہ پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے تخیل امید پیدا کرتا ہے لیکن اسے سیر نہیں کرتا۔ یہ تخیق پر ابھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے۔ لیکن اپنی پرواز سے نیچے نہیں گرتا۔ اور دوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے لیکن چونکہ وہ کسی منتہا کا خیال نہیں کر سکتے لہذا اپنی حالت پر قائم ہیں۔

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور آگے بڑھتا ہے۔ واہمہ اس کے سامنے منتہائے کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا چلا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا منتہا وہی نہ ہو جو دوسرے انسان یا دوسری قوم کا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے۔ دوسرا نیلے کو تیسرا زرد کو۔ ہر ایک ایک جزو کی طرف مائل ہے۔ اور اس کمال کا ایک نمونہ دیکھتا ہے جو ان

تینوں کو ملا کر ایک ایسی خوبصورت شے پیدا کر سکتا ہے جو قوس و قزح کے حسن سے کم نہ ہو۔

منتہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے خیالِ علت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علتِ انتہائی کی راہ سجھائی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علتِ انتہائی میں وہ اپنے تمام ادراکات کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادر، علیم و بصیر اور کمال عدل و خیر و حسن سمجھتا ہے۔

کیا تخیل دھوکا ہی دھوکا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی حس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بری ہوتی۔ اسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک روح ہے جو نشو و نما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربے سے اسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلہ پر اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی منتہائے کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شاعر ہوتے نہ مصوّر ہوتے نہ مغنی۔

انسان کو فطرتاً دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے ہے اور محبت کا جذبات سے۔ عقل چاہتی ہے کہ سب میرے تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانے حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں

سے ہے۔ وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب درحقیقت ایک خیال کا اظہار ہے انسان ایک علتِ اعلیٰ کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوتِ انتخاب کی مدد سے وہ ایک منتہائے خیال کا تصور کرتا ہے۔ اور یہ منتہائے خیال اس کی محبت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے۔

جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا کچھ اور ہے۔

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں۔ وہ فلسفہ ہے اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں وہ اکثر توہمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناواجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں مضر ہیں ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں۔ ولی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہیئے اور عقلی پرواز کی اصلاح جذبات سے۔ علت العلل کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش۔ دوسرے کئی خداؤں کی پرستش۔ سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام معلومات کی علت ہے۔ اور آریہ اقوام نے ان قوتوں کو الوہیت کا درجہ دیا۔ جن کا ظہور نیچر میں ہوتا ہے بعض نے اس جھگڑے کو یار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی جھگڑوں میں

پڑ گئے۔

۵

مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اس کی فطرت میں ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا۔ اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جد و جہد قائم رہے گی اس کے محدود و حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے لیکن آخر فتح مذہب کی ہوگی۔ یہ یقین ہے کہ علم بدلتا رہیگا ایک قیاس ترک اور دوسرا اختیار کیا جائے گا۔ تحقیق میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا۔ ممکن ہے سائنس نیچر کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پرانے خیال کو بدل دے لیکن وہ عقیدہ جو اسٹ ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کریگا کیونکہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا۔ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت قفنس کی سی ہے۔ پیر فرتوت ہوکر وہ اپنے گھونسلے میں آگ لگاتا ہے۔ مگر انہیں شعلوں میں سے پھر زندگی پاتا ہے جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھا نئی نسلوں کے سپرد

لیا جو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور صفائی پیدا کریگا اسے اور اعلیٰ کرے گا اور آئندہ نسلوں کے حوالہ کر جائے گا۔ قرن در قرن اور صدی در صدی یہ کام یونہیں جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تخالف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم خدا کی معرفت پر منتہی ہو جائے گا۔

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدائے آفرینش سے اس میں ودیعت ہے یا نہیں ایک انگریز لڑکے ایک جاہل مسلمان ایک معمولی ہندو یا آفریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھئے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے وجوہات کو غور سے دیکھئے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو۔ مسٹر میکڈ انلڈ جو مدت تک افریقہ کے وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب "افریکینا" میں لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شئے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں اور موت کے بعد وہ روح اس جسم کو چھوڑ دیتی ہے" اس میں کچھ شک نہیں (جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے) کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اُسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت

یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی مرحلوں میں اس نے پتھروں۔ درختوں جانوروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکایا ہے لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پُر زور بہتے دریاؤں یا سر بفلک پہاڑوں کے سامنے جھکایا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو بھاگ جاتے چھپ جاتے لیکن بجائے اس کے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازلی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو مرنے سے ڈرتے رہتے۔ لیکن کیوں انہیں روح کا خیال پیدا ہوا؟ اور اس سے پھر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال اُن بچوں تک میں پایا گیا ہے جو الگ رکھے گئے جنہیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی بلا امداد غیرے صرف اپنے خیال اور اپنے تجربہ سے یہاں تک رسائی کی ہے اور اُن میں خدا کا خیال اور روح وجسم کا امتیاز پایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات انسان میں فطرتاً موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے

صحیح نہیں ہے کیونکہ مختلف مرحلے طے کر کے کسی شئے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شئے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول تمام ایجادات و اختراعات کو اگر بنظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انہیں وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں انسان کو ارتقا ملی ہیں۔ اور اسی طرح ایک دوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

۶

علمائے طبیعیات و بعض دیگر فلاسفۂ حال و قدیم کا دعوےٰ ہے کہ صرف استقرا ہی علم کی مستحکم بنیاد ہے۔ مگر استقرا کیا ہے؟ تجربہ کے ذریعہ سے نتائج تک پہنچنا لیکن ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چونکہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آئندہ بھی انہیں حالات میں وہی واقع ہوگا یا مثلاً یہ لاکھوں کروڑوں پدموں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم بھی مر جائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالمگیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ تجربہ سے! تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہوگا۔

ہم کیوں کسی عام یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمارا یقین کیوں ہے؟

اس لیئے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقش قدم پر چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی پائی جاتی ہے!

یہ ہم کس سے مانتے ہیں کہ اصولِ نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمیں کیوں یقین ہے؟

اس لیئے کہ نیچر میں اصول یکسانی پایا جاتا ہے!

اسی طرح استدلال کرتے جایئے اور پھر پھر کے وہی وجوہ آتی جائیں گی تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور شئے بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دار و مدار ہے۔ وہ شئے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیز فطری ہے۔ ہیوم کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس شئے کی مشابہت جو ہمارے تجربہ میں آچکی ہے اس شئے سے جو تجربہ میں نہیں آئی ہماری نیچر (طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے۔ اور وہ قانون اس خیال کے زور سے حاصل ہوا جبکہ تجربہ نے ابھی اُسے ثابت نہیں کیا تھا۔

لہذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ آخری بنیاد اس کی بھی تمیز فطری پر ہے جو تجربہ سے مقدم ہے۔

صرف ایک قوت ہے جو بلا واسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے وہ قوتِ ارادی ہے۔ باقی جتنی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت ہوتی ہیں۔

میری قوت ارادی دوسری قوتوں کے دریافت کرنے والی ہے ہر ایک استدلال کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے یقینی ہونے کا دار و مدار ہے وہ یہ ہے کہ عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں۔

مجھے اپنی ہستی کے متعلق کسی منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں خیال کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں اور کر رہا ہوں۔ یہ تمام امور معرفت طبعی سے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ "میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں" اس منطق سے باہر ہے۔ کیوں کہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں اور میرے ہونے کا علم مجھے اس وقت بھی ہے۔ میں ہوں اس لئے کہ میں ہوں یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کر رہا ہوں یا نہیں یا ارادہ کر رہا ہوں یا نہیں کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ

نہیں بلکہ جزو ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور خلاقی فطرت کے لیے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی اس قسم کے شکوک کرنے سے عقل کو بے دست و پا کرنا ہے اور یہی شکوک ہیں جو روح کے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی شئے غیر مادی نہیں ہمارا ولین اور یقینی علم وہ ہے جو حواس کی رپورٹ سے قبل ہے اور حواس کے تابع نہیں لیکن جب حواس کی رپورٹ وصول ہوتی ہے تو عقل اس کی خبر دیتی ہے۔ حواس اور عقل مل کر ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ مادئین کہیں کہ یہ عقل مادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا جبکہ یہی نہیں معلوم کہ مادہ کیا ہے؟

یہ یقینی امر ہے کہ میں ہوں اور جب میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر میں کیسے یہاں آیا؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب تھے اور ان سے پہلے اور اور ان سے پہلے اور اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میرا سبب نہیں تو میں بے سبب ہوں۔ مگر تمام نوع انسان ایسی ہی ہے۔ تمام ہستی تمام کائنات ایسی ہی ہے۔ یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے سابق اسباب کے بعد ظہور میں آئی جن میں قوت تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہے۔ میں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ میں ہوں، میں خیال کرتا ہوں۔ میں ارادہ کرتا ہوں

میں اپنے گرد اور دور ہیں بھی انھیں تین چیزوں کو پاتا ہوں لیکن ان میں سے کوئی یا سب مل کر بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہوسکتیں ہیں یقیناً غیر فانی ہوں۔ میں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہذا میرا سبب کوئی اور ہے۔ جو ان سب سے بالا ہے۔ سوا اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

ہم جو کارگاہ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہے کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ہم عقل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے۔ آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے۔ اپنی قوت ارادی سے ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں اور یہ تمام قوتیں ظہور رہیں اس قوت ارادی کا جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے۔

۷

عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شئے بدلتی ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لحظہ اور ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہو جاتا ہے

اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے، اور سمجھتا ہے۔ کہ میں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس عضو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ مادہ کے کون سے سالمہ (جزو دیمقراطیسی) میں مسلسل غور و فکر ہے۔ اس میں جو ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے یا اس میں جو آتا ہے؟ کیا آکسیجن یا ہیڈروجن کا سالمہ (جزو دیمقراطیسی معرفت طبعی (کانفس) حاصل کرتے ہی چل دیتا ہے اور کیا آنیوالا جزو دیمقراطیسی آتے ہی معرفت طبعی حاصل کرلیتا ہے؟ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہیے جس میں معرفت رہے اور جو غور و فکر کرتی، اور حس کا ان سالمات کی مسلسل آمد و رفت پر عمل ہے۔ اور ادراک حس کا آلہ ہے۔ اور جو غیر مادی ہے اور جو روح کہلاتی ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے حاصل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیل ہیئت ہے لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرّات میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر مادی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کر سکتے ہیں مگر ان اعصاب اور ریشوں سے معرفت طبعی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ مستقل شے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصوں کے مختلف کام ہیں جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں۔ لہذا اس معرفت طبعی کا یکساں حالت پر رہنا اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ اعصاب اور دماغی اعضا اور رگ کے تابع اور کارکن ہوں جو سب کا صدر نشین ہے

ورسیت حاوی ہے۔ علم فزیالوجی (علم کالسدسر) جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور دہریت کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس پر اگر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا۔

مشہور سائنس دان مسٹر پیاکٹر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر کے لئے بوجہ ضرب کے بیہوش ہو جاتا ہے اور اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی تو وہ ہوش میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شئے دہ روح کہاں تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مر گیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک آدمی بیہوش ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ زور سے لگے تو وہ مر جاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفت طبعی (کانشس) حاصل کرتا ہے تھوڑی سی ضرب سے وہ بیہوش ہو کر پھر ہوش میں آجاتا ہے زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام بگڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ فی الحال یہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر میں ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے سرتاج علمائے سائنس کہنا چاہئے اور جو عین اسی زمانہ میں جبکہ ڈارون اپنی مشہور آفاق کتاب ڈارجن آف سپی شیز لکھ رہا تھا۔ اپنی ذاتی تحقیقات سے انہیں نتائج پر پہنچا جو ڈارون نے قائم کئے تھے اور جب اس نے اپنا رسالہ

ڈارون کے پاس رایل سوسائٹی میں پڑھنے کے لئے بھیجا تو ڈارون ڈھنگ رہ گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "ہمیں کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ اور خصوصًا وہ علم جسے ہم روحانی کہتے ہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ جب کبھی اہل سائنس یا کسی زمانہ کے عام معلمین نے ایسے واقعات سے جو اوسط درجہ کے ایماندار اور ذہین محققین نے خود دیکھے اور بیان کئے ہیں محض اس وجہ سے انکار کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانون قدرت کے خلاف ہیں تو یہ منکریں ہمیشہ غلطی پر ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس فاضل عصر نے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کیں اور بعد کامل غور اور چھان بین کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بے شک روحانی قوت موجود ہے اور جو مظاہر روحانی طرح طرح سے ظہور میں آتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔ اور نہ صرف اس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر نوبل پرائز جان فوربس اور ڈاکٹر کار پنٹر اور دیگر علما نے بعد تحقیق کے اس کی اصلیت کو تسلیم کیا فاضل موصوف کا خیال ہے کہ وہ بڑے لوگ جنہوں نے اس کا انکار کیا غلطی پر تھے اور اگرچہ اکثر علمائے سائنس ان شہادتوں کی پروا نہیں کرتے اور ہنسی اڑاتے ہیں لیکن اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اس کشش کا بھی مفصل حال لکھا ہے جو انسانی

کی تحقیق کے لئے بیٹھا تھا اور جسے بالآخر تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوت بے شک ایک ایسی قوت ہے جو مادہ سے الگ اور بالا ہے۔ اس کمیشن کے ممبر تمام مشہور سائنس داں تھے۔

۸

انسان جو اپنے تئیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے ہی لئے ہے جس نے اپنی بساط سے زیادہ قدم بڑھا لیا ہے اور اسرار عالم کے دریافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اگر اپنی آس پاس کی اشیاء پر غور سے نظر ڈالے گا تو ہر چیز کی اور پراسرار معلوم ہوگی اور ایک ذرے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی بےخبر پائے گا جیسے اس کائنات کی حقیقت سے۔ جب ہم اس کرہ پر نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع نظر آتا ہے اور اس قدر وسیع کہ باوجود اس ترقی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر حاوی نہیں ہوئے۔ لیکن نظام شمسی کے مقابلہ میں یہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے اکثر نظام موجود ہیں اور یہ عالم سیارگاں کے مقابلہ میں ایک نقطہ کے برابر ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسی طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین کی نشو و نما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہے اس وقت سے جو ایک درخت کے بڑھنے اور پھلنے

میں صرف ہوا لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظام شمسی کے زمانہ نشو نما سے کیا جائے
تو بہت ہی کم ہے اور بمقابلہ عالم سیارگان ایک لحظہ کے برابر ہے اور ابد الآباد
کے مقابلہ میں ہیچ۔ زمین کی ساخت کو دیکھکر بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں
جن سے اُس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صحیح رائے قائم ہوسکتی ہے۔ یہ
ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ اور مختلف زمینوں کے سرد
ہونے کے متعلق جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہے اُس سے اندازہ ہوسکتا ہے
کہ اس آتشیں مزاج کرہ کے ٹھنڈا کرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہونگے
جب نظام شمسی کے ایک بہت چھوٹے سے کرہ کی حالت درست ہونے میں
اس قدر عرصہ دراز لگا تو خیال کرنا چاہیے کہ اُن کروں کے لیئے جو اس سے
سینکڑوں درجے بڑے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہوا ہوگا۔ جب انسان یہ سوچتا
ہے کہ سورج سے بھی بڑے بڑے سیارے موجود ہیں اور نظام شمسی جیسے دوسرے
نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے اور
اور ان کے بعد اور اور یہ سلسلہ نامتناہی یوں ہی چلا جاتا ہے تو خلائے بسیط کا
خیال حد وہم سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح جب زمانہ کا خیال کرتا ہے
کہ ایک ادنیٰ اور حقیر کرہ کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس
لگ گئے ہیں تو اس کل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا
تو انسان مارے حیرت کے حواس باختہ ہوجاتا ہے اور پھر جب وہ یہ دیکھتا

ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانہ کس ترتیب و قاعدہ سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اُس حکیم مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و وہم میں نہیں سما سکتی جو اس کارخانہ کا چلانے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک سائنس دان یہ کہے کہ یہ سب وہم ہے کائنات میں سوائے مادہ اور سالمات کی حرکت اور کشمکش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسمانی خلا میں مادہ ہی مادہ منتشر ہے جن کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں سے گیس نکلتی ہے جو "نیبولا" (ضبابیہ) کی شکل پکڑ لیتی ہے۔ یہ ضبابیہ نظام شمسی کے احاطہ کشش کے اندر اگر سورج کی مدور راہ میں داخل ہو جاتے ہیں اگر بعض ان میں سے ہمارے کرہ کے پاس سے گزرتے اور اس میں آ داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ان سے شہاب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں یہی اجسام بے انتہا اصلی سیارے اور ٹھوس ہیں۔ ان کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوتی ہے جو منجمد ہو کر بڑے بڑے ثوابت کو بناتے ہیں۔ ان شہابوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں ہمیں اس مادہ کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے عالم اسیلا گان میں منتشر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ

یہہ بے انتہا اور کثیر شہابی مادہ جس کی وسعت خیال سے باہر ہے کہاں سے آیا؟ اس کی حالت ماسبق کیا تھی؟ یہہ مادہ جو ابتدا میں بالکل سادہ اور اجزا ئے لایتجزے کی حالت میں تھا۔ اس صورت میں کب سے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ اگر ہماری رسائی ابتدائی اجزا کے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ پھر ہمیں اُن قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہوگا جن کے زور سے یہ اجزائے لایتجزے مادے اور عوالم کی صورت میں ہویدا ہوے اس سادہ سے سادہ قوت میں کہاں سے اتصال پیدا ہوا یہ کیمیائی قوتیں کدھر سے آئیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ اسرار قوت ثقل کہاں سے آئی جو غیر محدود غیر متبدل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہے؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لاینحل مسائل ایتھر ہیں۔ ایتھر کیا ہے اور مادہ سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟ وہ قوتیں کہاں سے آئیں جو ایتھر سے کپکپاہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت۔ روشنی الکٹرسٹی کی مختلف صورتوں میں تمام تبدیل ہئیت۔ حرکات سالمات اور مادہ کی اُن بے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشو و نما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً کبھی نہ ہو۔

قدیم سے قدیم نظریۂ مادہ سے لیکر جدید سے جدید نظریہ پر غور کرو۔ ہر ایک میں بھی لاینحل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی

اس کائنات کی علت العلل کو قریب نہیں پہنچاتا۔ اور زیادہ سے زیادہ بقول ہربرٹ سپنسر "تمام مظاہر میں ایک نامعلوم اور ناقابل دریافت قوت کے ظہور کا ادراک" ہوتا ہے یا جیسا کہ اسی علامۂ دہر نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا۔ "ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہے اور پھر اس سے پرے جہاں وہم و خیال کے پر جلتے ہیں؟ جب اس معلوم کا اس نامعلوم اور غیر محقق وسعت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو خیال کی یہ ساری تحقیق ہیچ و بے حقیقت ہو جاتی ہے یہ خیال اور پھر اس خلائے بسیط کا خیال جس کے مقابلہ میں ہمارے بے انتہا نظامات کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کچھ عرصہ سے یہ طبعی ادراک کہ یہ غیر محدود خلا بغیر کسی اصل اور سبب کے موجود ہے اور موجود رہے گا۔ میرے دل میں ایک ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے سامنے میں سہما جاتا ہوں۔"

۹

مادیین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہر عالم کی گتھی سلجھانے کے لیئے کافی ہے۔ روحانی یا الٰہی اثر سب فسانہ ہے دیما قریطس سے لے کر اس وقت تک اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی قوی کر دیا ہے

ہر زمانہ میں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاسفہ اور علمائے علوم طبیعیات کو اس کا
شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قائم کریں کہ جس سے تمام اشیاء اور
مظاہر کی کنہ دریافت ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت
کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیاوی تحلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ
خواہ کسی صورت میں ہو اور کیسی ہی تبدیلی اس میں کیوں نہ واقع ہو جائے
نہ وہ فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح علم طبیعیات
کی رو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوت خواہ کسی شکل و صورت میں ہو
اور کیسے ہی مختلف حالات اختیار کر لے وہ نہ تو فنا ہو سکتی ہے اور
نہ پیدا ہو سکتی ہے پھر علم کیمیا کی رو سے ایسے مرکبات ترتیب دئے
گئے جو اب تک بغیر قوت حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور
آخر بڑھتے بڑھتے اول مادہ کے متعلق نظریہ اجزائے دیمقراطیسی قائم
ہوا اور سب سے آخر نظریہ اجزائے لایتجزیٰ۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان
دہریت اور مادیت کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام
مظاہر عالم کا باعث ہے۔ اور کیا اس کے ساتھ کوئی اور شئے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے۔
اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب ہم کسی مظہر کو دیکھتے ہیں تو مادہ کا اس میں کہاں تک دخل ہوتا ہے
اور ان کا باہمی کیا تعلق ہے؟ دوسرے اگر کوئی مظہر ایسا ہے جو مادے سے بالکل
آزاد ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مادہ اس کا باعث نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی امر تحقیق

طلب ہے کہ اگر ہم کسی منظہر کو بغیر مادے کے نہیں پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس کا کافی اور وافی باعث ہے؟ فرض کرو کوئی منظہر معلوم ہے۔ اس کے چند اسباب قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے کافی باعث ہیں یا نہیں۔ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر یہ نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شئے کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی ہے اور جو اب تک سبب نامعلوم تھا۔ مثلاً جب سیارہ یورینس دریافت ہوا تو بعض مہندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے اور جو دائرہ وہ بناتا ہے اس کے لئے صرف سورج کی اور بعض چھوٹے سیاروں کی کشش جو یورینس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سورج کے درمیان واقع ہیں اس گردش اور دائرہ کی کافی باعث نہیں۔ اگر صرف یہی کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔ ان مہندسوں نے محقق ریاضی اور ہندسہ کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہو نہ ہو فلاں مقام پر کوئی اور ستارہ یورینس سے پرے واقع ہے جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہے چنانچہ بعد میں اس مقام پر دوربین کے ذریعہ سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب نیپچون کہتے ہیں۔ اسی طور پر ہم اس عالم کو لیتے ہیں اور مادہ کو جہاں تک اس کا عمل اور صفات و اثرات ہیں پوری پوری آزادی دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ

اس کا کافی باعث ہے یا کوئی اور سے بھی ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے اور مادہ سے خارج ہے؟ پس اگر کوئی شئے ہے تو یہہ نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہے اور اس کے بعد ہم مادہ کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذات خود قائم اور کافی ہے۔

مظاہر کائنات جن پر ہم بحث کریں گے ان کی تقسیم سرسری طور سے یہہ ہوگی۔

۱۔ قوت۔ جو حرکت اتصال اجزائے لایتجزٰی اور کشش کیمیاوی سے ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ حیات۔ حیوانی یا نباتی۔

۳۔ قوت۔ مدرکہ۔

۴۔ اوراک طبعی ذکانش

۵۔ جذبات اخلاقی مثلاً محبت رحم وغیرہ۔

ہماری سب سے اول تحقیق یہہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے مظہر یا مظاہر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادہ سے اس قدر الگ ہوں کہ مادہ ان کا باعث نہو یا باعث جزوی ہو؟ قوت اور حیات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انھیں سوائے مادہ کے تعلق کے کسی اور طرح نہیں جانتے اب رہی قوت مدرکہ اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مادہ سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے اور بعض کا مذہب یہہ ہے کہ نظام اعصابی قوت مدرکہ کا آلہ ہے اور وہ اس طور

کہ تمام افعال ادراکی کا تعلق اس نظام کی ساخت اجزائے لایتجزیٰ کی حرکت سے ہے اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ قوت بلا شرکت مادہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔

مگر اس میں شک نہیں کہ ادراک طبیعی (کانشس نس) یعنے خالص قوت مدرکہ کا قوت مدرکہ پر غور کرنے کا فعل مادہ سے بالکل بے تعلق ہے۔ اور بلاشبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً محبت یا رحم بھی مادی تعلقات سے بری معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مادہ سے کچھ واسطہ نہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادراک طبیعی (کانشس نس) کو ان دیگر ادراکی افعال سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلق دماغ کے تغیرات اجزائے لایتجزیٰ سے ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور دماغ پر کس قدر اثر پڑتا ہے مثلاً دفعتاً سر میں درد ہونا۔ چہرہ کا سرخ ہو جانا۔ نبض اور سانس کا تیز ہو چلنا۔ تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم مادہ کی شرکت سے بری نہیں ہو سکتے اور اسی اعتراف سے مادئین کی بن آتی ہے۔ کیونکہ بظاہر عالم کہیں بلا تعلق مادہ نہیں پائے جاتے اس کا لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور رہتا ہے لیکن اس سے

یہ ضرور نہیں کہ صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و وافی ہے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو کون سی شئی ہے جو اسکا تکملہ کرتی ہے۔
شاید یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہرحال یہ باور کرنا چاہیئے کہ مادہ کے وجود کی شہادت سوائے قوت مدرکہ کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی مادہ کا وجود خود قوت مدرکہ کا نتیجہ ہے جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس کا تعین کرنا چاہیئے اور قوت مدرکہ کے نتائج کا اعتبار نہ کرنا چاہیئے انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ مادہ حس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اسکا تعلق قوت مدرکہ سے ہے جو حواس کے واقعات سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلی نے نہایت خوبی کیساتھ ثابت کیا ہے۔ میں یہاں اسکے فلسفہ کو با التفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسی قدر اشارہ پر کفایت کرتا ہوں۔
مادہ کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے ابتک تسلیم کی گئی ہیں۔ ٹھوس جیسے برف۔ سیال جیسے پانی اور ہوائی جیسے آکسیجن یا ہائیڈروجن۔ بعض اہل سائنس نے ایک اور حالت بھی اضافہ کی ہے جو کہ ان سب سے بھی زیادہ لطیف ہے اور وہ شعاعی کہلاتی ہے۔
مادہ کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ وہ اجزائے لایتجزیٰ سے بنا ہے۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جنمیں مادہ کے تمام خواص موجود ہیں اور انکے باہمی تعلق کو قوت اجزائے لایتجزیٰ کہتے ہیں۔ اور ہر چند دیمقراطیس نے کسی کیمیاوی عنصر کے ایک یا ایک سے زیادہ اجزائے لایتجزیٰ

سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے اجزائے دیمقراطیسی میں جو تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیاوی اتصال کے قوانین کی رو سے عمل میں آتا ہے۔

یہ اجزائے لایتجزائے اور اجزائے دیمقراطیسی کیا ہیں؟ انسان کی آنکھ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طرح استدلال اور قیاس سے حاصل ہوا ہے۔ جیسے روح کا ہے۔ جزو لایتجزائے میں چند خواص وصفات مانی گئی ہیں۔

اول قوت اتصال یا کشش اجزائے لایتجزائے۔ یہ وہ قوت ہے جو ہر شئے کو جو جزو لایتجزائے سے بڑی ہے مجتمع رکھتی ہے۔ یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ۔ حالت سیّال میں کم اور حالت دخانی میں بالکل نہیں ہوتی۔

دوم۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزو لایتجزائے ایک انتعاشی حرکت سے بےچین رہتا ہے اور اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادہ کی ٹھوس، سیّال، دخانی اور شعاعی حالتوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں

سوم۔ ہر جزو لایتجزٰی میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکت اندرونی بھی ہوتی ہے۔ بیرونی حرکت کل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصہ جزو لایتجزٰی کی دوسرے حصہ پر۔ مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں ہوتی ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر حصہ الگ ہو جاتے اس حرکت میں کپکپاہٹ یا بیجانی

چہارم ہر شئے کے اجزای لایتجزی ایک ہی جسامت کے خیال کئے گئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس کی دو قسمیں پیدا کرنا جو مختلف جسامت کے اجزائے لایتجزائے سے بنی ہوں ناممکن ہے۔

اس سے مفصلہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:۔

۱۔ ایک شئے کے اجزائے لایتجزی بالکل ایک ہی سے ہوتے ہیں مگر دوسری اشیا کے اجزا سے مختلف ہوتے ہیں۔

۲۔ مختلف اشیاء کے اجزائے لایتجزی جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور ان میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی۔

۳۔ ایک شئے کے اجزائے لایتجزائے اپنی اندرونی حرکت میں توافق رکھتے ہیں اور اسی لئے اس روشنی میں بھی جو ان سے نکلتی ہے۔

۴۔ کسی جزو لایتجزائے میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی

مادہ کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ طبعیات کی کسی کتاب سے ۰ ۰ ۰ ۰یف کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن نظریہ اجزائے لایتجزائے کا جو مادہ کے متعلق جدید نظریہ ہے) صحیح بیان مختصر طور پر کر دیا گیا ہے اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں سے ایک جزو لایتجزائے لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو مادہ کا ہے جس میں تمام صفات و خواص مادہ کے موجود ہیں۔ یا تو یہہ سادہ یعنی مفرد ہے۔ جیسے آکسیجن کا جزو لایتجزائے یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے ہیدرا...

ہائیڈروجن کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس صورت میں خود دیمقراطیسی ایک مرکب شئے ہے کیونکہ از روئے علم کیمیا اس زمین پر تخمیناً ستر اشیا ایسی ہیں جو مفرد یا سادہ حالت میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دوسرے سے ترکیب پانے کی دبشرطیکہ وہ ترکیب پا سکے) مختلف مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے ساتھ ملاتی ہے اور بعض کو رد کر دیتی ہے۔ غرض ہر ایک دوسرے سے بہ حیہ کیمیاوی کشش واندفاع الگ اور مختلف ہے۔ ہم نے اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دیمقراطیسی دونوں کو دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسالا نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ستر اشیاء ایسی ہیں جو اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے بیشمار ایسا مواد تیار ہو سکتا ہے جو اجزائے لاتیجزے کے گودام کے لائق ہے۔ جز و لاتیجزے کیمیاوی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبعیات کی رو سے بھی مرکب ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی ہے یعنے اسکے ایک حصہ کی حرکت دوسرے حصہ پر جس سے کہ آس پاس کے ایتھر میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لاتیجزے میں مختلف ہوتی ہے۔ لہذا اجزائے لاتیجزے اصل مسالا نہیں ہیں بلکہ بذات خود ایک کامل اور عجیب شئے بنائی گئی ہے۔ جسے آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے۔

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لاتیجزے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف سادہ
ور مفرد عناصر جن سے اجزائے لاتیجزے بنے ہیں ۔ لیکن کہیں اصل مسالا
و تمام اشیار کی اصل ہے نہیں ملا ۔ مگر باوجود اسکے ہر طرف ہم انتظام و ترتیب
عقل و حکمت کی بین شہادتیں دیکھتے ہیں بلکہ ہر ہر قدم پر وہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں
یہ ہے وہ مادہ جسے عالم علوم طبعیات و کیمیا تمام مظاہر کا باعث بتاتا ہے ۔
س کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبیعی اجزائے لاتیجزے سے وہ صفات منسوب کرتا ہے
جن کا موجود ہونا تو وہ پاتا ہے لیکن اجزائے لاتیجزے میں نہیں کیونکہ اس نے
سے کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لیے
اُس کا خیال ہے کہ یہ صفات اجزائے لاتیجزے ہی سے پیدا ہوئی ہیں ۔
سی طرح ایک عالم علم کیمیا اجزائے دمیقراطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے
جن کا ہونا تو اسے معلوم ہے لیکن اجزائے دمیقراطیسی میں نہیں ۔ کیونکہ اس نے کبھی ایک
جزو دمیقراطیسی کا تجربہ نہیں کیا بلکہ انھیں بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ۔ وہ ہائیڈروجن
کے جزو دمیقراطیسی میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت دیکھتا ہے
جسے وہ درحقیقت ہائیڈروجن کے بڑے بڑے مجموعوں میں پاتا ہے ۔ طبعیات و
کیمیا کے واقعات اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمیقراطیسی میں ادا ہوتے ہیں ۔
اور اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمیقراطیسی از روئے تعریف کافی سبب ہیں
اُن نتائج کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کیے گئے تھے ۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں لیکن وہ اصطلاحات اجزائے لایتجزی اور اجزائے دیمقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ اس نظریہ پہ کچھ اثر نہیں ڈال سکتے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی اُن واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہے کچھ روشنی ڈالتا ہے یا نہیں۔

کیا نظریہ اجزائے لایتجزی اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کتلۃ الاولے (پروٹوپلیزم) سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ بغیر اس کے وہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ اور اگرچہ کتلۃ الاولے کے کیمیاوی اجزاء بخوبی معلوم ہیں اور انسان انہیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے لیکن نہ تو کتلۃ الاولے پیدا کر سکتا ہے اور نہ حیات جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم اُن صفات کو لیں جو از روئے جدید سائنس اجزائے لایتجزی میں پائی جاتی ہیں اور اُن کو ہزار ملا یا ہزار الٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کشش اجزائے لایتجزی کی حرکت دامی، اور اُن اجزا کی کیمیاتی ہوئی حرکت یہ سب مل کر بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور جو خیال کی اصل بنا اور ساخت کائنات کی جزو اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجربہ کیا ہے یہ امر بالتحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہو سکتی۔

جب حیات صرف اجزای لایتجزی یا مردہ مادہ سے پیدا نہیں ہوسکتی تو پھر قوت مدرکہ تو کہاں ہوسکتی ہے۔ اگرچہ اکثر اہل سائنس کا یہہ قیاس ہے کہ قوت مدرکہ مادہ کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے جب قوت مدرکہ کا یہ حال ہے تو کانشنس معرفت طبعی تو اس سے بھی کہیں پرے ہے کیونکہ معرفت طبعی کے معنے میں قوتِ مدرکہ کا اپنے باطن پر غور کرنا اور یہ اجزائے دیمقراطیسی کے ترتیب دینے ملانے اور الٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایثار و محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں۔

ممکن ہے کہ مادیین میں سے کوئی یہ کہے کہ یہہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پذیر ہے۔ اور جوں جوں اسے ترقی ہوگی مادہ کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کرسکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ اگر مادہ کی تعریف میں وسعت ہو جائے گی تو اس کے ساتھ ہی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوت مدرکہ اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہوجائے گی جس قدر اجزائے لایتجزے کی تحقیق میں زیادہ وقت کے اندر جاؤ گے اسی قدر اجزائے لایتجزے کے پیدا کرنے کے لئے قوت مدرکہ کی زیادہ ضرورت معلوم ہوگی۔ اگر حیات اجزائے لایتجزے کا نتیجہ ہیں تو اجزائے لایتجزے کے وجود کے لئے بے شک قوت مدرکہ کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ غرض اس مشکل کو جس طرح

چاہو حل کرنیکی کوشش کرو ایک چیز ایسی ماننی پڑیگی جو مادہ نہیں ہے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ ہم اس چیز کو مادہ سے الگ نہیں پاتے۔ کیونکہ جس عالم کا ہمیں تجربہ ہے اس میں یہ سنگت ضروری ہے۔ لیکن یہ تجربہ محض یکطرفہ ہے۔ کائنات میں اور خود ہم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ہیں کہ یہ شئے جو مادہ نہیں ہے عقل اور قوت مدرکہ سے تعلق رکھتی ہے اور اُسے اپنے ساتھی مادہ پر فضیلت ہے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روح جسم کی قید سے الگ ہوکر بھی قائم رہ سکتی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ مادہ کا نظریہ اجزائے لایتجزیٰ اور اجزائے دیمقراطیسی کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے وہ خود ایک ایسی خالق اور منتظم قوت مدرکہ کی شہادت دیتا ہے جسکی ہستی اس سے قبل ہے اور اس سے افضل ہے۔

۱۰

نظام کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ہم یہاں تک پہنچے کہ کوئی ایسی شئے ضرور ہے کہ مادہ سے بالا ہے جسے ہم روح کہتے ہیں اور کوئی ایسی قوت ایسی اور ہے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اصل یہیں سے پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بیخبر ہے اور اس بیخبری میں اس پر حملے کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے۔ پچھلی صدی میں

جبکہ سائنس کی ترقی معراج کمال پر نظر آتی تھی۔ اکثر مذہب پر حملے کرنا۔ اس کی ہنسی اڑانا اور اس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا اہل سائنس و فلاسفہ وحکما اور اکثر بڑے بڑے مصنفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور یہ دستور رفتہ رفتہ فیشن ہو گیا اور یہہ سمجھا جاتا تھا ور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بوڑھیوں کی کہانی اور بچوں کا کھیل ہے۔ یا ایک بچا ہے جس کا ڈرامہ زمانۂ طفلی سے بیٹھا ہوا ہے۔ یا بھوت پریت کا سایہ ہے جو اب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پر زور اور بیجا حملوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی ہوگی وہ ان پیچیدہ مسائل اور گتھیوں کو سلجھائے گا جو اب تک لاینحل سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن خود اس کے زور نے اسے کمزور کر دیا۔ اور وہ نشہ جس سے اہل سائنس مخمور تھے اترنے لگا اور باوجود حیرت انگیز ترقی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا انگرسال اور بریڈلا جیسے اعدائے مذہب بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور ان کی بھوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقہ ایک نامنگ دلا اور یہ اکے بانی پروفیسر ہکسلے کے پرزور دلائل میں اب وہ قوت نہیں رہی اور ان کے پیرو بھی اب دبیے پڑ چکے ہیں۔ وہ نظام جو ابتدا سے انسان کے ساتھ ہے جوں جوں انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس لیے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم الشان

انقلابات پیدا کئے اور اس کی ترقی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدن کے ہر پہلو اور ہر روش میں نظر آتا ہے اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہل سائنس نے اس کی طرف سے نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس مہتم بالشان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتدا سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے انہوں نے سائنس کے بھرتے میں اس سے منہ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھکر سمجھ لیا کہ دوسری طرف کچھ نہیں حالانکہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقی پر نظر ڈالی جائے تو منظر زیادہ وسیع اور کامل ہو جاتا۔ لیکن یہ اہل سائنس کی کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتفاق سے نہیں آتی۔ تو کیا مذہب جنہیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل و تصرف اور قوت ہے مہمل اور لغو ہیں؟ کیا انہیں انسانی ترقی و تہذیب و تمدن میں کچھ بھی دخل نہیں؟ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہل سائنس اور فلاسفہ کو غور کرنا چاہئے تھا مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ نے انہیں کبھی اس طرف

متوجہ نہ کیا۔ سائنس کی نظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھری رہی اور ابتدا سے جو اس نے مذہب کی مخالفت میں کمر باندھی تو اب تک وہی مخالفت چلی آتی ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ کیا کہ آخر مخالفت کیوں ہے بلکہ بجائے تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے اس جلتی آگ میں اور تیل ڈالا۔

ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے اور ایک زینہ سے دوسرے زینہ پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس ترقی پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب و غریب اور عظیم الشان حقیقت نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھجک کے رہ جاتا ہے۔ سب سے اول اسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا۔ اور ان پر غالب آکر وہ آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتا رہا۔ مگر اس رستہ میں اسے بڑی بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں۔ بڑی بڑی ناکامیوں کا سامنا ہوا۔ اور اب تک ترقی کے میدان میں اُسے وہی ہفتخوان طے کرنے پڑتے ہیں اور اسے اپنے بنی نوع کے ساتھ ہر دفعہ اور ہر لحظہ وہی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ اب تک لڑتا آیا ہے یہی لڑائی مقابلہ مناقشہ اور جد و جہد ترقی اور تہذیب و تمدن کی جان ہے ہر شے جس میں حیات ہے اور تمام امور اور خیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جد و جہد پائی جاتی ہے۔ تمام افعال و حرکات میں تمام

ارادوں اور نیتوں میں۔ اندرونی اور بیرونی زندگی میں ہماری زندگی کے اعلیٰ اور نازک موقعوں میں ہمارا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں۔ ہماری ساری طاقت اور دانشمندی اسی میں صرف ہوتی ہے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان میں دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اور اس لئے اس کا ارتقا دوسرے حیوانات کے ارتقا سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے اور اس کی ترقی میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ یہ عقل انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہ کہ اس کا ذاتی فائدہ سب سے ضروری اور سب سے مقدم ہے دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے۔ ہمارا سارا فائدہ اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہئے دوسری خصوصیت انسان میں مدنیت کی ہے یعنی وہ قابلیت جس کے اثر سے وہ اپنے ہی نوع سے مل جل کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ عقل کا کام تفرقہ۔ انفعال۔ اور فنا ہے۔ تمدن کی ترقی کے لئے ایثار اور سوسائٹی کے فائدہ کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں کے لئے اور خصوصاً ان نسلوں کے لئے جو اب تک وجود میں نہیں آئیں۔ قربانی کرتا ہے۔ یہ ایثار اور قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا سکتی اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے

بالا ہے اور یہہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے انسانی تمدن و ترقی مذہب پر مبنی ہے۔ ارتقا کا مقصد جد و جہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالا ہے۔ عقل اس کی مخالف ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جد و جہد کرے۔ ورنہ اگر وہ غالب آ جائیگی تو شیرازہ نظام تمدن بکھر جائے گا۔ ارتقائے عالم میں افراد سوسائٹی کے لئے قربانی کر دیے جاتے ہیں۔ عقل افراد کو اپنے فوائد کے لئے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے۔ نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ اُن لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانہ میں آئیں گے اور ابھی وجود میں نہیں آئے۔ حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے۔ غرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ایک وہ جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے اور دوسرا رجحان عقلی ہے جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئے تامل اور عذر ہے۔ لیکن ترقی وہی قوم کر سکتی ہے جس میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہے مگر اس اتباع کے لئے عقل یا سائنس کی کتاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر تا پائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف

ایک فرض پر زیادہ زور دیتی ہے جس کے سامنے باقی تمام خیالات ہیچ ہیں۔ اس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتی الوسع ان سے فائدہ اٹھایا جائے انسان تکلیف سے بچے، راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام سے بسر ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے اور شہرت اور قوت حاصل کرتا ہے اور طرح طرح کے ایسے کام کرتا ہے جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب ہو۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی ترقی رک جائے اس لئے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اُس کے تابع رہی۔ عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود ہے۔ اس کی نظر تنگ ہے۔ اور اس لئے ضرورت ہے ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے بالکل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور بخیر اور نیک چلن ہوتے ہیں لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ انسانی تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک گروہ نسل کا کام نہیں ہے قرنوں اور نسلوں کی جد و جہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل

نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلہ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست
بات چیت۔ طرز خیال۔ غرض کل حرکات و افعال اسی سانچے میں ڈھلے ہیں
اور اسی سوسائٹی سے ارثاً تعلیماً صحبتہً ملے وہ ہزار زبان سے انکار کیا
کرے مگر جو روش و رجحان طبیعت اس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زائل
نہیں کر سکتا یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ مجبور ہے اور
بات بات میں اسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس سے وہ انکار کرتا
اور جس کی وہ تضحیک کرتا ہے۔

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے اور بڑے بڑے
اہل الرائے کی رائے ہے کہ باوجود زمانہ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی
تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط افلاطون و ارسطو و فیڈس
جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا
نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہ تھا۔ یہ اس لئے کہ اس ترقی میں
عقل غالب آ گئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابع عقل کر دیئے گئے تھے
اسی بد اخلاقی و بد مذہبی نے روما کو تباہ و برباد کیا۔ لیکن یہودی اور ہندو
باوجودیکہ وہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں اور ان
میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے
سے حیرت و عبرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے اُن اقوام کے لئے جو
دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں۔

انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک حالت پر قائم نہیں

رہتا ایک چیز کے حاصل ہو نے پر دوسری اور دوسری سے تیسری کی طرف لپکتا ہے جب بھوک لگی تو کھانے کی تلاش ہوئی رفتہ رفتہ جب روٹی پیٹ بھر ملنے لگی تو بھوک تو ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقہ پر آٹھیرا۔ اور اسی چاٹ میں اس نے دو ہزاروں نزاکتیں پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لئے تھا اُسے اس نے وجہ زیبائش اور آرائش بنا لیا۔ وہ حقیر جھونپڑا جو سر چھپانے کے لئے بنایا تھا ایک شاندار محل بن گیا ہے۔ جس میں تمام سامان آرائش وحسن جمع ہیں۔ اسی طرح اس نے دولت حکومت قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا مدعا حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس اور بڑھتی گئی اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوتی گئی۔ اور ہر شئے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا ہوتی گئیں اور وہ ان میں ایسا محو ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اصل یہ ہے کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے اور انسانی تنزل بھی باطن ہی کی طرف ہوتا ہے جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں وہ اسی کو اصل ترقی سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ درجۂ اسفل میں رہتے ہیں اور کبھی درجۂ اعلیٰ کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی اور فانی ہے اور اس کے ساتھ اس کی ساری خواہشیں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی ہے جسم کے چھوڑنے کے بعد روح رہ جائے گی اور وہ ہمیشہ رہے گی جس نے اپنی نفسانیت اور خود غرضی کو دبا کر ایثار کو ترجیح

نہیں دی جس نے اس ہدایت کے نور سے جو مذہب کے ذریعہ سے ہوتی ہے اپنے آپ کو منور نہیں کیا اور اپنے باطن اور روح کی صفائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی روح عالم ارواح میں بھی اونٹے حالت میں رہے گی۔ ڈاروِن کا اصول ارتقا صرف جسم اور اس کے علائق تک ہے۔ جب جسم کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے اصول ماننے والوں کو اور ذرا دوسری طرف بھی توجہ کرنی چاہئے جو اصل ترقی ہے اور جس کا سلسلہ ابدالآباد تک رہنے والا ہے۔ جسم کے چھوٹنے کے بعد روح جس حالت میں یہاں تھی اُسی حالت میں عالم ارواح میں پہنچتی ہے۔ اگر وہ یہاں ادنےٰ حالت میں تھی تو وہ وہاں ادنےٰ حالت میں رہ کر پھر ترقی کرے گی اور یہاں کی جسمانی خواہشات غالباً اس کی تکلیف کا باعث ہوں گی۔ اگر اس نے یہاں ترقی کی ہے تو ترقی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور وہاں سے ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ دوسرے عالم ارواح میں جائے گی اور اسی طرح ترقی کر کر کے اس سے بھی اعلیٰ عوالم میں پہنچے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ جس طرح سیاروں کے نظام لاتعداد و لاتحصےٰ ہیں اسی طرح نظامات روح بھی بیحد و بیشمار ہیں۔ یہ ہے اصل اور صحیح اصول ارتقا جس کا سلسلہ لامتناہی ہے اور لازوال ہے۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ ادنےٰ خیالات کو چھوڑ کر درجۂ اسفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرے۔ جس کی ہدایت ہمیں مذہب کرتا ہے۔

غرض سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ مذہب کرتا ہے۔ کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے۔ لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے۔ اور وہ مادی اور غیر مادی دونوں مملکتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دور دور تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں۔ مذہب نہ صرف اُن فرائض کو ادا کرتا ہے جو متعلق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں۔ بلکہ وہ اُن فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو اُن لوگوں سے متعلق ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے نہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے۔ سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقبیٰ کا انکار کرے کیونکہ وہ کوتہ نظر ہے۔ لیکن اس کے انکار سے کسی شئے کی ہستی زائل نہیں ہو سکتی۔ اہل سائنس اپنے بھورے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور چند قانون قدرت جو انہیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ نا ممکن ہے یہ خلاف قانون قدرت ہے۔ گویا یہ کائنات کے تمام قوانین قدرت پر حاوی

ہیں جو ذرا ہوشیار ہیں۔ انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے
ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں
لیکن یہ جواب خود ان "سائنٹفک" ہے۔ سائنس جستجو تلاش اور
تحقیق سکھاتا ہے۔ تحقیق سے اعراض کرنا سائل کی ذات کے خلاف ہے
لیکن اہل سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے جو امور ان کی
تحقیق اور ان کی حدود سے باہر ہیں ان کے تو منکر ہی ہیں لیکن
سائنٹفک تحقیقات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔
ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب میں اہل مذاہب پر توجا بجا طعن و
تشنیع کی ہے کہ انہوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انہیں یہ بھی
ضرور معلوم ہوگا کہ خود اہل سائنس نے تمام سائنٹفک تحقیقات کی ابتدا
ابتدا میں کس قدر مخالفت کی ہے۔ اور جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس
میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت
میں اہل سائنس آستینیں چڑھا کر آئے۔ کوپرنیکس۔ گلیلیو اور ہاروے
کے نام سے کون واقف نہیں۔ انہوں نے سائنس میں ایسے ایسے
انکشافات کئے ہیں جو تا قیامت یادگار رہیں گے۔ لیکن ان کی
مخالفت سب سے اول نہایت شدومد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہل
سائنس نے کی۔ جب بنجمن فرینکلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے برق
کی بحث کی تو تمام اہل سائنس نے اسے بے وقعت بنایا اور رسالہ
"فلاسوفیکل ٹرینزایکشن" نے اس مضمون کو درج کرنے سے انکار کیا

حالانکہ وہی چیز آجکل کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی اور اس کا
استعمال عام ہوگیا ہے۔ جب ینگ نے روشنی کے نظریہ انتعاشیہ کے
عجیب و غریب ثبوت پیش کیے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب
ہنسی اُڑائی۔ سرہمفری ڈیوی نے جب یہہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں
گیس کی روشنی ہوسکتی ہے تو اہل سائنس نے اس کا مضحکہ اُڑایا۔ اسٹیفنسن
نے جب یہہ تجویز کی کہ لورپول اور مانچسٹر کے ریلوے روڈ پر انجن گاڑی
چلائی جائے تو اُس وقت کے بڑے بڑے اہل سائنس نے
شہادت میں بیان کیا کہ یہہ ناممکن ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ
بھی ہوسکے۔ جب نامور اور مشہور منجم اراگو نے برقی ٹیلیگراف کے
متعلق بحث کرنی چاہی تو فرنچ اکاڈیمی آف سائنس نے اس کی خوب
ہنسی اُڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی۔ یہ چند عام اور معمولی نظیریں
پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سیکڑوں مثالیں موجود
ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی تو سب سے اول اہل سائنس
نے اس کی مخالفت کی۔ جب سائنس کے متعلق اہل سائنس کا یہ حال ہے
تو روحانیت کے متعلق وہ جس قدر شد و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم
ہے۔ لیکن وہ امور جن کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے
وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلّم ہوجائیں گے اور انہیں اپنی مخالفت
پر خود افسوس کرنا پڑے گا کیونکہ انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنے ہاتھوں
اپنے علم کو محدود کیا۔ اہل سائنس اہل مذاہب کو تعصب کا الزام

دیتے ہیں۔ لیکن ان کی ضد اور ان کا تعصب ان سے کچھ کم نہیں
ان کے ذرا سے علم نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ تحقیق و تجسس جس پر
انہیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرہ تک محدود رکھتے ہیں
اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب
کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ وقت
آتا ہے جب انہیں مجبوراً اس خول کو توڑ کر باہر نکلنا پڑے گا۔

غرض اگر ہم روح کی ہستی اور اس کی قوت سے جس کے متعلق بے
انتہا واقعات اور بہت قوی دلائل موجود ہیں انکار کر دیں اور مذہب
کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدن سے خارج
کر دیں تو انسان کی زندگی محض بے سود و بیکار اور بے برگ و ثمر رہ جاتی
ہے اگر انسان صرف اسی مادی دنیا کو اور اس چند روزہ زندگی کو اپنا
منتہا سمجھ لے تو کیا اُن انسانی تمناؤں کے لئے جو اس کے دل میں موجیں
مار رہی ہیں یہ دنیا کافی ہو سکتی ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف
اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بری بھلی کسی طرح کاٹ
کر چل دے؟ کیا علوم طبیعات سچے اخلاق اور سچے ایثار کی ہدایت
دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور طبیعات
و ریاضیات کے قانون اس کے فرمانروا ہیں تو انسان محض ایک چلتی
پھرتی کل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوت ہے تو ایک وحشیانہ
قوت ہے جو سب پر غالب آ جائے گی۔ خیر و شر یا برائی بھلائی صرف

یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے ذاتی یا مدنی ذلیل وحقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اور الٰہی قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو نکال دو۔ اور خدا۔ حیات جاوید۔ انصاف وعصمت اور عذاب وثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے۔ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس میں سے ترقی کا مادہ سب زائل ہو جائے گا۔ اور مادیت کے زہر سے سچے اور پاکیزہ اخلاق مرجھا جائیں گے۔ افسوس اُن بیچاروں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت ومشقت میں جت جاتے جفائیں سہتے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں کس لئے؟ اس لئے کہ چند غافل ناکسوں کی عیش وعشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ افسوس ان پر جن کی ساری عمر اس فکر وتردد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملے جو اصل مسرت ہے دولت ملی۔ اس وقت جبکہ آفتیں سہتے سہتے اور بلائیں جھیلتے جھیلتے کمر جھک گئی ہے آنکھوں کی روشنی مدہم پڑ گئی۔ نہ پہلی سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش قوتوں میں اضمحلال اور عناصر میں اختلال آگیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرت کا باعث نہیں یا اس وقت بے مانگے بلا محنت مشقت کے ملی جبکہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا۔ اور بجائے مسرت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی۔ کاش ضبط نفس ہوتا۔ تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہائے مسرت کا

ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن حصول دولت و عیش کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور آفتیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہو جاتی ہے۔ اصل خوشی اعتدال قناعت اور ضبط نفس میں ہے۔ بشرطیکہ انسان کسی مقصد اعلیٰ کے حصول میں مشغول ہو۔ اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور مادی سامان کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور بامسرت بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ ہے۔ بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہیئے۔ اپنے ارادے میں قوت نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشات نفسانی کو اس کے تابع بنانا چاہیئے تاکہ قلب کا اثر مادی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرت کا باعث ہوں۔ اسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ مسرت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام لیتا ہے۔ حیات انسانی کی تہ میں رنج و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گھرا ہوا ہے اور زیادہ تر وہ جو کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے آپ کو بہلائے رکھے اور دلی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔

انسانی فطرت کا ایک یہہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آلام زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہہ عام مصروفیت ادنےٰ درجہ کی ہے اعلےٰ درجہ اس کا اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت اور خوشی پہنچانے کے لئے اپنے تئیں بھلا دیتا ہے۔ مذہب کی زبان میں اسے ثواب کا کام کہتے ہیں۔ وہ ایک تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی ہمدردی اور اخلاق کے اعلےٰ طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے سچے مذہب کی تعلیم یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائدار اور مستقل اور بے غل وغش ہوتی ہے اور اسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے بخلاف اُس بوالہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پر پچھتاتا اور حال میں مذبذب اور بے اطمینان رہتا ہے اور آئندہ زمانہ اسے تاریک نظر آتا ہے۔

۱۴

ہم نے جو گزشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے تو اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بیکار یا گمراہ کرنے والے ہیں بلکہ اس طرح پر زیادہ زور

اس لئے دیا گیا ہے کہ آجکل سائنس کی چکا چوند سے لوگوں کی نگاہ اس قدر خیرہ ہوگئی ہے کہ وہ دوسرے رُخ پر نظر نہیں ڈالتے۔ ورنہ سائنس و فلسفہ کے کارآمد ہونے سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اور مادی ترقی سے اس نے انسانی تمدن کو جو مدد دی ہے وہ ظاہر ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ محض سائنس کی ترقی انسانی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اور نہ اُسے اُس رُتبہ پر پہنچا سکتی ہے جو اس کا اصل منشاء و منتہا ہے۔

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہے؟ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے اور سائنس کی بنیاد عقل پر۔ اہل مذہب سائنس سے اس لئے ڈرتے ہیں۔ کہ سائنس کے اصول اور اُس کے انکشافات مذہب کو کمزور اور زائل کردینگے۔ حالانکہ یہ خیال محض باطل ہے۔ سائنس صدہا سال سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے لیکن وہ مذہب کی بنیاد نہ ہلا سکا۔ مذہب کی قوت ابھی تک ویسی ہی قائم ہے اور قائم رہے گی اس لئے کہ جس شئے پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے اس لئے کہ اس کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدان قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے حالانکہ عقل بذاتہا محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا

دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے عقلی استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ادلہ و براہین اسی کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لیے تمام دلائل بیکار ہیں۔ لہٰذا اہل مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر زمین گردش کرتی ہے تو اور آسمان پھرتا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی ستارہ دریافت ہو تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے آثار متحجرہ نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کشش ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائل عالم کو حل کیا تو بہت مبارک۔ مذہب اس سے کیوں خائف ہو؟ اور نظریہ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا ہے تو بتائے مذہب کیوں اس سے گھبرائے۔

جب مذہب کی حالت ایسی مستحکم اور قوی ہے تو پھر اہل مذہب کیوں اہل سائنس سے لڑتے اور جھگڑتے اور ان پر ارتداد و کفر کے فتوے لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ مذہب انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب سے اس نے ہوش سنبھالا اور جبکہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لیے مذہب کو علاوہ روحانیات و معاشریات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی اخلاقی

معاشرتی سیاسی اور سائنٹفک تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا
اور مذہب کا بانی معلم بھی تھا فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا لیکن
مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبوراً مذہب میں
داخل کر لیے گئے تھے۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور
تمدن وسیع ہوا تو یہ شعبے الگ ہونا شروع ہوا اور ان میں نئی نئی
باتیں اور نئے نئے انکشافات شروع ہوئے اہل مذاہب نے جب
یہ دیکھا تو یہ امر ناگوار گزرا اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت
میں ہے جو امور ابدان و حفظان صحت کے متعلق تھے وہ علم طب نے
سنبھال لیے جو ملکی تھے وہ علم سیاست نے لے لیے اور جو نجوم و شموس
و اقمار کے متعلق تھے وہ فلکیات یا علم ہیئت میں آ گئے۔ مگر اہل مذاہب
ایک مدت تک انہیں باتوں پر جمے رہے جو ابتداء میں ضمناً ان علوم
کے متعلق مذہب کی ذیل میں آ گئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے
اور اس کی ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے
لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے
اور نہ ان کی ترقیاں مذہب کے رستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اور نہ
اُسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں کیونکہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ
کر سکتا اور نہ اُسے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے جس پر مذہب کی
بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس اور رسائی سے باہر ہے۔
اب رہی سائنس کی مخالفت مذہب سے سو یہ بالکل بیجا اور

محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ سائنس مذہب
کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس استدلال عقلی پر مبنی ہے اور سب
چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری
نہیں اترتیں ان کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ
بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں
بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاق حق میں صرف عقل ہی
پر دار و مدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان
کی اخلاقی روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً حسن کی دریافت
کے لئے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل۔ احقاق حق میں عقل
وہیں تک کام دیتی ہے جہاں تک سلسلہ علت و معلول کا تعلق ہے
لیکن جہاں اس کے سوائے کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی عمل
شروع ہو جاتا ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں عقل حالات
و عادات و اغراض سے بھٹک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس
کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے جن کا زیادہ تر تعلق تمیز وجدانی پر ہے
چونکہ مذہب کی بنیاد خرق العادۃ پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس
لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور نافہمی سے اس
پر حملہ کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اسے اور
ہاتھ لگ گئی ہے۔ جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف
کہہ اٹھتا ہے کہ یہ خلاف قانون فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانین فطرت

اس کے دیکھے بھالے ہیں۔ اور وہ ان سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول
تو اس کرہ کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی کیا ہے دوسرے جو چند
قانون فطرت ہمیں معلوم ہیں بالکل محدود ہیں اور وہ صرف مادی
حالت سے متعلق ہیں عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنا
اس پر ہے اور بھی محدود ہے۔ اسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسی
ہو سکتی ہے۔ وہ مادی حالت سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اگرچہ اس کے
متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر اس محدود علم اور یکطرفہ
علم پر اس کے یہ دعوے ہیچ ہیں اور بغیر اس کوچہ میں قدم رکھے جو مادہ
سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرہ میں داخل
ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس کا انکار نا قابل سماعت ہے۔ ایسی صورت
میں سائنس کا مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نافہمی ہے
اہل سائنس کو زیادہ عالی ظرفی زیادہ وسیع النظری زیادہ حوصلہ و
تحمل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہئے۔ اپنی آنکھوں پہ
پٹی باندھ کر یہ کہدینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے
اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انھیں جھٹلانا سائنس اور فلسفہ
کے اصول کے خلاف ہے۔ مگر باوجود کثرت واقعات و دلائل وہ اپنے
انکار پر مصر ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعصب اور
ان کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور ضد سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔
جس طرح علمائے طبیعات و مریدان ارتقا کو اس بات کی

ضرورت ہے کہ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح اہل مذہب کو بھی چاہیے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک حد ہے جہاں مذہب کو رک جانا چاہیے۔ اور ایک حد ہے جہاں سائنس کو ٹھہرنا چاہیے اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے پرانے قصے قضیئے اور عداوتوں کو بھلا دیں۔ بلکہ دو روٹھے ہوئے بھائیوں کی طرح من جائیں۔ عالم طبیعات کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ کائنات کا مسئلہ کو حل کرے۔ اور اسی طرح اہل مذاہب کو بھی۔ ان کا منشاء ایک ہے یعنی انسان کی ترقی اور بہبودی لیکن ایک کا مقصد مادی اور ظاہری ترقی ہے اور دوسرے کا مقصود باطنی اور روحانی ترقی۔ ایک استدلال عقلی اور استقرا کے رستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے اور دوسرا جذبات اور تخیل کی راہ سے لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خارج کر دے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہے بہت اچھا کرتا ہے۔ اگر خدا کا خیال ہمارے دل و دماغ میں جاگزیں ہے تو پھر اسے نکال نہیں سکتی۔ روح اسے نصرو نہیں پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہے کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کر دے وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

جھگڑے تنازع اور جدوجہد سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ صداقت اختلافات کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اہل مذاہب کا ضعف اس میں ہے کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اس سے مدد لینا اور اُسے معاون بنا کے رکھنا چاہئے اگر اس کے کہیں دشمن ہیں تو ان سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہے کیونکہ ممکن ہے کہ شکست سے فتح ہو جائے۔ مگر بھاگنے سے گمنامی کا احتمال ہے۔ گمنامی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور آئے تو بہات باطلہ اور تمام غیر ضروری کتاففوں سے پاک کر دیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔ اسی طرح سائنس کا ضعف اس بات کہ اپنے محدود علم پر تکیہ کر کے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصول مذہب پر حملہ کرتا اور اس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انسان کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالے جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اس کی نظر اور وسیع ہوگی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلاشبہ اس کی قسمت میں ہار ہے۔ یہ وقت ہے اس کی ہمت آزمائی کا تحقیق و تجسس اس کے اصل اصول ہیں۔ اُسے چاہئے کہ وہ انہیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرت حق کا تماشہ دیکھے۔ آئیے اب صداقت کے ماننے کے لئے

تیار ہونا چاہیئے۔ اور زیادہ اعلیٰ ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہیئے اور ضد اور نفسانیت سے دست بردار ہونا چاہیئے۔

بقول پروفیسر ٹیٹ و بالفور اسٹیوارٹ جو اس زمانے میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں۔ اس کائنات میں ایک قانون توال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کرلی جائے تو تمام عالم درہم برہم ہوجائے گا۔ اور یہ ہستی محض بیکار اور مہمل ہوجائے گی۔ یہ مادی عالم صرف مادہ ہی سے نہیں بنا۔ بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دارومدار ہے۔ اور وہ قوت ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہہ قوت اسی وقت کارآمد ہے جبکہ یہ تبدیل ہیئت کرتی ہے۔ لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ قوت کی تبدیلی اُسے کمزور کردیتی ہے۔ یہ بیشک ممکن ہے کہ قوت کو ہم حرارت میں تبدیل کرلیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوت حرارت کو کمزور کردیگی اور رفتہ رفتہ اسکا خاتمہ ہوجائیگا۔ سورج ہمارے نظام کا منبع حرارت اعلیٰ ہے اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دارومدار ہے اس حرارت سے اخذ کیجاتی ہے جو سورج سے نکلتی ہے۔ جبکہ سورج ہمارے لئے قوت مہیا کرتا رہتا ہے تو خود وہ سرد ہوتا جاتا ہے۔ اور آخر کار اس طرح خلائے بسیط میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں سے وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہوجائے گی۔ جو اس وقت اس میں موجود ہے۔ علاوہ سورج کے سرد ہونے کے ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ایتھری رگڑ کی وجہ سے ہماری زمین اور ہمارے نظام کے دوسرے کرّے باتصاف سورج کے

قریب ہوتے چلے جائیں گے ہر ایسی حالت میں تصادم سے حرارت
پیدا ہوگی۔ اور عارضی طور پر سورج کی بجھی ہوئی قوت پھر بحال
ہو جائے گی۔ اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور وہ
بجھ بجھا کے رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ ازمنۂ بیشمار کے بعد اس کی
پھر کسی پڑوسی کرے سے مٹ بھیڑ ہو۔ اور اس کی جان میں جان آئے
اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کا خاتمہ
کر دے گا۔ تو پھر کیا اس سے وہ قانون عالم جسے قانون توالی یا عدم
انقطاع سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا؟ ایسی حالت میں وہ تسلسل
جو برابر جاری رہنا چاہیے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہری
سب کچھ ہوتا تو بیشک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے
اپنے کھردرے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے اور
اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اُن قوانین کی تکمیل کے لئے جو اس نے دریافت
کئے ہیں ایک غیر مرئی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانون
توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ غیر مرئی عالم سے قبل ہوگا
کیونکہ مرئی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہیئے۔ اب یہاں مذہب اور
الہام اور سائنس کی سرگوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ
عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا۔ سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس
وقت ہے ہمیشہ سے یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مذہب کہتا ہے کہ دنیا اور

اس کی کائنات سب ل کے خاک ہو جائے گی۔ سائنس ان قوانین کی رو سے جن کی حکومت اس دنیا پر ہے یہ استدلال کرتا ہے کہ موجودہ نظام کا انجام یہی ہونے والا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ایک روحانی دنیا بھی ہے جس کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ سائنس بھی اب دبی زبان سے کہنے لگا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون طبیعت ہو جائیں گے۔ اور اپنے ہاتھوں آپ اپنی قبر بنائیں گے کیونکہ قانون توال یا عدم انقطاع کا مقتضی یہ ہے کہ اگر یہ موجودہ کائنات برباد و تباہ ہو گی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جدید سلسلۂ قوانین کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانون نشو و نما میں پھولے پھلے اور یہی اصول افراد پر بھی صادق آتا ہے اور اس لئے بلا کسی مذہبی خیال کے روح کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو موت انسانی ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہو سکتی اور یہی آخرت یا عقبیٰ ہے۔

یہاں سائنس وہ مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہے اور جس پر ڈاکٹر ڈریپر نے فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کافور ہو جاتی ہے۔ سائنس اب تک ایک گنبد بے در میں چکر لگا رہا تھا۔ اب ادھر کی تھوڑی سی جھلک پہنچنی شروع ہوئی ہے۔ وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شئے کیا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منور

ہو جائے اور مذہب سے کو کشمکش کرے۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی پر ہے اور فریقین نے ان میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ بجائے سلجھانے کے اور الجھن پیدا کر دی ہے۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور نئے قیاسات اور نظریات سے جن پر اہل سائنس کو بڑا فخر ہے۔ اہل مذاہب گھبرا گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہے۔ کیونکہ وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ ناگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے۔ اور ان جدید انکشافات سے اس حالت میں تنزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے سے ایمان لائے بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو۔ لیکن چونکہ اُسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے۔ لہٰذا مذہب اور الہام کو بھی اسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے ٹھیس لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا۔ اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی اور یہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے۔ حالانکہ اسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔

اہل مذہب کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہام ربانی کو ہمیشہ گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اُسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے۔

لیکن صرف اہل مذاہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہل سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں اہل سائنس اہل مذاہب کے اجتہادات

اور رایوں کو الہام ربانی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے ان رایوں کی غلطی ثابت کر دینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہام ربانی کو غلط ثابت کر دیا۔ زیادہ تر خطرہ "نیم حکیم" اہل سائنس سے ہے جنہوں نے کبھی آنکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی یقینیات سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ اور ان میں ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگرچہ بعض اہل سائنس جنہیں خدا نے اعلیٰ دماغ عطا کیا ہے یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور وہ اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قائل ہوتے جاتے ہیں۔ جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب "کانفلکٹ بٹوین سائنس اینڈ ریلیجن" (معرکہ مذہب و سائنس) درحقیقت سائنس کی پر زور حمایت ہے۔ لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ کہ جسے وہ مذہب کہتے ہیں وہ درحقیقت مذہب نہیں بلکہ رومن کیتھولک ازم ہے اور جتنے حملے انہوں نے مذہب پر کئے ہیں وہ بلاشبہ رومن کیتھولک ازم پر ہیں۔ مذہب پر نہیں ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ عام مذہب تو کیا خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حملوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شاندار عمارت جو انہوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہو کر دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

۱۴۵

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بدظنی و بدگمانی ابھی مدت تک رہے گی۔ اور اسے رہنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے اہل مذاہب کو سائنس کی صداقت پر اور اہل سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہیئے۔ اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اپنی نادانی پر پچھتائیں گے اور اپنی حرکات سے شرما کر مصافحہ کے لیئے ہاتھ بڑھائیں گے۔ پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہوگا۔ اور یہ توام بھائی ایک جان دو قالب ہو جائیں گے۔

۱۴

لیکن ایک مشکل اور ہے۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے سوائے اُن امور کے جو قیاسی ہیں۔ کیونکہ وہ مشاہدے تجربے اور استقرا پر مبنی ہیں۔ حالانکہ مذاہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ ان بیحد اور بیشمار اختلافات میں یہ مشکل آپڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے۔ اور صداقت کا پتہ کہاں سے ملے۔

پروفیسر میکس مولر نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن

تاہم انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی۔ قدیم سے جو الفاظ چلے آتے تھے وہی اب تک چلے آتے ہیں۔ انہیں میں کچھ ہیر پھیر اور ردوبدل کر لیا جاتا ہے۔ یعنیہ یہی حال مذاہب کا ہے ہمیشہ نئے نئے بنتے رہتے ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے البتہ کچھ ردوبدل کر لیا گیا ہے۔ اختلافات صرف اُن ممالک اور ان اقوام کی وجہ سے ہیں جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اُس زمانہ کی وجہ سے جبکہ مذاہب کی اشاعت ہوئی۔ اگر ابتدا سے لیکر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جانچا جائے تو یہ اختلاف کا مسئلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائے گا۔ ملک اور قوم اور زمانہ کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر مشکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے۔ اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس لیئے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منتظم سلسلہ میں آنے کے قابل ہیں۔

اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لیے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطرخواہ انجام دیا ہے۔

کسی مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت مبالغہ ہے۔ ایک مذہب نے

ایک خوبی کو لیا اور اسے آسمان پر چڑھا دیا اور دوسری خوبیوں کو بالکل
نظر انداز کر دیا۔ دوسرے نے کسی دوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ
باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی
پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پس پشت جا پڑی۔ اس
کے خلاف عیسائی مذہب نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر
عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب ہیچ رہ جاتے ہیں۔ غرض
مختلف مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر سے دیکھا
اور باقی پہلو یونہیں رہ گئے۔ اس مبالغہ سے مذاہب میں انحطاط اور
تنزل پیدا ہوا۔ حالانکہ وہ بات جو باعث انحطاط ہوئی بڑی خوبی کی تھی۔
لیکن اس میں مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود تو عیب ہو گئی۔ اور دوسری خوبیاں
اس مبالغہ کی وجہ سے کمزور ہو گئیں جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے
سے دوسرے اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی اور روحانی
قوتوں کا بھی حال ہے کہ ایک پر زور دینے سے دوسری کمزور ہو جاتی
ہیں۔ مذہب کی کامل صداقت اور اصل کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب
میں اعتدال قائم رکھے۔

انسان کی دو حالتیں ہیں ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں
میں آپس میں اختلاف اور عناد ہے۔

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسری جذبات
اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اخلاق و تمدن کا تنہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں کی بھی دو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے جد وجہد رکھتی ہیں کیونکہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے۔ اور بحیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عائد ہیں۔ بہ حیثیت انسان ناطق کے وہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ سوسائٹی اس آزادی کی مانع ہے۔ شخصی ترقی کے لئے کامل آزادی کی ضرورت ہے لیکن تمدنی ترقی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے اس لئے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتی ہے۔

غرض انسان اپنے خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عناد و عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں اور اس لئے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے لئے ضرور ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے مختلف زمانوں میں مختلف نبی آئے اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن نقص یہ رہا کہ وہ اصلاح صرف اسی زمانہ کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانہ میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں مبالغہ تھا

نبی نے اسے توڑنا چاہا۔ اور اس کے مقابل میں کسی دوسری صداقت یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہوسکی لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو۔ لہذا اس کی کامل اصلاح کے لیئے ایک انسان کامل کی ضرورت تھی جو ملک عرب میں مبعوث ہوا۔ اس نے انسان کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات اب تک چلے آرہے تھے مٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہوگیا جو انسان کی دنیوی اور دینی نجات کا باعث ہوا۔ پیغمبر خدا صلعم ان اختلافات کی لم اور اصلاح کے اصلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے مبالغہ سے احتراز کیا اور اعتدال کو مد نظر رکھا اور ان اختلافات میں ہمیشہ کے لئے مصالحت پیدا کر دی یہہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ پیغمبر خدا نے اس معمے کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ انحطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کش مکش میں ہو کہ وہ مبالغہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی فوت میں زوال نہ آنے پائے معتدل

بر رکھے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے
اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور دنیا کے امور کی اصلاح کیلئے
ضروری ہے بلکہ تمام اخلاق و نیکی اور کل کائنات کا دار و مدار اسی پر ہے یہ زمین
یہ ستارے یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنے اعتدال
سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہو جائے اور یہ سارا کارخانہ
خاک میں مل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شے میں ہے۔ نیکی و
بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز
کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان
سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے وہاں قیام اور استحکام کی
صورت نہیں۔ اسی عالمگیر اور پر معنی اصول پر پیغمبر اسلام کی تعلیم مبنی ہے
اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال
پیدا ہوا۔ اسلام نے اس کمی کو پورا کیا۔ اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے
ایسی بنیاد قائم کر دی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہبانیت[1] کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسن معاشرت کے
متعلق احکام دیئے ہیں۔ لیکن تاہم یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں
منہمک نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ دنیا کی زندگی دھوکے کی شے ہے[2]۔ نماز روزے

---

[1] لا رہبانیۃ فی الاسلام۔
[2] وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور۔

حج کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا ہے کہ نیکی کے یہ معنی نہیں کہ نماز کے لئے پورب پچھم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں عزیز و اقارب یتیموں محتاجوں مسافروں کو اپنا مال دینا۔ غلاموں کو آزاد کرنا۔ زکواۃ دینا۔ نماز پڑھنا اپنے عہد کو پورا کرنا۔ سختی اور تکلیف میں ثابت قدم رہنا۔[له] اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے اس کا مدار محض ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار میں ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت مادی اور روحانی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابند ہو گیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لئے وسیع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ آگے قدم رکھتا ہے اور اس کا روحانی جہاں

له۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آنحضرت صلعم کی زندگی اس کی سچی مثال ہے۔
خبابؓ صحابی آنحضرت صلعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر کے نیچے کملی رکھے ہوئے کعبہ کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے آپ نے مشرکوں سے بہت ایذا اور تکلیف پائی تھی۔ میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کفار پر بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے اور آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمانے لگے کہ اگلے لوگوں میں ایسے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیتے تھے اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اُسے دو ٹکڑے کروا دیتے تھے لیکن اس قدر تکلیف بھی اُس بندے کو دین سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کر کے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اُسے دین سے نہ پھیرتی تھی"۔ سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مدنظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاق میں۔ مثلاً یہ فرمایا ہے کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ بدلہ لو تو اس کے بدلے میں اسقدر تکلیف دو جتنی تمہیں پہنچی تھی۔ لیکن اگر صبر کرو درگزر کرو معاف کرو اور بخشدو تو اللہ تمہیں دوسرا اجر دیگا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے[۱]

---

[۱] وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد ۲۰)
وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (شوریٰ ۴۰)

اور اسکو بار بار مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہے اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا
درجہ بہت بڑا بتایا ہے۔ آخر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تم گنہگاروں خطاکاروں اور دشمنوں
اور مخالفوں کے ساتھ عفو و غفران اختیار کرو گے تو خدا بھی تمہاری خطاؤں سے درگزر
کریگا۔[1] یعنی بدلہ لینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہے اور مقتضائے عدالت ہے لیکن جمال اخلاق
ربانیہ کا یہی مقتضا ہے کہ برائی کے عوض بھلائی کرو اور مخالفوں کی خطاؤں اور برائیوں کو
معاف کرو اور ہمیشہ درگزر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ بری بات کا جواب ایسا ہو جو بہت
بہتر ہو۔[2] ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کا دفعیہ ایسے
برتاؤ سے کرو کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دیکھو گے کہ تم میں اور کسی شخص میں
عداوت تھی تو اب یکدم سے گویا وہ تمہارا دلسوز دوست ہے اور حسن مدارات کی توفیق
انہیں لوگوں کو دیجاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہیں کو دیجاتی ہے جنکے بڑے نصیب ہیں[3]۔ پھر
یہ بھی سمجھایا ہے کہ کسی قسم کی عداوت تم کو عدل کرنے سے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم
کو انصاف کرنے سے نہ روکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب کے ساتھ عدل و احسان و انصاف
کا برتاؤ کرو چنانچہ فرمایا ہے اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے لئے گواہی دینے کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ (نحل) فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (مائدہ)

[1] وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ (نور - ۲۳)

[2] اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (مومنون ۹۸)

[3] وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (حم سجدہ ۳۵)

انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقوی کی بات یہی ہے کہ تم عدل کرو۔ اس سے بڑھ کر حسن معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طور پر روپیہ پیسے کے کمانے اور اسکے صرف میں اعتدال کی ہدایت ہے کہ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔ اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ خرچ کرنیوالے فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگدستی کریں۔ ان کا خرچ دونوں کے بین بین ہو۔ رشتہ دار غریب اور مسافر کے حقوق دیتے رہو اور دولت کو بیجا نہ اڑاؤ۔ دولت کے بیجا اڑانیوالے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ اگر تم کو پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہے انسے منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے انکو سمجھا دو۔ اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل اسے پھیلا ہی دو کہ تم تہیدست ہو کر لوگوں کی ملامت سنتے بیٹھو۔

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلیٰ تعلیم دی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی عالم کی روح ہے فرمایا ہے کہ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" یعنے مسلمان سب بھائی بھائی ہیں یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے کہ ایک ادنیٰ غلام اور شہنشاہ برابر ہے۔ اور صرف قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے اب تک اس پر عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے غلام بڑے بڑے شہنشاہ ہو گزرے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہو جاتا ہے اور اس کے حقوق سب کے برابر ہو جاتے ہیں اسلام کی

---

[۱] یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

[۲] کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ [۳] اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (انعام۔ ۱۷)

[۴] وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (فرقان۔ ۱۶)

یہ تعلیم جادو کا اثر رکھتی ہے اور اسنے اشاعت اسلام میں بہت مدد دی ہے۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں انکی تقسیم محض حدود جغرافیہ کی رو سے ہے لیکن مسلمانوں کی قوم اس تنگ اور راو امتیاز سے بالا ہے مسلمانوں کی راہ میں ملکی حدود۔ آب وہوا۔ رنگ اور نسل حائل نہیں وہ سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی عرب کا بدو۔ ہندوستان کا برہمن۔ یورپ کا فرنگی۔ مصر کا فلاح غرض دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی یہ سب کمزور اور عارضی امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہو جاتے ہیں مسلمان کہیں کا ہو اور کوئی ہو مسلمان ہے۔ اس کا وطن سارا عالم اور اسکی برادری سب مسلمان ہیں چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ سب ملکر مضبوطی سے اللہ کا ذریعہ پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اسکے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

اس سے بھی بڑھکر اعلیٰ اور افضل ایک اور تعلیم اسلام کی ہے جو درحقیقت تمام عالم کیلئے صلائے عام ہے یعنی پیغمبرؐ نے فرمایا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ "اس سے بڑھکر کامل وسیع اور عالمگیر اصول کسی دین و مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنا دائرہ اسقدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہیگا۔ اور دنیا پر اسکی حکومت ہوگی۔ گویا اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر اس کے اخلاق اسقدر پاکیزہ اور اسکی تعلیم اسقدر اعتدال پر مبنی اور انسانی طبائع کے مناسب اور

له وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ط

انسان کی ترقی کی حد ہے کہ دنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں ہو سکتا یہ محض قول ہی نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبر اور پاک باطن خلفا اور تابعین نے اپنے عمل اخوۃ اسلامی اور مساوات اور ایثار کا سچا سبق دیا جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑی ہیں خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جسطرح مسلمان پولیٹکل حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اسیطرح انہوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی اکتشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بے بہا خیالات سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ اور صلح جوئی آزادی بے تعصبی اور مساوات میں سب سے آگے بڑھ گئے اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کر رہا ہے غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی دنیاوی تمدن اور اخروی راحت عقل اور جذبات مذہب و سائنس میں توافق اور توازن قائم رکھنے والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں سے کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر ہی زور دیا تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ خاتم المذاہب اور اکمل الادیان ہے اور انسان کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے۔

مقدمہ

کتاب مبادیٔ سائنس

مبادی سائنس انجمن اردو کی پہلی کتاب ہے جو پبلک کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ کتاب در اصل فرانسیسی میں لکھی گئی تھی۔ فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کی گئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی بکری ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ترجمہ میں آسانی کی غرض سے اس کتاب کے دو حصے کر لئے گئے ہیں پہلے حصہ میں حیوانات، نباتات اور حجریات (معدنیات) کا ذکر ہے جس کا یہ ترجمہ ہے۔ اور دوسرے حصے میں طبیعیات، کیمسٹری، فزیالوجی کا بیان ہے۔ اس کتاب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ان علوم کے تمام اصول اور مسائل بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ نہایت سہل زبان میں ادا کئے گئے ہیں اور یہی اس کتاب کے مقبول ہونے کی وجہ ہے۔

انجمن اردو نے سب سے اول اس کتاب کو کیوں انتخاب کیا اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ زبانِ اردو کی توسیع و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ یہی ہے کہ

اُسے علمی زبان بنانے کی کوشش کی جائے۔ اگر زبان سے صرف یہ مقصود ہے کہ روزمرہ کی بات چیت، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے منہ دھونے کی کر لی جائے تو اتنا تو شاید جانور بھی آپس میں کہہ سُن لیتے ہیں۔ ایک ایسی زبان جسے ہندوستان سے عظیم الشان ملک کی عام زبان ہونے کا دعوےٰ ہے اُسے اسی قدر وسیع ہونا چاہئے جتنا وسیع اس کا ملک ہے۔ اور اس کی اسی قدر مختلف حیثیتیں ہونی چاہئیں جتنی اس میں مختلف اقوام و ملل ہیں۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس میں مختلف علوم و فنون نہ آجائیں۔ علاوہ اس کے ملک میں بھی تعلیم اُسی وقت پھیل سکتی ہے جب علوم و فنون کی کتابیں ملکی زبان میں ہوں۔ ہر شخص انگریزی یا یورپین زبانیں نہیں جان سکتا۔ فی صدی چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جو یہ زبانیں جانتے ہیں۔ باقی سارے ملک کی تعلیم کا دارومدار دیسی زبان پر ہے۔ لیکن جب دیسی زبان میں سوائے دیوانوں، عشقیہ مثنویوں، ناولوں، تاریخی قصوں کے کچھ نہ ہو تو علم کی روشنی کیسے پھیلے۔ اور جب علم پڑھنے کے لئے ایک غیر زبان سیکھنی پڑے تو ہماری زبان کس مرض کی دوا ہے۔ آخر دوسروں کی زبان سے کب تک کام نکلے گا اور ہم گونگے بنے کب تک دوسروں کا منہ تکتے رہیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ انجمن نے ایک ایسی کتاب کا انتخاب کیا اور ان علوم کی اشاعت کی کوشش کی جن کی ضرورت ہے۔ کسی انتہائی کتاب کا ترجمہ کرنا اس وقت بے موقع ہوگا۔ شروع ابتدائی کتابوں سے ہونی چاہئے۔ تاکہ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور اُن میں ایسے علوم کے پڑھنے کا ذوق پیدا ہو یہ کتاب اگرچہ ابتدائی ہے مگر جامع ہے اور ہر علم کے مسائل اصول طور پر مکمل

بیان کئے گئے ہیں۔

دوسری وجہ اس کتاب کے انتخاب کی یہ ہے کہ ہم ہندو اور مسلمان صدہا سال سے علوم نظری میں اس قدر منہمک ہیں کہ گویا ہمارے دماغ کی ساخت ایک دوسری قسم کی ہو گئی ہے۔ ہمارا قدیم لٹریچر مابعد الطبیعیات والٰہیات سے بھرا پڑا ہے اور یہ مادی دنیا ہماری نظروں میں ایسی حقیر ہو گئی تھی کہ ہماری اکثر بحثیں اس خاکدان سے ہمیشہ ارفع و بالا رہیں اور اگر کسی نے بدقسمتی سے ان بحثوں میں طبیعیات کے مسائل کو دخل دیا تو ہم نے اپنی منطقی بنوٹ کا ایسا پیچ مارا کہ طبیعی دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ قانون و منطق و فلسفہ میں بہت تیز ہوتے ہیں مگر میدان طبیعیات میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ لہذا ہمارے دماغوں کا علاج علوم طبیعیات ہی کی اشاعت سے ہو سکتا ہے۔

اب مجھے مترجم کی نسبت بھی کچھ کہنا ضرور ہے۔ یہ کتاب علمی ہے اور علمی اصطلاحات سے بھری پڑی ہے۔ قابل مترجم نے نہایت تحقیق اور جانکاہی سے تمام اصطلاحات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان قدیم اور مروجہ عربی اصطلاحات لکھی جائیں۔ جہاں کہیں کوئی عربی اصطلاح نہیں ملی وہاں موزوں اور مناسب اصطلاح عربی زبان میں بنا لی گئی ہے۔ عربی زبان میں جدید الفاظ بنانے کی بہت کچھ گنجائش ہے اور سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس وسیع اور بے نظیر زبان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مولوی معشوق حسین خان صاحب بی۔ اے (علیگ) نے اس

کتاب کا اُردو میں ترجمہ کرکے ملک پر بڑا احسان کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ ترجمہ بلامعاوضہ انجمن کو دیدیا ہے ۔ ان کی یہ مثال نہایت قابلِ قدر اور قابلِ تقلید ہے اور انجمن بدرجۂ غایت ان کی شکر گزار ہے۔

آخر میں میں افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ کتابت میں اکثر غلطیاں رہ گئی ہیں۔ سنگی چھاپے میں کتابت کی غلطیوں کا ہونا ایک ایسی معمولی بات ہوگئی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اس کے لئے کیا عذر پیش کروں اس میں شک نہیں کہ کامل طور پر صحیح لکھنے والا ایسا ہی کم یاب بلکہ نایاب ہے جیسے یورپ میں ہاتھی' لیکن اس کتاب میں صرف کاتب ہی قصوروار نہیں بلکہ ایک وجہ اور بھی ہوئی۔ بات یہ ہے کہ لائق مترجم نے کتاب کا بہت سا حصّہ ترجمہ کرکے خوشنویس سے صاف کرالیا تھا اور کتاب چھپنے ہی کو تھی کہ اتنے میں معلوم ہوا کہ انگریزی کتاب کا ایک جدید اڈیشن شائع ہوا ہے جس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے اور کتاب کی حیثیت بالکل دوسری ہوگئی ہے۔ اس لئے انھیں سرے سے پھر ترجمہ کرنا پڑا۔ اتفاق سے اسی اثنا میں انھیں یہاں سے جانا پڑا۔ یہاں چونکہ طبع کا کل انتظام ہو چکا تھا لہذا جلد جلد ترجمہ کرکے بھیجنا پڑا خوشنویس سے صاف کرانے کی مہلت نہ ملی۔ مسودہ ہی پر سے کاپی لکھی گئی۔ ایک تو علمی کتاب جس میں سینکڑوں غیر مانوس الفاظ دوسرے جلدی میں لکھے ہوئے مسودے سے کاپی لکھنا تیسرے طبع کی جلدی' ان تمام وجوہات سے کتابت میں غلطیاں رہ گئیں۔

کتاب کے آخر میں ایک مکمل فہرست انگریزی اصطلاحات کی مع ترجمہ

وتلفظ کے دیدی گئی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو اور نیز آن لوگوں کو جنھیں
اصطلاحات کے ترجمہ کی تلاش رہتی ہے بہت سہولت ہوگی۔ علاوہ اس کے
آئندہ جب اصطلاحاتِ علمیہ کی اردو لغت لکھی جائے گی تو اس سے
بہت بڑی مدد ملے گی۔

عبدالحق بی۔اے۔ (علیگ)
(سکرٹری انجمنِ اردو۔ حیدرآباد دکن)

۱۰۔ اپریل ۱۹۱۰ء
مطابق ۱۱۔ خورداد ۱۳۱۹ف

١٩٣

تاریخ و تذکرہ

۱۔ مقدمہ مشاہیرِ یونان و رُوما
۲۔ مقدمہ جنگِ رُوس و جاپان
۳۔ مقدمہ حیات النظیر
۴۔ مقدمہ تذکرہ گلشن ہند
۵۔ مقدمہ مآثر الکرام
۶۔ مقدمہ تذکرۂ مخزن نکات
۷۔ مقدمہ تذکرہ چمنستانِ شعرا
۸۔ مقدمہ ذکر میر
۹۔ مقدمہ تمدنِ ہند

مقدمہ مشاہیر یونان و روم

(مترجمہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی)

پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے۔ مطالعہ ایک شریفانہ فعل ہی نہیں حکیمانہ فعل بھی ہے، لیکن پڑھنے پڑھنے میں فرق ہے۔ اور کتاب کتاب میں فرق ہے۔

میں ایک بدمعاش اور پاجی آدمی سے باتیں یا بے تکلفی کرتے ہوئے جھجکتا ہوں اور آپ بھی میرے اس فعل کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں اس سے زیادہ بڑی اور پاجی کتاب پڑھتا ہوں نہ آپ کو ناگوار گذرتا ہے اور نہ مجھے ہی کچھ ایسی شرم آتی ہے بلکہ اس کی بات شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اترتی چلی جاتی ہے۔ پاجی آدمی کی تو شاید کوئی حرکت ناگوار ہوتی اور میں اس سے بیزار ہو جاتا مگر یہ چپکے چپکے دل میں گھر کر رہی ہے اور اسکی ہر بات دلربا معلوم ہوتی ہے۔

اگر میں کسی روز بازار جاؤں اور چوک میں سے کسی محض اجنبی شخص کو ساتھ لے آؤں اور اس سے بے تکلفی اور دوستی کی باتیں شروع کر دوں اور پہلے ہی روز اس طرح سے اعتبار کرنے لگوں جیسے کسی پرانے دوست پر۔ تو آپ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر ریل کسی اسٹیشن پر ٹھہرے اور میں

اپنی گاڑی سے اُتر کر سیدھے بک اسٹال (کتب فروش کی الماری) پر پہونچوں
اور پہلی کتاب جو میرے ہاتھ لگے وہ خرید لاؤں اور کھول کر شوق سے پڑھنے
لگوں تو شاید آپ کچھ نہ کہیں گے حالانکہ یہ فعل پہلے فعل سے زیادہ مجنونانہ ہے
اُس کے لئے تو کوئی عذر ہو بھی سکتا ہے، مگر اس کے لئے کوئی عذر ممکن نہیں۔
میں ایک بڑے آباد شہر یا مجمع میں جاتا ہوں کبھی ایک طرف نکل جاتا
ہوں کبھی دوسرے طرف جا پہونچتا ہوں اور بغیر کسی مقصد کے ادھر ادھر مارا مارا
پھرتا ہوں۔ افسوس کہ باوجود آدمیوں کی کثرت کے میں وہاں اپنے تئیں اکیلا
اور تنہا پاتا ہوں اور اس ہجوم میں تنہائی کا بار اور بھی گراں معلوم ہوتا ہے
میرے کتب خانے میں بیسوں الماریاں کتابوں کی ہیں، میں کبھی ایک لماری
کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں اور کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی دوسری
الماری میں سے کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگتا ہوں۔ میں اس طرح سینکڑوں
کتابیں پڑھ جاتا ہوں لیکن اگر میں غور کروں تو میں دیکھوں گا کہ میں نے کچھ بھی
نہیں پڑھا۔ اس وقت میری آوارہ خوانی مجھے ستائے گی اور جس طرح ایک
بھرے پُرے شہر میں میری تنہائی میرے لئے وبال تھی اسی طرح اس مجمع شرفاء
وعلماء ادبا وشعراء میں میں یکہ وتنہا اور حیران ہوں گا۔

بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہی نہیں مضر بھی ہے، جس قدر ہم
بغیر کسی مقصد کے پڑھتے ہیں اسی قدر ہم ایک بامعنے مطالعہ سے دور
ہوتے جاتے ہیں۔

ملٹن نے ایک جگہ کہا ہے کہ "اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ایسا ہی ہے

جیسے کسی انسان کا گلا گھونٹنا" جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ فضول اور معمولی کتابوں کے پڑھنے میں عزیز وقت ضایع کرنا اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ہے کیونکہ ایسی صورت میں وہ ہمارے لئے مردہ ہے۔

لوگ کیوں فضول، معمولی اور ادنیٰ درجے کی کتابیں پڑھتے ہیں؟ کچھ تو اس لئے کہ ان میں نیاپن ہے۔ کچھ اس خیال سے کہ ایسا کرنا داخل فیشن ہے اور کچھ اس غرض سے کہ اس سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی دو وجہیں تو طفلانہ ہیں۔ تیسری وجہ البتہ بظاہر معقول ہے، لیکن اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم معمولی ذلیل اور ادنیٰ معلومات کو اپنے دماغ میں بھرتے ہیں تاکہ اعلیٰ معلومات کی گنجایش باقی نہ رہے۔ اگر ہم اپنے مطالعہ کا ایک سیاہہ تیار کریں اور اس میں صبح سے شام تک جو کچھ پڑھتے ہیں لکھ لیا کریں اور ایک مدت کے بعد اُسے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم کیا کیا کر گزرے۔ اس میں ہم بہت سی ایسی تحریریں پائیں گے جن کا ہمیں مطلق خیال نہیں، بہت سے ایسے ناول ہوں گے جن کے ہیروؤں تک کے نام یاد نہیں، بہت سی ایسی کتابیں کہ جن کی نسبت اگر ہم سے کوئی یہ کہتا کہ یہ ہم پڑھ چکے ہیں تو ہمیں کبھی [illegible] بہت سی ایسی تاریخیں، سفرنامے، رسالے وغیرہ ہوں گے جنہیں پڑھ کر خوش ہی کیا پچھتائے ہی ہوں گے۔ اگر ہم علی گڈھ کالج کے طالب علموں کے نام ان کے مقطعے، ان کے وطن، ان کے محلے، ان کی کتب نصاب [illegible] ان کے شجرے یاد کرنے شروع کر دیں اور اُسے معلومات کے نام سے موسوم کریں تو لوگ کیا کہیں گے؟ غرض ایسا ہی کچھ حال اس [illegible]

ہوگا۔اس کا اکثر حصہ خرافات کی ایک عجیب فہرست اور ہمارے ورق گردانی اور تضیع وقت و دماغ کی ایک عمدہ یادگار ہوگی۔

ملٹن نے کیا خوب کہا ہے "عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہے"۔ اس قول میں مطلق مبالغہ نہیں۔عمدہ کتاب خود ہی لافانی نہیں بلکہ اپنے لکھنے والے کو اُن کو جن کا اس میں ذکر ہے، اور بعض وقت پڑھنے والوں کو بھی لافانی بنا دیتی ہے۔عمدہ کتابوں نے انسانوں کے اخلاق وطبایع و آراء پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے، خیالات میں عظیم الشان تغیر پیدا کیا ہے قوموں میں ہل چل اور انقلابات بپا کئے ہیں اور ملکوں کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی ہے اور یہی عمدہ کتاب کی نشانی ہے۔میں آج آپ کو ایک ایسی ہی کتاب کا حال سناتا ہوں یہ آج کل کی نہیں۔صدی دو صدی کی نہیں بلکہ سنہ عیسوی کی پہلی صدی کی لکھی ہوئی ہے۔یہ اب تک زندہ ہے یہ لافانی ہے۔اس نے بہت سے مُردہ دلوں کو زندہ دل بنا دیا۔بہت سے سوتے ہوؤں کو بیدار اور غافلوں کو ہشیار کردیا، بہت سی قوموں میں قومیت وانسانیت کی روح پھونکدی اور اس میں اب بھی اسی سحر کاری کی قوت موجود ہے بشرطیکہ ہمیں اپنی آوارہ خوانی سے فرصت ہو۔

جب روم کی قدیم سلطنت خانہ جنگیوں کی بدولت پارہ پارہ ہوگئی نیز مذہب عیسوی کے تازہ فروغ نے یونان قدیم کی تہذیب وحکمت کو برباد کردیا تو چوتھی صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک براعظم یورپ میں سخت جمود کی کیفیت طاری رہی۔علمائے مذہبی کی تلقین اور رہبانہ

تعلیم نے لوگوں کو دنیا اور معاملات دنیا کی جانب سے بالکل بے پرواہ کر دیا تھا، ہر دل پر آنے والی زندگی کا ہول اور قیامت کا خوف ایسا بیٹھ گیا تھا کہ جو لوگ تارک الدنیا نہ تھے حیات ظاہری کے مسائل پر غور کرنا انہیں بھی ناگوار اور تضیع اوقات معلوم ہوتا تھا، دماغوں میں اوہام پرستی اور متعصبانہ تنگدلی اور قومی عزت وغیرت کے تمام اصولوں سے بے خبری کے سوائے کسی چیز کے سمانے کی گنجائش نہ تھی اور شخصی بادشاہوں کے طفلانہ فرمان اور خود غرض پادریوں کے خلاف عدل وانصاف و انسانیت احکام کی تابعداری زندگی کا فریضہ مسلمہ بن گئی تھی۔

صدیوں تک اسی حالت خراب میں پڑے رہنے کے بعد آخرکار اہل مغرب میں حرکت پیدا ہوئی اور اندلس کے اسلامی درسگاہوں کے طفیل سے اور ان یونانی پناہ گزینوں کے اثر سے جو ترکی فتح قسطنطنیہ کے بعد جنوبی یورپ میں بھاگ آئے تھے یونان قدیم کے فلسفہ وحکمت اور رومی قوانین ونظام سلطنت کا علم ان ممالک میں پھیلا اور محض اس کی بدولت ذہنی ترقی کا وہ دور یورپ میں شروع ہوا جسے بجا طور پر اہل یورپ عہد بیداری یا رنشاۃ الثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں علم ومطالعہ کے شوق کے اس احیا نے ایک طرف تو اس زبردست مذہبی اصلاح کی تخم پاشی کی جو عیسائیوں کے نئے فرقے پراٹسٹنٹوں کی تحریک کی سنگ بنیاد تھی اور دوسرے طرف عدل و مساوات، رواداری اور معقولیت، آزادی خیالی اور جمہوریت اور بہ اتیار و حب وطن کا دلوں میں گہرا نقش بٹھا دیا۔ اور درحقیقت محض قدیم

علم ادب کا طفیل تھا کہ استبداد و مطلق العنانی کا زور ٹوٹا اور لوگوں کے خیالات میں وہ غیر معمولی تلاطم ہوا جس کا سب سے خوفناک مظاہرہ انقلاب فرانس تھا۔

اس طرح تقریباً پانسو برس کی محنت و مطالعہ کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ گویا اسی درخت کا پھل تھا جسے دو ہزار برس پہلے اہل یونان کے ہاتھوں نے بو یا تھا۔

لیکن ان یونانی کتابوں میں جو یورپ کے ایسے ذہنی انقلابات کا سبب ہیں اگر ہم بغور تلاش و امتیاز کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پلوٹارک متوطن خیرونیہ (علاقہ بیوشیہ یونان) کی کتاب "مشاہیر یونان و روما" منجملہ ان چند کتابوں کے ہے جنہوں نے مغرب کو قعر ذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہونچا دیا اور اعلیٰ انسانی خصائل کا ایسا سبق دیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔

مذہب ہو یا دنیوی معاشرت، سیاسیات ہو یا دینیات بغیر اخلاق کے چارہ نہیں۔ جب تک ان کی تہ میں اخلاق نہ ہو کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن قابل غور اور اہم سوال یہ ہے کہ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کیونکر دیجائے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات اس طرح متمکن ہو جائیں کہ دنیوی لالچ خودغرضانہ خواہشات، دوستی اور مروت انہیں ڈانوانڈول نکر سکے؟

بعض کا خیال ہے صرف مذہبی تعلیم ہی سے اخلاق درست ہو سکتے ہیں بعض کی رائے ہے کہ اخلاق کی کتابیں پڑھانے اور وعظ و پند کے ذریعے سے اخلاق سکھائے جا سکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلا طریقہ حکم و فرمان پر مبنی ہے

اور بہت سے طبائع اُسے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور اس لئے
اکثر محروم رہ جاتی ہیں۔ اور دوسرا طریقہ بے مزہ اور روکھا پھیکا ہے، خصوصاً
نوجوان طبیعتیں اُس سے بھاگتی ہیں اور واعظوں کے وعظ اور ناصحوں
کی نصیحتیں رائگاں جاتی ہیں۔ ایک تیسری تدبیر اصلاح اخلاق کی صحبت ہے،
بے شک یہ ایک کارگر اور موثر تدبیر ہے لیکن ہر کہیں اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ
سیرت کے کامل نمونے کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ پہلے دو
طریقوں میں دلکشی نہیں جو نصیحت کی تلخی کو کم کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے
ایک اور کمی بھی ہے، یعنے ان سے بڑائی حاصل کرنے کا دلوں میں ولولہ اور
جوش پیدا نہیں ہوتا۔ اب صرف ایک ہی طریقہ باقی ہے جو موثر بھی ہے۔
دلکش بھی ہے۔ اور طبیعتوں میں ولولہ اور جوش بھی پیدا کرتا ہے۔ اور ہر
کہیں میسر آسکتا ہے، اور وہ یہ کہ ان لوگوں کے حالات پڑھنے کے لئے دیئے
جائیں جنھوں نے دنیا میں ایسے بڑے بڑے کام کئے ہیں جو کبھی مٹنے والے
نہیں، بشرطیکہ ان کا لکھنے والا اُس گر سے واقف ہو۔

پلوٹارک اُس گر کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے یونان و روما کے
سپوتوں کے حالات لکھنے میں ایسے دلاویز طریقے سے کام لیا ہے کہ خود بخود
پڑھنے کی رغبت ہوتی ہے اور دوسری بات جو پلوٹارک کی سبق آموز
اور زندہ جاوید کتاب کی وقعت بڑھانے والی ہے وہ اسکی تاریخی حیثیت
اور صاحب کتاب کی غیر معمولی وسعت نگاہ ہے۔ اسکی مساعی تحقیق و جستجو کو
میسر کرنے کے لئے اول تو کتابوں کا ایک ذخیرہ کثیر اس کے سامنے تھا

ناپید ہے اور دوسرے وہ پہلی صدی عیسوی کا آدمی ہے اور اس لیئے یونان و روما کی تہذیب و معاشرت کا جیسا صحیح اندازہ وہ کر سکتا ہے اس زمانے میں ممکن نہیں۔ پس تاریخی اعتبار سے ان ملکوں کی کوئی قدیم تاریخ مکمل بلکہ مستند نہیں سمجھی جاتی جب تک کہ مؤلف اسبات کا ثبوت نہ دے کہ اس نے پلوٹارک کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کو طالب علمانہ شوق و جانکاہی سے پڑھا ہے۔

آپ اس کتاب میں حب وطن کا کمال ایثار، بے نفسی، وجاں نثاری، اور اولوالعزمی کی ایسی زندہ اور سچی تصویریں دیکھیں گے کہ ان کو پڑھ کر انسان بیخود ہو جاتا ہے اور دل بے اختیار سچے جذبات سے اُبلنے لگتا ہے۔ اور خواہ کیسا ہی آدمی ہو یہ ممکن نہیں کہ اس کے پڑھنے کے بعد وہ متاثر نہ ہو اور ان انسانی اعلیٰ خوبیوں کا دائمی اثر اس کے دل پر باقی نہ رہے۔ دنیا میں سینکڑوں آدمی ایسے گذرے ہیں کہ اس کتاب نے ان پر جادو کا سا اثر کیا ہے اور اس کی بدولت انہیں حیات جاوید حاصل ہوئی ہے۔

روسیو جو فرانس کا ایک بڑا حکیم گذرا ہے اور جو ان چند برگزیدہ لوگوں میں سے تھا جو انقلاب فرانس کا پیش خیمہ تھے۔ اس کتاب کو پڑھ پڑھ کر آپے سے باہر ہو جاتا۔ اور لڑکپن کے زمانے میں بھی اس سے ان بے نفس اولالعزم لوگوں کی تقلید میں عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کتاب کو بہت عزیز رکھتا تھا اور ہمیشہ اس کے پڑھنے سے اس پر نئی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

فرانس کے عہد بیداری کے ایک دوسرے نامور مصنف "مونٹین"
کی نسبت لکھا ہے کہ وہ پلوٹارک کے مطالعہ سے بے انتہا متاثر ہوا تھا اور
اپنی کامیابی کے لیئے علاوہ دیگر یونانی فلسفیوں کے پلوٹارک کا بھی رہینِ منت تھا۔
پلوٹارک کو انسانی سیرت اور باطن کی تصویر کھینچنے میں کمال حاصل ہے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا زندہ تصویریں ہمارے سامنے موجود ہیں اور تھوڑی
دیر کے لیئے ہم خود اپنے اردگرد کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں
شکسپیر کے کلام کا مشہور نقاد "ریلے" لکھتا ہے شکسپیر جو پلوٹارک کا بہت
کچھ زیر بار احسان ہے بعض اوقات کیریکٹر (سیرت) کی تصویر اتارنے میں
پلوٹارک کے حیرت انگیز بیان کو نہیں پہونچتا۔

فردوسی بھی اس بارے میں کمال رکھتا ہے اور شاہنامے کے
پڑھنے کے بعد ہم رستم و افراسیاب، سیاوش و سہراب وغیرہ کو نہیں بھول سکتے
لیکن حُبِ وطن، کامل ایثار اور انسان کے اخلاقی کمالات کی وہ تصویریں
جو دل میں گھر کر لیتی ہیں اور جو تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کا زبردست
آلہ ہیں، اس میں نہیں پائی جاتیں۔ پلوٹارک کو اس خصوصیت میں سب پر
تفوق حاصل ہے اور جسے یقین نہ ہو وہ بروٹس لکرگس اور کینو (خرد) وغیرہ
کے حالات پڑھ کر دیکھ لے اور سوچے کہ ان اعلیٰ صفات کی حامل کوئی اور
کتاب بھی ہے۔

اگر اس کتاب کے پڑھنے کے بعد کوئی اس سے متاثر نہ ہوا اور اس کے دل میں
اخلاقی کمالات کا جوش اور ولولہ پیدا نہ ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ خدا سے خشوع وخضوع

کے ساتھ دعا مانگے کہ خدا اس کے حال پر رحم کرے!

مجھے سچی اور قلبی مسرت ہے کہ آخر یہ دلچسپ اور وقیع المنزلت کتاب جو دنیا کی امہات کتب میں سے ہے انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی اور ہمارے اہل ملک کے سامنے منجملہ پانچ جلدوں کے اس کی پہلی جلد آج پیش کی جارہی ہے۔ خدا کرے کہ اسے یہاں بھی وہی تاثیر اور قبولیت نصیب ہو جسکی وہ مستحق ہے۔

میں اس امر پر بھی خاص مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ انجمن ترقی اردو کی خوش نصیبی سے اسے مترجم بھی ایسا ہی قابل اور محقق ملا ہے۔ سید ہاشمی صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ جس جان کاہی شوق اور محنت سے کیا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے۔ اور میری رائے میں یہ اردو ترجمہ بلحاظ طرز بیان، سلاست اظہار مطالب، انگریزی ترجمے پر فوقیت رکھتا ہے علاوہ اس کے لایق مترجم نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ کتاب کے شروع میں ایک تاریخی مقدمہ (جو گویا یونان اور روما کی قدیم تاریخ کا ایک خلاصہ ہے) اضافہ کر دیا ہے جس سے اردو ترجمہ کی وقعت اور بڑھ گئی ہے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اس لئے کہ ان سوانح عمریوں میں خاص تاریخی سلسلہ نہیں ہے اور بہت سی باتیں اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتیں نہ کتاب کا پورا لطف آسکتا ہے جب تک کہ یونان و روما کی تاریخ سے واقفیت نہ ہو۔ پس یقین ہے کہ اردو خوان پبلک کے لئے یہ نہایت مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔

مقدمہ بر کتاب

جنگ روس و جاپان

(مصنفہ مولوی ظفر علی خاں صاحب)

انیسویں صدی کے نصف سے یورپ میں ایک نیا مرض چل نکلا ہے جس کا نام "جوع الارض" ہے۔ یہ مرض استسقا سے ملتا جلتا ہے۔ جس طرح استسقا کا مریض پانی پیتا جاتا ہے اور پیاس نہیں بجھتی اسی طرح اس نئے دکھ کا دکھیارا ملک کے ملک ہضم کرتا جاتا ہے اور اس پر بھی ہل من مزید کا نعرہ بلند ہے۔ اس مرض میں وہی مبتلا ہوتے ہیں جو ظرف کے بڑے اور مزاج کے کڑے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی ہوس مٹانے کے لئے وہ وہ سامان کشت و خون و جنگ و جدل جمع کیا ہے جو دیدہ نہ شنیدہ۔ فوج پر فوج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ خشکی اور تری دونوں پر پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ آلات حرب میں اصلاحیں ہو رہی ہیں۔ اور پے درپے دوسروں پر ہاتھ ڈالنے اور خون بہانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ اور رعایا ہے کہ مارے بوجھ کے دبی جا رہی ہے۔ ملک کا روپیہ نہایت بے دردی کیساتھ آپس کے کشت و خون کے لئے پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ خلق خدا جس کے پسینے کی یہ کمائی ہے بھوکوں مرے تو مرے مگر ان جابروں کی ہوس پوری

ہو کے رہے۔ دوسرے سلاطین ان کی یہ تیاریاں دیکھ کر سہمے جاتے ہیں اور ان کے پنجے سے اپنے تئیں بچانے اور جان سلامت رکھنے کے لئے مجبوراً وہ بھی اپنی فوجیں بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان اخراجات کی وجہ سے بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں مثلاً "بلگیریا" اور "سرویا" کا حال پتلا ہو رہا ہے اور قریب ہے کہ "اٹلی" اور "آسٹریا" بھی اس کا مزہ چکھیں اور اپنے ہاتھوں اپنی قبر بنائیں۔

انیسویں صدی کے نصف سے پہلے ریلوے اور تار برقی کا اجرا، وسائل نقل و حرکت کی سہولتیں، خط و کتابت کی آسانیاں، مطابع کی کثرت اور علوم و فنون کی ترقی دیکھ دیکھکر لوگ پہولے نہیں سماتے تھے اور کہتے تھے کہ فاصلہ جو کسی کے سکیڑے سکڑتا نہیں اور وقت جو کسی کے ٹالے ٹلتا نہیں اب دونوں انسان کے پنجۂ قدرت میں ہیں۔ اور یہ پیشین گوئی ہوتی تھی کہ تاریکی و ظلمت ہوا ہو گئی ہے یہ زمانہ عام امن و صلح کا ہے۔ اب دنیا میں آزادی اور فارغ البالی کا ڈنکا بجے گا۔ لیکن تہوڑے ہی عرصہ بعد زمانہ نے اُن کی آنکھیں کہول دیں اور وہ سب خیالات کافور ہو گئے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی سامان جو تہذیب و شائستگی کی جان تھا جنگ و جدال اور کشت و خون کا بھی مایۂ ناز ہے۔ وہی ریلیں وہی ٹیلگراف بلکہ بے تار کا ٹیلگراف۔ وہی مطبع، وہی قوت ایجاد و اختراع سب کے سب صرف کشت و خون ہیں اور مرنے اور مار رکھنے کا سامان ہیں۔ ان ایجادوں نے جتنی آسانی تہذیب و شائستگی کی ترقی دینے میں پیدا کی تہی اس سے کچھ کم ظلمت

وجہالت کے پھیلانے میں نہیں کی۔ یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ گذشتہ تیس سال میں دنیا نے سوائے جنگی تیاریوں میں مصروف رہنے کے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ اس سے زیادہ کوئی شرم کی بات نہیں کہ وہ زمانہ جو تہذیب وشائستگی اور ترقی علوم وفنون کی معراج سمجھا جائے اس کا سب سے بڑا کام یہ ہو کہ لوگ ایک دوسرے کا خون پینے کے لئے تیار کئے جائیں۔ غرض انسان کی دو بڑی دولتیں یعنی روپیہ اور وقت اس کی نذر ہو رہا ہے۔

صلح ہے اک حیلت سامان جنگ	کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
عہد گیتی پر نہ بھولیں کامراں	آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا اخلاق کیا ہتیار کیا	سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ (حالی)

عذر یہ ہے کہ سب کچھ ہم اپنے بچاؤ کے لئے کر رہے ہیں سچ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ سچ یہ ہے کہ یہ تقاضائے فطرت انسانی ہے کہ قوت کے ہوتے ساتے آدمی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ جہاں زور پیدا ہوا اور اس کے پھیلنے لگے۔ چنانچہ ان سلاطین نے جو "جوع الارض" کے شکار ہو چکے ہیں دنیا کو اپنا شکار بنایا۔ آس پاس دست اندازی شروع کی اور خدا کی خدائی کا ایک حصہ ہضم کر گئے۔ چھوٹے چھوٹے لقموں سے اگر قطع نظر کی جائے تو وہ موٹی موٹی آسامیاں بھی جہاں سے گذشتہ پچاس سال سے یہ جوع الارض کے مریض لقمہ تر بستر حاصل کر رہے ہیں تعداد میں کچھ کم نہیں ہیں۔ مثلاً سب سے بڑی مریضہ دولت برطانیہ ہے۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ یہ درحقیقت مصر کی خالہ بن بیٹھی ہیں۔ اور محض از راہ ہمدردی اس مرنے تا ترسے بچے کے

رکھ رکھاؤ اور دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ خیر یہ تو تھا ہی بیٹھے بیٹھے سوڈان
پر ایک ہاتھ ایسا مارا کہ صفایا کر دیا۔ اس میں کہنے کو مصر بھی شریک ہے۔ ادہر
ہندوستان میں برہما کا الحاق ہوا اور برار کا پٹہ دوامی حضور نظام سے حاصل
کیا۔ افریقہ میں ٹرانسوال سے وہ کشتم کشتا ہوئی کہ الاماں الحفیظ خون کی ندیاں
بہہ گئیں مردوں کے پشتارے لگ گئے مگر نہ چھوڑا اور آخر لے کے چھوڑا۔
آرنج فری اسٹیٹ بھی اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور حکومت انگریزی
میں شامل ہو گئی۔ جزیرہ قبرس کو لارڈ بیکنس فیلڈ نے جو مرجوع الارض کا
بہت بڑا مریض گزرا ہے بہ زمانہ برلن کانفرنس ٹرکی سے معاہدہ کر کے ہتیا لیا
تھا۔ اس کا اصلی منشا یہ تھا کہ اسے فوجی پڑاؤ بنائے کیوں کہ ان دنوں فرانس
کا ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں مصر پر فوج نہ بھیجدے۔ دولت فرانس اگرچہ جمہوری
سلطنت ہے مگر پڑوس کا اثر کہئے یا زمانہ کا یہ بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گئی
اور ٹیونس دبا بیٹھی اور ادہر انڈو چائنا کی عنان انتظام اپنے ہاتھوں میں
لے لی۔ یہاں تک کہ انام، کوچن چائنا، کمبوڈیا اور ٹانکن جو پہلے خود مختار
ریاستیں تھیں اپنی خود مختاری اُس جمہوری سلطنت کی نذر کر چکیں جس نے
چار دانگ عالم میں آزادی، مساوات، اخوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ روس جو
اس مرض کے طفیل حیوان ناطق سے حیوان مطلق ہوتا چلا جاتا ہے اور جو
اپنی حرص اور سخت جانی اور ایذا رسانی میں کسی طرح خرسِ کوہی سے کم نہیں
بسر آبیا اور آرمینا کے شمالی صوبے آخر ڈکار ہی گیا۔ ادہر وسط ایشیا میں وہ
ہاتھ پاؤں پھیلائے کہ افغانستان تک ڈنڈا جا ملایا۔ دوسری طرف مشرق

الاقصی میں تاطم مچاتا ہوا منچوریا میں جا براجا۔ جرمنی نے جو اس مرض کا تازہ شکار ہے ایک طرف زنگبار میں اور دوسری طرف کیوچیو میں (چین) جا جھنڈا گاڑا۔ اور ننھے ینڈرکی کو بھی زکام ہوا۔ اور اسٹریا اور اٹلی بھی چلیں ہنس کی چال۔ ایک نے بوسینا اور ہرزی گوینیا انیٹھ لیا اور دوسری نے مسادا اور اٹلی نے بے چارے ابی سنیا (حبش) کا ٹینٹوا دبا ہی دیا ہوتا مگر وہ تو پہلے کو آڈووا پر ایسی منہ کی کہائی کہ آدہا مرض جاتا رہا۔ بلجیم بھی کوئی سلطنت میں سلطنت ہے۔ یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہوگئی اور گو نام کو نہ سہی مگر حقیقت میں کانگو فری اسٹیٹ پر قابض ہے۔ اور تو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ جس نے لڑکر اور خون بہاکر اپنا پیچھا چھڑایا اور آزادی حاصل کی تہی اور جس کے نام سے آزادی امن صلح تہذیب و شائستگی کا بول بالا ہے افسوس ہے کہ اس میں بھی اس منحوس مرض کے آثار نظر آرہے ہیں۔ پچھلے دنوں بیٹھے بٹھائے اسپین سے جہونہ ہوگئی۔ تہوڑی سی لپاڈکی کے بعد اسپین تو بہاگتا نظر آیا اور اس آزادی کی ملکہ نے کیوبا، پوانٹوریکو، اور فلپائن کو مال غنیمت سمجھ کر پچالیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچ گئی تو پھر باقی کیا رہا۔ بے چارہ افریقہ جسے برِ ظلمات کا خطاب عطا ہوا ہے ان شہسواروں کا جولان گاہ بلکہ شکارگاہ ہے۔ جس قوم نے اس بدنصیب ملک سے غلامی کو مٹایا اس نے بہت بڑا احسان کیا۔ صرف ان مظلوموں ہی پر نہیں بلکہ تمام بنی نوع آدم پر۔ مگر یہ کیسی بھلائی۔ اور کہاں کا احسان ہے کہ اس کے بعد ہی اس غریب کا تکا بوٹی کر ڈالا اور اب تک نوچا نوچی اور لوٹ کہسوٹ مچ رہی ہے اہل یورپ نے

قریباً سارے ملک کے حصے بجزے کر لئے ہیں اور جو ایک آدھ حصہ باقی ہے وہ چند روز کا مہمان ہے۔

یہ مرض متعدی بھی معلوم ہوتا ہے۔ پادشاہ اور بڑے بڑے مدبرین سلطنت تو خیر اس میں پھنسے ہی تھے اور پھنس رہے ہیں مگر تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ اچھے اچھے حکیم اور فلسفی، فاضل مورخ اور ادیب بھی اس کے اثر سے نہ بچے۔ یہ بزرگ بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ آنکھیں بند کر کے اسی ڈھرے پر پڑ لئے اور اس دماغ سے جس میں اس مرض کے جرم گھس بیٹھے ہیں نئے نئے اصول اور مسائل اختراع کئے اور وہ طومار باندھا کہ ایک دنیا انہیں کی ہاں میں ہاں ملانے لگی اور حکمت و فلسفہ، تاریخ و تمدن انہیں من گھڑت اصول پر قائم کر لئے خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ۔

۱۔ تمدن ہمارا۔ تہذیب ہماری۔ باقی سب وحشت اور جہالت ہے۔

۲۔ بنی نوع انسان کی گوری چٹی نسل (اہل یورپ و امریکہ) آب و ہوا کی خنکی، شکل و شمائل کی خوبی، رنگ و روپ کی صباحت۔ قوائے جسمانی و دماغی کی توانائی اور سلیم الطبعی، عالی ہمتی، مستقل مزاجی، جدت طرازی اور مستعدی کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ دنیا کی رہنما اور پیشوا بنے۔ بہ خلاف اس کے کالے پیلے انسان نما حیوان (اہل ایشیا و افریقہ) آب و ہوا کی گرمی، شکل و شمائل کی زبونی، رنگ و روپ کی تیرگی و زردی۔ قوائے دماغی و جسمانی کی کمزوری اور حدت ذہن، پست ہمتی، تلون، تقلید، کاہلی اور سریع الاعتقادی کے اعتبار سے اس لائق ہیں کہ اہل مغرب کے محتاج

اور دست نگر رہیں۔

۲۔ ہم (اہل یورپ) اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ دنیا پر حکومت کریں۔ اور تہذیب کی روشنی پھیلائیں اور اہل مشرق کے خلق سے یہ منشار ہے کہ وہ ہمارے غلام ہو کے رہیں اور ہم سے تہذیب و انسانیت کا سبق سیکھیں۔

۳۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ جہاں کہیں ہم دیکھیں کہ جہالت کی ظلمت چھا رہی ہے انصاف و عدل کا خون ہو رہا ہے یا حکومت وحشیانہ ہے وہاں ہم فوراً پہنچیں جہالت اور وحشت کا خاتمہ کر دیں۔ اور اُن اصول پر حکومت کا ڈول ڈالیں جنھیں ہم بنی نوع انسان کے حق میں مفید اور بہتر سمجھتے ہیں۔

یہ اُن لوگوں کے اصول متعارفہ ہیں اور اُنہیں کو مد نظر رکھ کر بڑے بڑے مورخ اور فلسفی دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے عجیب عجیب اور طرح طرح کے نتائج مستنبط کرتے اور فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ بن آئے کی بات ہے۔ وہ کیا ہم خود قائل ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ان لن ترانیوں کو سن کر مولانا حالی کا یہ شعر خود بخود زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احساں ہمیں

لیکن ایک اور لطف یہ ہے کہ اصول اصول میں فرق ہے جو۔ اشعر
جو اصول ہم پر عائد ہوتے ہیں اور جن کی بدولت ہمیں بہت کچھ

پڑتی ہے وہی حالات بعینہ وہی موقع اگر کسی دولت یورپ میں آن پڑے تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور سب اصول و قواعد بالائے طاق دھرے رہ جاتے ہیں کیا خوب کہا ہے اسی بالغ نظر زمانہ شناس شاعر نے

داد طلب سب غرض ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

غرض ہمیشہ زمانہ کا چلن اسی اصول پر رہا اور ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ زبردست ہمیشہ غالب رہا اور نہ معلوم کب تک غالب رہے گا۔ جسے وہ انصاف کہے وہ انصاف ہے اور جسے وہ ظلم کہے وہ ظلم ہے۔ اور طرہ یہ کہ مارے اور رونے نہ دے۔ یہی لوگ دنیا کے رہنما اور مہذب کہلاتے ہیں اور یہی اس عالم کون و فساد کے چشم و چراغ ہیں۔ کتنے پتے کی بات کہی ہے کسی جاپانی نے کہ "اہل جاپان نے فلسفہ و ادب میں عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کر کے یورپ کے سامنے پیش کیں۔ لیکن یورپ انہیں ناشائستہ سمجھتا رہا۔ اس کے بعد انہوں نے رنگ برنگ کے سوتی اور اونی اور ریشمی کپڑے اور چینی کے برتن اور آرائش و ضرورت کے سامان کے دل پسند نمونے تیار کر کے مغربی تہذیب کے نقادوں کی خدمت میں روانہ کئے لیکن پھر بھی وہ کوڑوں اور جاہل اور غیر مہذب ہی رہے۔ آخر انہوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور ڈیڑھ لاکھ روسیان اسیف کا گلا کاٹ ڈالا۔ اس پر اُن کو فوراً تہذیب و شائستگی کا تمغہ مل گیا اور وہ دفعتہً مہذب اقوام کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔

اسی برادری کے ایک تاجدار کو جو اس منحوس مرض کا سب سے بڑا مریض ہے جو اس کی بدولت اکال الامم اور ہادم الاقوام بن گیا ہے اور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے تھوڑے دن ہوئے اس بیماری کا دورہ اُٹھا۔ اس کی حالت غیر ہوگئی اور آپے سے باہر ہوگیا۔ وہ اپنا لاؤ لشکر بری اور بحری دل بادل فوج لے کر سمندروں کو کھندلتا ہوا ایک چھوٹی سی چٹان سے جا بھڑا لیکن ٹکراتے ہی اُس کے جہاز پاش پاش ہوگئے۔ جوں جوں وہ غیظ و غضب میں آکر اس پر حملے کرتا تھا اُتنا ہی اور زک اُٹھاتا اور جتنا کھسیانا ہو ہو کر جھنپتا تھا اتنی ہی اور منہ کی کھاتا تھا۔ وہ شخص جس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کانپ اُٹھتے تھے، جس کی نقل و حرکت کی جھوٹی افواہوں سے ایک عالم میں کھلبلی مچ جاتی تھی جس کے رعب سے سلطنتوں کی قسمتیں بدل جاتی تھیں، جس کے ایک اشارہ سے ادہر کی دنیا اُدہر ہو جاتی تھی اور جس کی چین جبیں تیغ و تفنگ سے زیادہ کارگر ہوتی تھی، جو آسمانی باپ کے مقابلہ میں دنیا کا چھوٹا باپ کہلاتا تھا، وہ ایک چھوٹی سی ریاست کے ہاتھوں یوں تابڑ توڑ شکستیں کھائے اور ذلتیں اُٹھائے، خدا کی قدرت، اسی نامراد مرض نے آخر اس کے غرور کو خاک میں ملا کے چھوڑا اور اس کی ہوا و ہوس نے خود اُسے نادم کیا۔ وہ شخص جس نے دنیا میں امن و امان قائم کرنے لئے سفید علم بلند کیا تھا جس نے جنگ کے مٹانے اور صلح قائم رکھنے میں ایک عالم کو صلائے عام دی تھی اور دنیا میں ست جگ کا آغاز کرنا چاہتا تھا معلوم ہوا کہ بڑا بہروپیا تھا۔ کیونکہ اس نے محض وسوسۂ

دہوکہ دینے کے لئے اور دوسروں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے پانچ لاکھ بندگان خدا کا خون بہادیا اور اربوں روپئے پر پانی پھیر دیا۔ لیکن غرور کا سر نیچا۔ اس کا وہ لشکر جرار جو "کصیب من السماء فیه ظلمات و رعد و برق" آندہی اور طوفان۔ گرج اور بجلیوں کے ساتھ آیا تھا۔ دم بھر میں کافور ہوگیا۔ اور اس تاریکی کو پھاڑ کر مشرق سے وہ آفتاب طلوع ہوا ہے جس کی شعاعیں اہل ارض کے نشو ونما اور فروغ کا باعث ہو رہی ہیں۔

اوس کی شکست اس ذلت کے ساتھ اور جاپان کی فتح اس زور اور آب وتاب کے ساتھ ایک معمولی بات نہیں۔ یہ وہ انقلاب ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈہونڈے نہ ملیگی۔ اب زمانہ نے نیا جنم لیا ہے بہت سے پرانے اصول مٹانے پڑیں گے اور بہت سے نئے اصول بنانے پڑینگے بہت سے پرانے سبق بہلانے پڑیں گے اور بہت سے نئے سیکھنے پڑینگے واقعات کو اب دوسری نظر سے دیکھنا ہوگا اور اصول تمدن وتاریخ میں دائرۂ نظر اور وسیع کرنا ہوگا۔ یورپ کا غرور اور تکبر اب قایم نہیں رہ سکتا۔ اور اگر رہا تو وہ خود مٹ کے رہے گا۔ مشرق میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی ہے جس نے کلہ بہ کلہ یورپ کے قوی ہیکل دیو سے مقابلہ کرکے اسے زیر کیا ہے اب اس سفید دیو کی لاش خون آلودہ خاک میں پڑی سسک رہی ہے وہ مرض جس کے ہاتوں یورپ لاچار تھا اور جس کے زور میں وہ بڑہ بڑہ کر قدم مار رہا تھا۔ اس کا علاج بحر الکاہل کے کنارے ایک جزیرہ میں ہوا

اور پیٹ پر عمل کرنے کے بجائے ڈاکٹر مکاڈو نے مریض کی چاند پر ٹیکا لگایا۔ کیونکہ اس مرض سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور یہ وہی قدیم مشرقی علاج ہے جو صدیوں پہلے نمرود کے سر پر کیا گیا تھا۔ جاپان جیسا جنگ میں افضل رہا ویسا ہی صلح میں بھی۔ اور جنگ اور صلح اور شجاعت اور علم دونوں کا سہرا اسی کے سر رہا۔ جس طرح اس کی بہادری اور حب الوطنی نے اہل عالم کو دنگ کر دیا تھا اس سے زیادہ اس کی فراخ حوصلگی اور صلح جوئی نے ساری دنیا کو ششدر و حیران کر دیا۔

یہ مریض کچھ تو اس کے دھچکے سے پہلے ہی ضعیف اور ناتوان ہو گیا تھا۔ ادھر اس کے گھر میں نفاق و جنگ و جدل کا طوفان بپا ہو گیا چھوٹے باپ کے سعادت مند فرزندوں نے علم مخالفت بلند کر رکھا ہے۔ سارے ملک میں کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ وہ جبر و تعدی اور ظلم و ستم سہتے سہتے تنگ آ گئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس بات پر کمر باندھ لی ہے کہ یا تو آزادی حاصل کریں یا جان دے دیں۔ زار ہے کہ سہا جاتا ہے اور آئے دن نئی بلا اور مصیبت کا سامنا ہے۔ رعایا بغاوت پر تلی ہوئی ہے چھوٹے بڑے سب آزادی آزادی پکار رہے ہیں۔ زار اور اس کے وزیر بے کس اور بے بس ہیں۔ ہزار وعدہ کرتے ہیں مگر یقین کسے آئے، ان کی نالائقی اور جابرانہ سلوک نے انہیں اس قابل نہ رکھا کہ ان کی بات باور کریں۔ فوج اور پولیس ہزار روکتی اور تھامتی اور گولیوں کا نشانہ کرتی ہے مگر وہ مادّہ جو لاوے کی طرح زمین سے اُبل رہا ہے چند قزاقوں کی

اور چند قرابینوں کی ٹھائیں ٹھائیں سے کہیں رُکتا ہے ؛ لیکن باوجود اس شریف مقصد کے جس کے پیچھے وہ جان و مال قربان کر رہے ہیں ۔ انہوں نے اس عزت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جو بہ حیثیت یورپین ہونے کے انہیں حاصل ہے یعنی ظالم گورنمنٹ کی مخالفت کرتے کرتے وہ اپنا ریخ دغصہ ایک بے کس مشرقی قوم پر نکال رہے ہیں ۔ غریب یہودی چن چن کے قتل کئے جا رہے ہیں ۔ ان کے گھر بار لٹ گئے ۔ سینکڑوں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوگئیں خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہوگئے ۔ عراقی پر بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھے ۔ گورنمنٹ کا وہ حال رعایا کی یہ کیفیت ۔ اب اس ظالم مظلوم نما مریض یعنی زار روس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اپنی خون خواری سے باز آئے ۔ ظلم و تعدی کے زمانے کو خیرباد کہے ۔ اپنے جابرانہ اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ امن و صلح کا اعلان کرے ۔ رعایا کو واجبی حقوق اور آزادی عطا کرے ۔ ہاتھ کو روکے دل کو قابو میں رکھے اور اُس بری گھڑی کو یاد کرکے پچتائے جب جاپان پر دست درازی کا قصد کیا تھا ۔

مگر اے بدنصیب ملک تجھے بھی کچھ خبر ہے ؛ خدا کی خدائی بدل گئی زمین و آسمان بدل گیا ۔ اصول و آئین بدل گئے اور تو ہے کہ ویسا ہی سکون پسند اور لدھڑ نظر آتا ہے جیسا پہلے تھا ۔ گو تجھ میں بھی ایک سُرسُری سی پیدا ہو چلی ہے مگر کہاں یہ خفیف سی جنبش اور کہاں وہ قیامت کی حرکت کہ جس سے لاکھوں کے وارے نیارے ہوگئے ۔ ممالک میں تہلکہ پڑگیا ۔ سلطنتوں کی پالیسیاں بدل گئیں ۔ تعلقات میں فرق آگیا ۔ حکومت کا رُخ

پھر گیا۔ مغرب مشرق اور مشرق مغرب بن گیا۔ جو آگے تھے وہ پیچھے ہٹ گئے اور جو پیچھے تھے وہ آگے بڑھ گئے اور ایسے بڑھے کہ زمین سے آسمان پر پہنچ گئے۔ جہاں وہ شجاعت اور شہرت کے ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں اور اپنی نورانی شعاعوں سے اوروں کو بھی منور کر رہے ہیں۔ اس کا ذکر خیر تیرے ہاں بھی ہے اور چرچے بھی بہت کچھ ہو رہے ہیں۔ لیکن خالی باتوں سے کیا حاصل۔ لڈو کہنے سے کہیں منہ میٹھا ہوتا ہے؟ تجھ میں جوش نہیں تیرا دل بجھا ہوا اور مُردہ ہے۔ اور جوش ہو کہاں سے؟ اِس لئے کہ تجھ میں حب وطن نہیں اور اس کے لئے ضرورت ہے تحریک کی اور تحریک بھی کیسی؟ جو برقی قوت کی طرح جوڑ جوڑ اور ریشے ریشے میں حرکت پیدا کر دے۔

ہمارے خیال میں کوئی تحریک اوس عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعہ سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی جو ہمارے پڑوس میں جو ایک چھوٹے سے جزیرہ والوں سے ظہور میں آیا ہے۔ یہ ہماری عین خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسا انقلاب انگیز واقعہ ہماری زندگی میں واقع ہوا جس کے طفیل ہم اپنے دماغ میں اس خیال کے لانے اور اپنی زبان سے یہ الفاظ کہنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ "جب ہمارے بھائی بند اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو اگر ہم دل پر رکھ لیں تو کیا کچھ بھی نہیں کر سکتے؟"

مگر اے تیرا کاہل تجھ میں جوش اور حرکت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟

کیا وہ خونخوار اور ہیبت ناک جنگ روس و جاپان تیری آنکھوں کے سامنے پانی پت کے میدان پھر قائم کی جائے؟ کیا اون بہادر محب الوطنوں کے

سینوں میں سے دل نکال کر تیرے سامنے لائے جائیں کہ دیکھ اپنے ملک کی محبت میں یہ کیسے پھڑک رہے ہیں۔ یہ سب وہم و گمان ہے ہاں البتہ ایک تدبیر ممکن ہے۔ ادب نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ ہنستوں کو رلانا اور روتوں کو ہنسا دینا دشمن کو دوست دوست کو دشمن بنانا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ بگڑی بات کا سنوارنا اور صاف سیدھی بات کا بگاڑ دینا اس کا ایک کھیل ہے۔ ایک ذرا سی بات میں ہزاروں کا سر کٹوا دینا اور لاکھوں کا خون بہا دینا اور ایک کلمہ میں پشتینی مخالفوں اور جانی دشمنوں کی جھٹ پٹ صلح کرا دینا اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تلواروں کا مقابلہ زبان سے اور تیروں کا مقابلہ قلم سے کرتا ہے۔ اور اپنے زور سے جدھر چاہتا ہے دنیا کو کھینچ لے جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی قسمیں ہیں اور درجے۔ نظم ہے۔ نثر ہے اور ان کی بھی بیسیوں قسمیں۔ اور اس پر اپنی اپنی طبیعت اور اپنا اپنا دماغ۔ لیکن ان سب میں موثر اور کارگر اگر کوئی ہے تو ڈراما ہے۔ جو دنیا کی مختلف حالتوں اور انسان کی مختلف کیفیتوں کو اس خوبی سے دکھاتا ہے کہ نقل میں اصل کا مزہ آجاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل میں وہ مزہ نہیں آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالطبع نقل کرنے اور نقل دیکھنے سے خوش ہوتا ہے۔ مثلاً وہی شئی یا بات جو روزانہ دیکھنے یا سننے میں آتی ہے جب ہم کسی تھیٹر میں اس کی نقل ہوتے دیکھتے ہیں تو جتنی وہ اصل کے مطابق ہوتی ہے اسی قدر اس میں لطف آتا ہے۔ غرض رنج و الم۔ عیش و عشرت۔ نکبت و اقبال۔ کمال و زوال سب کی تصویریں سامنے کھنچ جاتی ہیں۔ اور یہ معلوم

ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ واقعات ہمارے سامنے گزر رہے ہیں۔ جو لوگ ڈراما
کے کرنے والے ہیں اون کی حالت صورت، بول چال، لباس سب کے سب
ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جن باتوں کو ہم اپنی زبان یا صرف قلم
اور فصاحت کے زور سے بار بار جتانا چاہتے ہیں وہ سب مرحلے ڈراما کے
ایک ایکٹ میں طے ہو جاتے ہیں۔ جہاں انسان کی اور تمام قوتیں قاصر
ہیں وہاں اس کا جلوہ برقی لہر کا کام کرتا ہے۔ عالم، جاہل، بچے بوڑھے سب
پر اس کا اثر جادو کا سا ہوتا ہے۔ نصیحت بہت ناگوار اور تلخ ہوتی ہے لیکن
یہاں آکر ایسی شیریں اور پُر لطف ہو جاتی ہے کہ جو اس سے بھاگتے تھے
وہ خوشی خوشی اس کے سننے کے لئے دوڑے آتے ہیں۔ کوئی واعظ کوئی
فصیح مقرر یا لکچرار اپنے کلام اور فصاحت سے اتنا اثر نہیں ڈال سکتا جتنا
ڈرامے کے چند ایکٹ۔ خصوصاً جب واقعات ایسے حیرت افزا اور جوش
انگیز ہوں جن سے قوموں کی قوموں میں انقلاب پیدا ہو گیا ہو۔ خیالات
کی ترتیب بدل گئی ہو اور سونے میں سہاگہ یہ کہ ان واقعات کا لکھنے والا
ایسا ہو جس کے قلم میں زور اور تاثیر ہے اور جسے نظم و نثر میں یکساں کمال ہے۔

اس ڈرامے میں اقبال و ادبار کی سچی تصویریں کھینچی ہیں ایک
طرف حب وطن، شجاعت جوش اور غیرت کا زور ہے اور دوسری طرف
غرور و تکبر، اسراف و گزاف، ذلت و نکبت کے آثار ہیں۔ غرض جنگ کی ابتدا
سے انتہا تک سارے واقعات ڈرامے کے پردہ میں اس خوبی اور بے تکلفی
اور پُر زور اور پُر جوش نظم و نثر میں تحریر کیے گئے ہیں کہ ممکن نہیں کہ آدمی پڑھے

اور اس کے دل میں جوش اور غیرت موج زن نہ ہو۔ محبت جو حقیقی زندگی میں بھی اسی طرح جلوہ فگن ہوتی ہے جیسے فسانوں اور ڈراموں میں، وہ اس خوں ریز جنگ و جدل اور کشت و خون میں بھی عجیب طرح سے اپنی جھلکی دکھا گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا قلب ہی بجائے خود ایک عالم ہے جس میں ہزاروں کیفیات اور جذبات بستے ہیں۔ اور ایک ذرا سے اشارہ پر اپنا کرشمہ دکھا جاتے ہیں۔ کیسا پُر زور ہونا چاہیے وہ قلم جو ان تمام کیفیات کو اس طرح بیان کرے کہ تصنع کا نام نہ ہو۔

.. مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جنگ و جدل، معرکہ آرائی، شجاعت و تہور، خدعتہ و تدبیر، گھمسان خوں ریزی، حسن و عشق کی گھاتیں، حریفوں کی چالیں، شکست و فتح، صلح و امن ان سب کارناموں کا ایسا صحیح خاکہ کھینچا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم خود اس میں شریک ہیں۔ علاوہ اس کے یہ اردو میں ایک بے نظیر اور انوکھی تصنیف ہے۔ مصنف نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جس کی ملک کو ایسے وقت میں سخت ضرورت تھی۔ اس سے ہمیں عبرت اور سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ایک چھوٹی سی قوم بہت تھوڑے عرصہ میں ایسی ترقی کر لے کہ بڑے بڑے ترقی یافتہ اقوام دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں ایک پدا شہباز کا شکار کرے ایک بونا دیو کو پچھاڑ دے ممکن ہے کہ یہ سب کچھ پڑھ جائیں اور ترقی کا خیال پیدا نہ ہو؟ ہمیں جنگ کی ضرورت نہیں، جہاد کی حاجت نہیں، ہاں ہے تو جہاد اکبر کی ضرورت ہے دیو نفس کو پچھاڑیں اس کے کھوٹ چن چن کے نکالیں۔ خود غرضی، نفاق اور سستی

وکالت کو پاس نہ آنے دیں اور ایک ایسی سلطنت کے زیر عاطفت جس سے بڑھ کر امن جو، صلح پسند اور ہمدرد اس زمانہ میں ملنا ناممکن ہے، ترقی کی راہیں نکالیں، زمانہ کی رفتار کو سمجھیں اور اس بام رفعت پر چڑھنے کی کوشش کریں جہاں پہنچے بغیر ممتاز ہونا محال ہے کیا ممکن نہیں کہ وہ ملک جو ہمیشہ سے علوم و فنون اور صنعت و حرفت میں مشہور اور ضرب المثل ہے ہماری کوشش اور اتحاد سے اپنی قدیم عزت اور عظمت کو پھر حاصل کر لے؟ ممکن ہے مگر کب؟ جب ہم میں دل ہو، دل میں عزت، ہمت اور جوش ہو اور جوش میں قیام اور ثبات ہو۔

گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

حیدرآباد دکن
۱۵ ر نومبر ۱۸۹۰ء

سوانح

حیات النذیر

گلشن ہند

مآثر الکرام

مخزن نکات

چمنستان شعرا

مقدمہ حیات النذیر

مؤلفہ مولوی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم

یہ بھی اُردو علم ادب کی ترقی کی علامت ہے کہ مشاہیر ملک وملت کے حالات پر بھی بہت سی اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں اب تک زیادہ تر اُن قدما کے حالات لکھے گئے ہیں جو بلحاظ تقدس و دیگر کارہائے نمایاں پہلے ہی سے ہیرو سمجھے جاتے ہیں اور جن کے سوانح قدیم عربی کتب میں جا بجا پائے جاتے ہیں یا اون کے متعلق مستقل کتابیں موجود ہیں اور اون کی عزت و وقعت صدہا سال سے ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ ان مؤلفین کو یہ آسانی ہوتی ہے کہ مواد تیار ملتا ہے البتہ مختلف کتابوں سے حالات جمع کرنے اور ترتیب میں اول بدل کرکے اردو زبان میں پیش کرنے کی زحمت ضرور گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کتابوں کی ترتیب عمدہ اور زبان فصیح ہوتی ہے تو ان کا مقبول ہونا کچھ مشکل نہیں ہوتا کیونکہ وہ لوگ پہلے ہی سے مقبول خاص و عام ہیں۔ مگر ہمعصر مشاہیر کے حالات کا لکھنا اس کے مقابلہ میں بہت کٹھن ہے اولی تو تمام حالات کا جمع کرنا اور مختلف واقعات اور بیانات کی چھان بین کے

بعد کیرکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ہی ایک ایسی دشواری ہے جسے اُسی کا جی جانتا ہے
جسکو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہے، دوسرے صد ہا شخص ایسے
زندہ موجود ہیں جو اُس نامور شخص کے خیالات سے آگاہ ہیں اور اُنہوں نے
اس کو مختلف حالات میں دیکھا ہے اور اس کے متعلق خاص رائے رکھتے
ہیں۔ سوانح نگار جانتا ہے کہ اوسکی کتاب موافق و مخالف ہر دو گروہ کے
ہاتھ میں جانے والی ہے اور اس لئے طعن و تشنیع کی زد سے بچنے کے لئے
بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ مؤلف حیات النذیر نے ہماری قوم کے ایک
علامہ کا قول نقل کرکے آجکل کے طریقہ تحریر سوانح عمری کو "پُر فریب" بتایا ہے
اور اوس پر پُر زور بحث کی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون ایسا زمانہ تھا
جبکہ یہ پُر فریب طریقہ رائج نہ تھا۔ علامہ موصوف کو کبھی کسی ہمعصر نامور شخص
کی (بشرطیکہ وہ کسی ہمعصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق
نہیں ہوا ورنہ انہیں اس سے زیادہ دشواری پیش آتی جو ہماری زبان
میں بہتر سے بہتر "سوانح عمری" لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ اُنہوں نے
اب تک انہیں قدماے کرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے جنہیں لوگ ایک
زمانہ سے پوجتے آتے ہیں اور جنکی تنقید اور نکتہ چینی کتب کے حوالہ تک
محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف کی تالیفات اس
"پُر فریب طریقہ" سے پاک صاف ہیں۔

بات یہ ہے کہ بڑے آدمی کی بڑائی صرف اوسکی ذات تک محدود
نہیں ہوتی بلکہ اس کے تعلقات اگردوپیش کے حالات اور قومی و ملکی معاملات

شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد مرحوم ہماری قوم میں ایک ایسے فرد بے نظیر گزرے ہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور کم سے کم جب تک اردو زبان زندہ ہے اُن کا نام بلاشبہ زندہ رہے گا۔ وہ محض اپنی محنت و استقلال اور قابلیت سے دنیا میں بڑھے اور ایک معمولی غریب شخص سے امیر اور ایک ادنیٰ طالب علم سے اعلیٰ درجہ کے فاضل ہو گئے۔ ان کی زندگی سیلف ہلپ (اپنی مدد آپ کرنے) کی ایک نمایاں اور روشن مثال ہے۔ انہوں نے طالب علمی سے زندگی شروع کی اور آخر عمر تک معلم رہے اُن کی تعلیم ان کی تصانیف کے صفحات میں موجود ہے۔ ان کا بڑا کام اصلاح معاشرت (سوشل ریفارم) ہے یعنی یہ کہ دنیا میں خوش کامیاب اور بے لوث زندگی کیونکر بسر کرنی چاہیئے۔ ایک بڑا کمال ان کی تصانیف میں یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی، سائنٹفک اور خاص کر اسلامی خاندان کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اسی کے خاندان کے بستر سے تو نہیں کھل رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے اُردو میں ایسے ایسے باکمال انشاپرداز ہوئے اور اب بھی زندہ موجود ہیں جو اُردو زبان اور اپنی قوم کے لئے باعث فخر ہیں مثلاً کسی نے تاریخی واقعات کی چھان بین کر کے عجیب حالات کا انکشاف کیا ہے کسی نے دربار شاہی کی شان و شوکت یا جنگ کے خونریز منظر کا موقع کھینچا ہے کسی نے قوم کے گذشتہ جاہ و جلال پر فصاحت کے دریا بہا دیئے

ہیں کسی نے قومی ادبار و ذلت پر پُر درد نوحہ پڑھا ہے۔ لیکن روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں انکا بیان کرنا مولانا ئے مرحوم پر ختم ہے اور بیان بھی کیسا! ایسا پر لطف ایسا سچا اور سلجھا ہوا کہ دل میں کھب جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں آجائیں۔ ایک وسیع اور عظیم الشان منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں صحرا بھی ہو دریا بھی ہو آسان ہے لیکن انسانی خصایل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اوپری نظر جو بیرونی اشیا تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اُسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بدرجہ اکمال موجود تھی۔

مولانا کا احسان تعلیم نسواں پر بھی کچھ کم نہیں بلکہ میرے خیال میں حامیان تعلیم نسواں کی تقریروں، لکچروں، تحریروں اور قیام مدارس سے کہیں بڑھکر ہے۔ ان لوگوں نے پڑھنے کی ترغیب دی اور اس کے وسائل بہم پہونچائے مگر مولانا نے لڑکیوں کو پڑھنا سکھایا اور یہی نہیں بلکہ پڑھنے میں جو ایک مزہ ہے وہ دلوں میں پیدا کیا۔ مرحوم اگر سوائے مراۃ العروس کے کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے باکمال انشا پرداز مانے جاتے اور ان کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔ ایک بڑی خوبی اسمیں (اور ان کی دوسری کتابوں

میں بھی) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور ان کے خیالات کو ہو بہو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ خود عورتیں قائل ہو جاتی ہیں۔ یہ بات سوائے مرحوم کے اردو کے کسی دوسرے مصنف کو حاصل نہیں۔

مولانا اپنی طرز تحریر کے آپ موجد تھے اور یہ انہیں کی ذات سے مخصوص ہے اس میں بڑی بے تکلفی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ انشا پرداز کو بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ جو خیال اوس کے دل میں آیا ہے اُسے اُسی قوت اور شان کے ساتھ الفاظ میں ادا کرے اور اسی لئے اُسے اکثر اوقات تشبیہہ و استعارات سے کام لینا پڑتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو کبھی ایسی دقت محسوس نہیں ہوئی وہ کبھی تشبیہہ و استعارات سے کام نہیں لیتے اور ایسے ٹھیٹ جاندار اور چپاں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اُن سے بہتر اس خیال کے اظہار کے لئے سمجھ میں نہیں آتے۔ زبان پر انہیں اسقدر قدرت حاصل تھی کہ شاید آج تک کسی اردو انشاپرداز کو نصیب نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ ان کا خیال کبھی تشنہ نہیں رہتا۔ آمد کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے ان کی طبیعت قدرتی طور پر پُرزور واقع ہوئی تھی اور یہی زور اُن کے تمام خیالات اور الفاظ میں ہے، جو قوت اور زور ہم نے ان کی عبارت میں دیکھا ہے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ انہیں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہیر پھیر یا تشبیہات و استعارات سے اپنا مافی الضمیر ادا کریں وہ اسی زبان میں سے جسے ہم روزمرہ بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ایسے الفاظ نکال لاتے تھے کہ

گویا وہ اسی خیال کے ادا کرنے کے لئے بنے ہیں اور پھر اس پر ظرافت سونے میں سہاگے کا کام دیتی ہے۔ ان پر یہ اعتراض کیا گیا ہے اور وہ ایک حد تک بجا اور صحیح بھی ہے کہ وہ بعض اوقات رکیک اور مبتذل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو وہی ہے جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں یعنی وہ ہیر پھیر اور تشبیہات و استعارات سے کام لینا نہیں جانتے تھے دوسرے طبیعت قدرتاً واقع ہوئی تھی پُر زور وہ اپنے خیال کو اسی زور اور شان کے ساتھ ادا کرنے کے لئے الفاظ کی پروا نہیں کرتے تھے جن الفاظ میں ان کا اصلی خیال صحیح طور سے ادا ہو سکتا اُن کے استعمال میں کبھی نہ چوکتے تھے اور یہ فعل ان کا کوئی ارادی نہ تھا بلکہ طبیعت کی اقتضا ہی ایسی تھی اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت میں آورد نہ تھی بلکہ سراسر آمد تھی علاوہ اس کے آدمی تھے صاف گو اور آزاد رو، جو دل میں تھا وہ زبان پر اور اوپر سے شوخی وظرافت اور غضب تھی یہی وجوہ ہیں کہ ان کی ایک کتاب پر اسقدر شور وغل مچا۔

مرحوم جیسے اعلیٰ درجہ کے محرر تھے ویسے ہی مقرر بھی تھے لوگ ان کے لیکچروں میں اس طرح ٹوٹے پڑتے تھے جیسے قحط کے مارے کھانے پر گرتے ہیں ہم نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں خود دیکھا ہے کہ گرمی کے دن ہیں دوپہر کا وقت ہے ہزاروں بندگان خدا دھوپ میں بیٹھے ہیں مگر کیا مجال کہ پہلو تک بدلیں۔ کلام میں تاثیر بھی وہ تھی کہ جب چاہا ہنسا دیا اور جب چاہا رولا دیا۔ آواز بھی ایسی ملی تھی کہ سب جگہ یکساں پہونچتی تھی

اور اس میں ایک خدا داد اثر تھا۔ شوخی و ظرافت خود محل کر اون کے لکچر[illegible] میں دیکھنے اور سننے کے قابل تھی۔ ایسا اعلیٰ درجہ کا مقرر ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا وہ ساری مجلس پر چھا جاتے تھے [illegible] تھی جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ مسٹر پاسین [illegible] نے لکھی [illegible] وہ بالکل صحیح اور بے مبالغہ ہے۔ انجمن حمایت اسلام، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مدرسہ طبیہ دہلی ہمیشہ اون کے لکچروں کے [illegible] احسان رہیں گے۔ ان کے لکچروں کے متعلق یہ اعتراض کیا [illegible] وہ کہیں کے کہیں چلے جاتے تھے یہ اعتراض شاید کسی [illegible] ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسی اُن کی طبیعت ان کی تحریر ان کی عبارت ان کے الفاظ اور اُن کی تقریر پُر زور تھی ویسے ہی اُن کا خیال بھی پُر زور تھا اور تخیل کے پرواز میں دور تک پہنچتے جاتے تھے لیکن اتنی دور نہیں کہ نظر سے غائب ہو جائیں جولانی طبع انہیں ادہر سے ادہر ضرور لے جاتی تھی لیکن تاہم مبحث کے آس پاس ہی رہتے تھے۔

ہمارے اس زمانے کے اہل قلم سوائے ایک دو کے زیادہ تر ترجمان ہیں، انگریزی کے یا عربی کے۔ مگر مرحوم میں جدت پائی جاتی ہے اور وہ اپنے خیالات اور تحریرات کے لیے کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہیں اور یہ اُن کی اعلیٰ دماغی کی بہت بڑی دلیل ہے ان کی اصل تصانیف اُن کی جدت طرازی اون کے پر زور تخیل اور مشاہدہ کے نتائج ہیں وہ نقل نہیں ہیں بلکہ اصل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ انوکھی اور دلاویز

ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ مقبول خاص وعام ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ جو لوگ اُردو سیکھنا اور اپنے خیالات انگریزی نما اُردو میں نہیں بلکہ ٹھیٹ اردو میں ادا کرنا چاہتے ہیں اون کے لئے مولانا کی تصانیف کا مطالعہ ازبس ضروری اور مفید ہے کیونکہ اپنے خیال یا مافی الضمیر کی صحیح تصویر الفاظ میں کھینچنا ان پر ختم ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا پورا پورا تتبع کریں کیونکہ یہ نہ صرف مشکل ہے بلکہ شاید مفید بھی نہو لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم ان کی تصانیف کے مطالعہ سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اِس جدید زمانے میں مسلمانوں میں جتنے سربرآوردہ لوگ ہوئے ہیں خواہ وہ کسی خیال اور کسی رنگ کے ہوں سر سید سے لیکر شمس العلماء مولانا شبلی تک (باستثناء شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ مرحوم) سب میں زیادہ تر دینی لگاؤ تھا اون کی تان دین ہی پر ٹوٹتی ہے اور یہی اون کے خیالات اور اعمال کا مرکز ہے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کا بھی یہی حال تھا گو تو ان کی اکثر تصانیف میں یہ لگاؤ نظر آتا ہے لیکن اُنھوں نے خاص خاص کتابیں مثلاً مرویاے صادقہ، اجتہاد، الحقوق والفرائض، امہات الامہ لکھکر اور خاص کر ترجمہ قرآن مجید سے ایسی عظیم الشان دینی خدمت ادا کی کہ مسلمان ان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان کی دینی خدمت کے متعلق یہاں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا مولف حیاۃ النذیر اسپر خوب دل کھول کے لکھ چکے ہیں۔ لیکن ترجمہ قرآن مجید کے متعلق چند الفاظ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ترجمہ کی تمام خوبیوں کا گنوانا تو میری

طاقت سے باہر ہے لیکن اس سے بڑھکر اور کیا خوبی ہوگی کہ ہزارہا مسلمان جو اب تک قرآن پاک کے سمجھنے سے قاصر تھے اب بلا تکلف قرآن کے مطالب سمجھنے لگے اور خدا کے احکام خود اسی کے کلام کے ذریعہ سے جاننے لگے اردو ترجمے اس سے پہلے بھی موجود تھے لیکن ترجمے کیا تھے الفاظ کے گورکھ دھندے تھے خاک سمجھ میں نہیں آتے تھے اور سمجھ میں آئیں تو کیونکر؛ مکھی پر مکھی مار دی تھی اور جو طبیعت پر زور دے کر کچھ سمجھے بھی تو وہ لطف فصاحت کہاں جس کے لئے قرآن سارے عالم میں مشہور ہے۔ قرآن پاک کا یہ پہلا اُردو ترجمہ ہے جس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علاوہ زبان کی سلاست اور فصاحت کے جہاں تک ممکن ہو اصل عربی کا زور اور اس کی شان قایم رہے۔ مولانا چونکہ عربی اور اُردو کے بےمثل ادیب تھے اور زبان کا خاص ذوق تھا اس لئے ترجمے میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ہونی چاہئیں بسلسل پڑھتے جائیے سارے مطالب سمجھ میں آتے جاتے ہیں اور فصاحت اور ادبیت کا لطف ایسا کہ چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اس سے بڑھکر اور دینی خدمت کیا ہوگی اور یہ صرف دینی ہی خدمت نہیں بلکہ اُردو ادب کی بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے اب تک بعض لوگ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ مولانا شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ سب ترجموں سے افضل ہے اور مرحوم کا ترجمہ اس سے لگا نہیں کھاتا۔ اس میں اب بحث کی ضرورت نہیں ہے عام مقبولیت نے ثابت کر دیا ہے کہ مرحوم کا ترجمہ ایسا مطلب خیز فصیح اور شگفتہ ہے کہ موجودہ ترجموں میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا

ایک بات میں البتہ شاہ صاحب کے ترجمہ کو فضیلت ہے اور یہ فضیلت
غالباً اُسے ہمیشہ رہے گی وہ یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر عربی الفاظ
کا ترجمہ اونہوں نے ایسے ٹھیٹ ہندی الفاظ میں کیا ہے کہ اس سے
بہتر ہو نہیں سکتا خصوصاً جہاں کہیں ایسے الفاظ آگئے ہیں کہ اُن میں اشتراک
معانی کی بحث آپڑی ہے تو اونہوں نے ہندی کے بھی ایسے ہی لفظ چن کر
رکھے ہیں کہ اون میں بھی اشتراک کا وہی لطف باقی رہتا ہے اور یہ ان کی
کمال ادبیت کی دلیل ہے۔ مگر اس کا لطف صرف ادیب ہی حاصل کرسکتے
ہیں مطالب قرآن سے اسے کچھ تعلق نہیں۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمہ
بامحاورہ فصیح اور شگفتہ ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے اس
ترجمے کے ضمن میں ایک مزے کی بات اونہتی ہے جس سے ہماری
قوم کے علما کی حالت کا پتہ لگتا ہے مولانا کے ترجمہ کا شائع ہونا تھا کہ ان پر
اعتراضات کی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ اُن حضرات
کے ترجمے بھی شائع ہونا شروع ہوئے اور اکثر یہ اعتراضات اس نیت
سے کیے گئے تھے کہ مولانا کے ترجمہ کی طرف سے لوگ بدگماں ہو جائیں
اور ہمارے ترجمے بکنے لگیں۔ افسوس اس سے قبل کسی کو ترجمہ کی ضرورت
کا خیال نہ ہوا اور اب جو مولانا کا ترجمہ شائع ہوا اور اوس کی شہرت
ہوئی تو یہ بھی لگے منہہ چڑانے لیکن مولانا کے ترجمہ کے سامنے کسی کو فروغ
نہوا اِن اعتراضات یا اسی قسم کی تحریرات میں جہاں کہیں مرحوم کا نام آتا
تو یہ مولوی مارے جلن کے اُن کے نام کے ساتھ کبھی مولوی کا لفظ نہ لکھتے

بلکہ ہر جگہ ڈپٹی نذیر احمد تحریر فرماتے تھے یہ کم ظرفی کی بات نہیں تو کیا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص باوجود عالم، حافظ اور مترجم قرآن ہونے کے بھی ان مولویوں کے نزدیک مولوی کہلانے کا مستحق نہیں جن کے علم و فضل کی ساری پونجی مسلمانوں کے ارتداد و کفر کے فتوے لکھنے میں صرف ہوتی ہے۔

بڑے بڑے نامور لوگوں پر اکثر اپنے ہمعصروں کے ہاتوں بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں مولانا بھی آخر عمر میں اس سے نہ بچے۔ امہات الامہ کا شایع ہونا تھا کہ دلی میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ مولوی تو پہلے ہی سے اُن سے جلے بیٹھے تھے ان کی بن آئی خوب جلے پھپولے پھوڑے، مخالفت میں رسالے چھپوائے، طرح طرح کے بہتان باندھے، کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی طرح طرح سے عوام کو بھڑکایا یہاں تک کہ بعض تو جان کے لاگو ہوگئے اور مرنے مارنے پر مستعد ہو بیٹھے۔ یہ غدر دلی سے اُٹھا اور دوسرے مقامات تک پہونچا۔ لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہے کہ اِس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلما کا جو اجلاس دلی میں ہوا اس میں علمائے کرام تو موجود تھے ہی اُنہوں نے باہم "سکوٹ" کرکے امہات الامہ کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کرکے ایک صاحب کے پاس رکھوادی تھیں اور بکری موقوف کرادی تھی، منگوائیں اور اپنے سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگوایا اور ان میں سے ایک مولوی نے

زیادہ تر ثواب کمانے کے لیے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کہکر آگ لگادی۔ اور یہ کے شعلوں کی. دشمنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خونخوار درندے یا سنگدل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے اگر حکومت کا ڈر نہوتا تو مولانائے مرحوم بھی اس آگ میں جھونک دیے جاتے ۔ یہ منظر قابل دید تھا، مولویوں کا یہ حلقہ زمانہ وسطیٰ کے اُن پادریوں کی یاد دلاتا تھا جنہوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ زندہ دہکتی آگ میں جھونک دیے، کڑکڑاتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال دیئے، گلوں میں پتھر باندھکر بہتے دریاؤں میں ڈبو دیے، کتوں سے پھڑوا دیے اور طرح طرح کے عذاب دے دے کر اور عجیب وغریب شکنجوں میں کس کس کر سسکا سسکا کر مار ڈالے ۔ اُن کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودہ عبرت تھا جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار تھا ۔ یہ راکھ اس قابل تھی کہ اس کی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کے شیشوں میں بند کر کے رکھی جاتی تاکہ آئندہ نسلیں اسے سامنے رکھ کر ان علمائے کرام و مصلحان ملک وملت کی ارواح پاک پر فاتحہ دلاتیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتیں۔

اس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوس سطئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی

نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجات اُخروی کا باعث ہوگی یہ اون بزرگوں کا کام ہے جنھوں نے چشم بددور مسلمانوں کی دینی و دنیوی اصلاح و فلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں جب تک انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین موٴرخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھکر محکم دلائل اور پُر زور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھکر پوری تسکین ہوگئی اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین موٴرخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے۔ مگر جب مجھے اس واقعہ کی خبر لگی اور خصوصاً جب میں نے یہ سنا کہ علامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کارخیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا اور اب تک میرا خیال ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ جلا دیا ہو۔

اس واقعہ کا ایک بہت بڑا اثر یہ ہوا کہ جب مرحوم کے فرزند رشید نے مدرسۃ العلوم مسلمانان (علیگڈھ) سے اپنے پدر بزرگوار کی یادگار قایم کرنے کی درخواست کی اور خود بھی اس میں معقول امداد دینے کا وعدہ کیا تو کالج کے سنڈیکیٹ نے بڑی ڈھٹائی سے مولویوں کے ڈر کے مارے صاف انکار کر دیا اور انکار کی وجہ مرحوم کے معتقدات قرار دی جو ان کے زعم شریف میں خلاف اسلام تھے۔ کوئی ممبران سنڈیکیٹ

سے پوچھے کہ تم کسی کے مذہب پر رائے دینے والے کون ؟ اور اس معاملہ کو مذہب سے تعلق ؟ سر ولیم میور اور ریمنڈ انلڈ جیسے لوگوں کی تو یادگار قایم کی جائے اور ایک حافظ عالم، مترجم قرآن، محسن کالج کی یادگار قایم کرنے میں یہ انکار ؟ اور انکار بھی کیسا ناروا اور شرمناک ۔ بخصوصاً جب کہ ارکان سنڈیکیٹ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کتاب احیاۃ الامۃ کو بالاستیعاب پڑھا ہو ۔ صرف مولویوں کے خوف سے گھبرا کر یہ فیصلہ کر دیا نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ کارکنان کالج میں مداہنت اور بزدلی پیدا ہوتی جاتی ہے اگر خدانخواستہ یہی حال رہا تو جس غرض سے بانی کالج نے یہ کالج قائم کیا تھا وہ فوت ہو جائیگی اور اس کا وجود بے سود ثابت ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بعد میں اپنے کئے سے پچتائے اور اس کی تلافی اس طرح کی کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مرحوم کی یادگار قایم کرنے کے متعلق رزولیوشن پاس کیا غنیمت ہے دیکھیں ہمارے علما کیا کرتے ہیں؟ تلافی تو خیر وہ کیا کریں گے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے خلاف فتویٰ نہ لکھ ماریں ۔

مرحوم کے حق میں یہ صریح بے انصافی اور سخت ظلم ہوا ہے اور مجھے امید ہے کہ انصاف پسند اصحاب اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس محسن ملک و قوم کی یادگار قائم کرنے میں سعی بلیغ فرمائیں گے ۔ ورنہ ہماری قوم پر یہ بڑا دھبا رہ جائیگا ۔

قابل مولف نے مرحوم کے کیرکٹر کے متعلق مفصل اور کافی بحث

کی ہے اس کے بعد آپ نے اپنا تحصیل حاصل ہے ... ان میں بڑی بڑی خوبیاں
تھیں اور سب سے بڑی شے ان کی معاشرت میں اعتدال اور کفایت
شعاری کی تھی جس کی آج کل ہمیں بڑی ضرورت ہے اور ہماری تمدنی اصلاح
کا بڑا دارومدار اسی پر ہے۔ لیکن اس سے حاصل؟ کیا عمر بھر کی کفایت
شعاری کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ اس کا سارا مال اولاد باہم تقسیم کر لے؟
کیا اس میں قوم کا کوئی حصہ نہیں؟ خود نہ کھایا جبکہ اولاد کھاتی پیتی اور صرف مال
ہو۔ ایثار کی تلقین کرنا اور بات ہے اور اس پر عمل کرنا اور کسی شے کا علم
عمل کے لئے کافی نہیں۔ اعمال پر تربیت اور خاص کر ابتدائی تربیت کا
بڑا اثر ہوتا ہے ابھی ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے الا ماشاءاللہ
البتہ اس زمانے میں مولوی کرامت حسین صاحب کی ایک مثال ہمارے
سامنے ہے جو ہر طرح قابل تحسین اور لائق تقلید ہے انہوں نے بھی اپنی عمر
کفایت شعاری میں بسر کی لیکن اس کے ساتھ ہی اپنا سارا اندوختہ قوم
کی نذر کر دیا۔

گذشتہ اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایام میں ترقی
اُردو کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا اس میں علاوہ دیگر تجاویز کے ایک یہ تجویز
بھی پیش ہوئی تھی کہ محسنین اُردو کی سوانح عمریاں لکھوائی جائیں۔ اس میں
مولوی نذیر احمد مرحوم کا نام بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی جب
مجھے یہ معلوم ہوا کہ مولوی افتخار عالم صاحب اس کام کو کر رہے ہیں بلکہ
کر چکے ہیں تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور حسن اتفاق سے چند ہی روز بعد

اون سے ملاقات بھی ہوگئی تو میں نے ان کی خدمت میں مبارکباد عرض کی اور اپنی بے حد مسرت کا اظہار کیا حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بڑا کام کیا اور بڑا احسان کیا ہے اور جس محنت جانفشانی اور لگاتار کوشش سے اس فرض کو انجام دیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے سوانح عمری کا حق ادا کر دیا ہے۔ مرحوم کی یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ انہیں ایسا سوانح نگار ملا جس نے اس کام کو نہایت ہمدردی دلسوزی اور صداقت کے ساتھ پورا کیا ہے۔ طرز تحریر بھی فصیح اور شگفتہ ہے بعض جگہ تو مجھے شبہ ہو جاتا تھا کہ کہیں مرحوم کی عبارت تو نہیں۔ امید ہے کہ پبلک اور خاص کر مرحوم کی تصانیف کے دلدادہ ضرور اس کی قدر کرینگے۔

قابل مؤلف نے اس کتاب کو علیا حضرت ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کے چھوٹے صاحبزادہ حمید اللہ خاں بہادر کے نام معنون کیا ہے صاحبزادہ صاحب مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڈھ میں تعلیم پاتے ہیں اور ایک ہونہار اور لایق نوجوان ہیں۔ ہمدردی قدردانی اور فیاضی میں اپنی والدہ ماجدہ کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات ہیں اگلے زمانے میں مؤلفین و مصنفین کو امرا اور روسا کے دربار سے ایسے ایسے صلے ملتے تھے کہ وہ عمر بھر کو نہال ہو جاتے تھے ہمیں یقین ہے کہ لایق مؤلف کی جانکاہی اور محنت کی قدر اون کی لیاقت کے موافق کی جائیگی۔

سے تانے بانے کی طرح جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اوسکی ذات کو ان سے جدا کرنا قریب قریب ناممکن سے ہوتا ہے، ورنہ بڑا آدمی کچھ بڑا نہیں رہتا اسلئے سوانح نگار کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اس شخص کے کیریکٹر کو ان تمام گرد وپیش کے واقعات وحالات کی روشنی میں دکھائے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اختلاف رائے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں ہوتا ہے اور علاوہ اس کے ہمعصر مشاہیر کے متعلق بعض غلط فہمیاں عام طور پر پھیل جاتی ہیں۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کو صحیح اور سچے واقعات اور اوس کے وسیع تعلقات اور اصلی خیالات کے اظہار سے جن پر عام لوگوں کو آگاہی نہیں ہوتی رفع کرے اور اپنی رائے اور صحیح قیاس کے اظہار سے دریغ نہ کرے اور محض مخالفوں کے ڈر سے یا اون کی خوشی کے لئے عامیانہ مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر پہلو نہ بچائے۔ انصاف پسند لوگ سوانح نگار کی اس محنت کی داد دینگے اور اوس کے ممنون ہونگے۔ اگرچہ بدبیں لوگوں کو اس سے تکلیف ضرور ہوگی نرے خالی خولی ذاتی حالات کا بیان کر دینا کافی نہیں ہے۔ اور کوئی سوانح نگار اس طور پر اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جس قدر جو شخص بڑا ہوگا اسی قدر سوانح نگار کو اپنی رائے اور قیاس سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔ وسعت تعلقات سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں نہ صرف الجھن پیدا ہوتی ہے بلکہ غلطی واقع ہو جاتی ہے اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ گرد وپیش کے حالات کا اثر اوس پر اور اوس کا اثر اون حالات پر کیا پڑا۔ قطع نظر

بعد کیرکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ہی ایک ایسی دشواری ہے جسے اُسی کا جی جانتا ہے جسکو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہے، دوسرے صدہا شخص ایسے زندہ موجود ہیں جو اُس نامور شخص کے خیالات سے آگاہ ہیں اور انہوں نے اس کو مختلف حالات میں دیکھا ہے اور اس کے متعلق خاص رائے رکھتے ہیں۔ سوانح نگار جانتا ہے کہ اوسکی کتاب موافق و مخالف ہر دو گروہ کے ہاتھ میں جانے والی ہے اور اس لئے طعن و تشنیع کی زد سے بچنے کے لئے بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ مؤلف حیات النذیر نے ہماری قوم کے ایک علامہ کا قول نقل کرتے آجکل کے طریقہ تحریر سوانح عمری کو "پر فریب" بتایا ہے اور اوس پر پرزور بحث کی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون ایسا زمانہ تھا جبکہ یہ پرفریب طریقہ رائج نہ تھا۔ علامہ موصوف کو کبھی کسی ہمعصر نامور شخص کی (بشرطیکہ وہ کسی ہمعصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ورنہ انہیں اس سے زیادہ دشواری پیش آتی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر "سوانح عمری" لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ انہوں نے اب تک انہیں قدمائے کرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے جنہیں لوگ ایک زمانہ سے پوجتے آتے ہیں اور جنکی تنقید اور نکتہ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف کی تالیفات اس "پرفریب طریقہ" سے پاک صاف ہیں۔

بات یہ ہے کہ بڑے آدمی کی بڑائی صرف اوسکی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کے تعلقات، گرد و پیش کے حالات اور قومی و ملکی معاملات

مقدمۂ گلشن ہند

(مصنفہ میرزا علی لطف)

یہ کتاب شعرائے اُردو کا قابلِ قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص[1] کے ہاتھ لگ گیا۔ جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیّہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں خود بے بضاعت تاہم اِس فرمائش کو جو اُنھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا۔

حقیقت اِس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کے عہد اور امیر الممالک لارڈ وارن ہیسٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں علی ابراہیم خاں[2] نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا اور اس کا نام

[1] مولوی عبداللہ خاں صاحب کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔

[2] علی ابراہیم خاں متخلص بہ علی، مشہور ادیب اور مورخ ہیں، پٹنہ کے رہنے والے تھے اور بعہد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے اور ۱۲۰۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔ اُن کی مشہور تصانیف یہ ہیں (۱) گلزار ابراہیم

گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں جا کر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گذرا انھوں نے مولف تذکرہ ہذا سے فرمایش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ ان کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور ان میں اردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے اس طرح یہ کتاب اردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے

تذکرہ شعرائے اردو جو شاہ عالم بادشاہ کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہسٹنگز کی گورنر جنرلی میں ۱۷۸۴ء (۱۱۹۸ھ) میں لکھا ہے اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی۔ (۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں (۳) وقایع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس ۱۲۰۱ھ میں لکھی گئی۔ اس میں ۱۷۸۵ء سے ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں۔ میجر فلر نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی۔

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانہ کا ہے مگر چونکہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خان یکے از خیر خواہان کمپنی انگریز ام"، لہذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے

(۵) خطوط جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں اور جس سے اس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۶) (ایک مجموعہ ہے فارسی مثنویوں کا ردیف وار ضخیم جلدوں میں ۱۲۔ شیروانی)

کہ پورا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے۔

یہ تالیف اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دلی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علیخان رونق بخش مسند حکومت تھے، بادشاہ تو ایک بے بسی اور بے کسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے البتہ پورب کے طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلی کے اہل کمال اپنے وطن سے منہ موڑ اسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے۔ قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا، بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو انہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے یہاں تک کہ نواب سعادت علی خان جیسا عالی دماغ، متین، منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خان نے جو ہزار بھکڑوں کا ایک بھکڑ تھا، آخر انہیں اپنی گون نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا۔

"میں ہوں نسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک۔ لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف تر شستہ ہوتی جاتی تھی اور زوال اس لئے کہ فن

شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص
اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پہ ہولیے۔ شاعری بس
اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا، ایک
آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی۔ کبھی کبھار ڈرتے
ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہوگیا، رہا
مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی
وہی حال ہے، مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقرر ہیں اور اب تک
وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور
جرأت کا کام ہے، کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لیے سند طلب
کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند
کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعرا کی محنت سے
زبان صاف ہوگئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی اور جو حصار
کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم
نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری
کا دعویٰ ہے، اردو کے استاد ہیں، مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں،
دیوان اردو ہے مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب
فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں۔ کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی
میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے) سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے،
یہاں تک کہ خط کی مشق کے لیے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب

اُردو کو وسعت ہو تو کیوں کر۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے، اس نے اُردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لیے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اُس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے اس کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی اس لیے اُنہوں نے اس کی سرپرستی کی سب سے بڑا احسان جان گلکرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قایم کیا، جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں اُن کی تعلیم کے لیے اُردو کی مناسب اور مُفید کتابیں تالیف کرائی جائیں اور غالباً اُسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتری زبان قرار پائی۔ یہ عجیب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی۔ اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید اُردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا۔

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا لہذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اس کی نگرانی میں، یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا اور اردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا نامناسب نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابل ذکر ہیں انھوں نے ۱۸۰۱ء میں توتا کہانی لکھی جو اصل میں انھوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانہ میں، دکنی زبان میں لکھا تھا مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرایش محفل یعنے مشہور قصۂ حاتم، بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گل مغفرت یا دہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے، فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے، جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اور کتاب تاریخ نادری اردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں، انھوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے اور ایک اور

کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں۔
میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں احمد شاہ درانی کے زمانے میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے، یہاں سے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا، یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی ہے اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو رح کی چہار درویش ہے، میر امن نے امیر خسرو رح کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب حسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو رح کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا، اور اس کا نام نوطرز مرصع رکھا تھا، میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانہ میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے ۱۸۰۳ء میں انھوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے اور عربی میں کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے،
میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں، دہلی کے رہنے والے تھے گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم

و عالیمیان مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہ جہاں آباد کے طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے۔ اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ اُن کو میر حیدر علی حیرانؔ سے تلمذ ہے اور بعض کا قول ہے کہ میر دردؔ اور میر سوزؔ کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، بارلو صاحب نے مسٹر گلگرسٹ کے مشورے سے زبان دانانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا۔ چنانچہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوسؔ کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپیہ خرچ راہ دیا اور کلکتہ روانہ کیا، ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں اُنہوں نے ایک قابل قدر کتاب آرایش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں اِس کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے۔ اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی ۱۸۰۸ء میں سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چند نے ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاؤلی کو اُردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوانؔ بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ اُنہوں نے ۱۸۰۱ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا تو از کیشر نے جو برج بھاکا میں ۱۷۱۶ء شکنتلا کی کہانی لکھی تھی۔ اس کا یہ ترجمہ ہے اُنہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے جس کا نام دستور ہند ہے

اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا جس میں شاہ جنّات کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے، یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لالو گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آگرہ آباد ہو گیا تھا، اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً پریم ساگر، راج نیتی، لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے، اور نیز ولا کی مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلکرسٹ نے سنہ ۱۸۰۸ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے اول بھی ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی، جو لندن میں سنہ ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی۔ جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا جس کے انہوں نے تین حصے کئے۔ مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آ گئے ہیں

باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انہیں ناگری ٹائپ کا انتظار تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا اور کتاب ناقص رہ گئی، یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں۔ مگر ان کو اور بہت سے کام کرنے تھے۔ اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے اور ڈاکٹر گلکرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۶ء میں چھاپ دیا۔ مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے، علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے، صرف نشتر صاحبوں نے خریداری منظور کی حالانکہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری ایکاڈمی نے اردو لغت لکھنی شروع کی مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی مدد سے نظر ثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شکسپیر نے ایک اردو لغت

۱۸۱۷ء میں طبع کرائی۔ یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ برائس کی لغت ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی، پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھیں۔ ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے۔ یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی اور اس کی ترقی دینے میں انھوں نے حتی الامکان کوشش کی۔ میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے میر کے حال میں لکھا ہے۔

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے

مجھول سے محمول ہوئے اور جوانان نومشق مربی گری
سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے
کبھی نہیں خالی ہے' اکثر اہل لکھنو پکارتے تھے کہ کلکتہ
میں شاعری کی جادر خواست حمالی ہے۔"

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا۔ چونکہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور گھلاوٹ موجود ہے اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جاکر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان اُن کی نظم کی طرح اسے سر آنکھوں پر رکھتے اور اُردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خان محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کے ذکر میں لکھا ہے کہ

"اُنھوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمائش
سے قصہ سسی پنوں کا اُردو میں نظم کیا۔ نام اس کا اسرار محبت رکھا۔"

میر قمر الدین کے حال میں درج ہے کہ

اُنھوں نے میر محمد حسین، فرنگی لقب، کے توسل سے
ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا
اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر
مسٹر ہستن (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی عنایت
سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگال سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔"

اِس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کرنل ہال رائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی، سلسلہ تعلیم کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں اور اس میں مُفید اور نیک مشورہ دیا کتابت اور چھپائی میں خاص اہتمام کیا، اور اس میں کار آمد اصلاحیں کیں، اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قائم کی جس میں نیچرل مضامین پر عمدہ نظمیں لکھوائیں، شمس العلما مولنا خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلما، مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں اُنہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہال رئڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کی طرح اُردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر ہِل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اُردو کی صدارت قبول فرماکر اُردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اِسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اردو کتابیں بھی انھوں ہی نے چھپوائیں۔ اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اُردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لیتھو گراف پریس سب سے

پہلے دہلی میں ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا۔ اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی۔

وہ انگریز حاکم، جس نے اس ملک میں بیٹھ کر جو اردو کا جنم بھوم اور وطن بالوفہ ہے اسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب وغریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب وغریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قایم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی۔

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے، دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے، بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے، اور شاید اس

موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ ادھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے۔
نام میرزا علی تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خان استر آباد کے رہنے والے تھے ۱۱۵۴ھ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد تشریف لائے اور ابوالمنصور خان صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے، اور ہجری تخلص کرتے تھے، فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"میرا ارادہ سیر حیدر آباد کا تھا مگر چون کہ مسٹر گلکرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی اُسے بسر و چشم قبول کیا"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں"

اور بعد ازاں مارکویس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے کہ نام نامی اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مولف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا، اس کے مادۂ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ھ ہجری میں لکھی گئی ۔

حیراں بصیریں ہیں بے سرو پا بہمن اور دے
تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے ۱۲۱۵ھ

۱۲۲۰
اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے ۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمائش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے کیونکہ ان کے کلام میں وہ قصاید مدح ہیں جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے اس کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہے۔ یا اہل حیدرآباد سے، اس لئے انہوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں

ہوا آوارہ ہندوستان سے لطف آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا لندن کے گوروں نے

جو قصیدہ انہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے اور دکن

میں جا کر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں۔

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا　　سود و سوا آشنا کا حق بندگی گزار

شکر خدا کہ آج بیک بینی و دو گوش　　گرچہ دکن میں ہے نہیں ہر در پہ خوار و زار

ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکون　　لازم و گرنہ تھا بشریت کو اضطرار

اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض　　سو یہ ہے، اے امیر فلک قدر و کے تبار

سرکار سے تری جو ز راہ تفضلات　　ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں　　جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل و نہار

بے گفتگو بچا اس تو اُن ڈیڑھ سو میں سے　　ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

خلق خدا کا بار اُٹھاتی ہے پالکی　　میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو سو رہے، کئی دن میں بان پہ پھر　　مثل مجردات فقط اُن کا ہے شمار

تجھ سا ہو قدردان نکات، اور یہ نکتہ سنج　　یوں ہو اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار

فضل و ہنر جو مجھ میں ہے وہ سب یک طرف　　اور قدر دانیاں بھی تری سب یک کنار

ہے ہمت بلند کا تری جو اقتضا　　اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار

از بس کہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے　　بالفعل تو اضافے کا ہے دل مجھ کا امیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام　　کافر ہوں سوچا ہو میں گر ہو گشود کار

تضعیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف　　کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار

غالب سے کچھ یہ مشتاق نہیں میرے تئیں ہو　　چپ سوچ کے بیٹھوں کو تو وے بلکہ جی ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہا (؟) قدیم سے چلی آرہی ہے اور اب تک باقی ہے۔

اس قصیدے میں شاعر نے تعلّی کی ہے اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر

اے شانِ حیدری ز جبین تو آشکار
نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

امیر الامراء نے زر و سیم نثار کیا پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے۔

جُز لفظِ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات ۔۔۔ ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار
آئینِ قدر دانی میں لیکن برائے نام ۔۔۔ لازم یہی ہے کر گیا جو خانِ باوقار

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے۔

کہتی ہے فارسی میں مجھے طبع مطلعے ۔۔۔ ہاں در جواب مطلع ناصر علی بیار
اے ذرہ ہا ز نامِ تو خورشید اعتبار ۔۔۔ تاثیرِ اسمِ اعظم از اسمِ تو آشکار

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی یہی رونا رویا ہے۔

پہ اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہے تجھ سے — کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ با محتاج کی ثروت سے — نہ ہوں محتاج تا بوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ شعرا گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ میرزا لطف کچھ دنوں از راہ عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں لکھتے ہیں:
"اور مشورہ ریختہ کا اپنی ہی طبع نا صواب سے ہے"

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہ اُن کی شاگردی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے مگر کلام میں لطف نہیں، البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایسا کارنامہ ہے جو اُردو زبان میں قابل یادگار رہے۔ چوں کہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہے! زبان صاف اور سادہ ہے تاہم قافیئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تذکرے اگرچہ اور بھی لکھے گئے ہیں مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے:

۱۔ اول تو سو برس پہلے کی زبان ہے جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان کو، اور نیز اُن لوگوں کو

جنھیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں "مثلاً کرکے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں:۔

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر مینا کرکے تھے"

اسی طرح میر قمرالدین منت کے حال میں لکھا ہے:۔

"چنانچہ شکرستاں کرکے ایک نسخہ اس شہر میں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے"

دکن میں بعض لوگ بعد میں کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے۔

ہے جیتے جی تو مجھے کوسنے یار میں رونا رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں مثلاً فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں رضیا کے حال میں لکھا ہے:۔

"دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے"

مظہر کے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

"بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔"

دکن میں عام طور پر میں "کہا" بولتے ہیں قایم کہتے ہیں۔

میں کھا، عہد کیا کیا تھا رات
ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں"

۲۔ دوسرے علاوہ اس کے کہ مولف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اُردو زبان عروج پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مولف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ، اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا، اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً۔ رزیڈنٹ لکھنو کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے، اور جو صرف اس تذکرے کا مولف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو اُنھوں نے عمر بھر نباہی وہ لکھتا ہے۔

تا تصدوانی سے اغنیا کی، اور تا سمجھی سے اہل دنیا کی

اب بازار سخن سازی اس درجہ کا سد ہے اور
ہوائے شہرستان معنی طراز اس مرتبہ فاسد، کہ
میرسا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے
خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے
مقال کا، دو نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی
نہیں پوچھتا اس کی آج ہے"
شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبحیات میں لکھتے ہیں۔
"جب میر صاحب لکھنو آئے تو نواب آصف الدولہ
نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا مگر چوں کہ بد مزاج انتہا
درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا اور گھر بیٹھ
رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"
مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیوں کہ
اس میں لکھا ہے کہ
نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت
فاخرہ دیا اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے
تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ
مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم
سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہوا۔ اور
نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج تک

دن تک کہ ۱۲۱۵ھ میں یہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ کہنا کہ وہ نان شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے یا یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا اور ان کا ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہونا۔ رام نراین سے جنگ کے دلیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ بالتفصیل لکھا ہے اور اخیر میں کور نمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے جس میں یہ واقعہ منظوم ہے اور خود اردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے اس لئے کہ تذکرہ اردو کا ہے اور اصل غزل حاشیے پر لکھ دی ہے البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تانا شاہ، آصف الدولہ، اور مرزا محمد رضا امید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا امید کے تذکرے میں امیر الامرا حسین علی خاں اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔

۴۔ چوتھے، اس کتاب سے زمانہ کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات تو صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا اور دنیا ومافیہا کی کچھ خبر نہ تھی اخیر میں جب ہمارے بادشاہ لو اب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے ان لوگوں نے رہا سہا انہیں اور کھو دیا، ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کر دیا "دیوانہ را ہوئے بس است"۔ شاعروں کی بن آئی وہ تو اس شغل میں رہے اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے بڑے بوڑھے، جوان، بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی، نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے شاگرد ہو گئے اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف

کسی استاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے میں ان شاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہو گی۔

علاوہ اس عام حالت کے تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک واقعہ جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے تب بھی شاہان دہلی اور اُن کے گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ میں دلی سے لکھنو چلے آئے تھے:

> نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب خدمت گزاری ادا کیے، خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الایچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرا گاہ پہ سے جا کر آداب بجا لاتے تھے۔"

۵۔ پانچویں ۔۔۔ ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جس کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے اور اُن کا تخلص اشتیاق تھا' یا عبدالقادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے' یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے جو آدھا اُردو اور آدھا ہندی ہے بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے۔ مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں۔

"ایک موقعہ پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا' چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی ہجو کی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی اب ملتی نہیں لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں۔"

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اِس مثنوی کا وہ حصہ' جس میں فیض آباد اور لکھنو کی ہجو ہے میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے' ناظرین کو لکھنو کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا۔

زبس کوفے سے یہ شہر ہم عدو ہے   اگر شیعہ کہیے نیک اس کو بد ہے

اس مثنوی کا نام غالباً گلزارِ ارم تھا۔ میر حسن نے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے، در حقیقت کلام سب اچھا ہے مگر افسوس کہ آجکل یہ نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی، میاں سید محمد میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اب تک سنی ہی سنی تھی، اس کے چند شعر اثر کے حالات میں درج ہیں شمس العلماء مولوی شبلی نے اس پر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے جو کتاب کے صفحہ ۳۲ پر درج ہے:

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنو سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا

لی شاعری کو اعتراف کیا ہے بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف
و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھکر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب
نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں انہیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جنکی
نظر ظاہر ہی سے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے
کہ لکھنو کی شاعری کی مذمت کی ہے۔ حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان
میں لکھنو کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر یا اردو شاعری کے نشوونما
اور اس کے مختلف صناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب
کا ذکر آگیا ہے اور اس میں دلی لکھنو والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں
نے ایسا گمان کر لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی
خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی
اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے
شایق ہیں، تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے
وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے
اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی
دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ
پہنچا اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے یکایک متزلزل
ہو گئے اور ڈھ گئے زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے
مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لیے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی
لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے

ناسمجھی سے اُسے دے رکھا ہے مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کھل جائے حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ مولانا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف یہ تھا کہ اُنہوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بے خار میں لکھتا ہے:

"مثنوی الشان شہرت تمام دارد کہ بنائے آن برمحاورہ بحث اوست ازیں جہت مرغوب عام"

مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں کہتے ہیں کہ

"ایک مثنوی خواب و خیال اُن کی مشہور ہے اور بہت اچھی لکھی ہے"

دوسرے اُن کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اس میں درد، زبان کی صفائی، شگفتگی اور لطافت بدرجہ کمال موجود ہے اور یہ سب باتیں مثنوی کے لئے خاص طور پر مناسب ہیں، مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح

صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سراپا کا مضمون اس قدر مبتذل ہے کہ اس میں
کوئی نیا مضمون پیدا کرنا یا اس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا
بہت مشکل ہے، اور چونکہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے
اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب
تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے، مثلاً
جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں، اسی طرح
مصحفی کی تعریف کی ہے لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے
کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب
ہے کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ "شوق" نے اپنا کر لیا ہے یعنے۔

اثر — ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا — کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
شوق — ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا — چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ
سکتے تھے یا اُن کے بعد نواب مرزا شوق۔ اگر یہ شعر اُن کا ہے تو یہ کہنے کی
پوری وجہ ہے کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر
ضرور اس پر پڑا ہوگا مولٰنا حالی فرماتے ہیں۔
خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت
سے بہار عشق میں موجود ہیں۔
یہ ایک مزید ثبوت ہے۔
دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ مثنوی اُس زمانے میں

لکھی گئی جب کہ اُردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب و خیال کو ہمارے عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی"

اخیر اس میں تو ظاہراً ایک حد تک کچھ گنجائش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھکر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جو پنڈت چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سینکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے، ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آپڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھیٹے صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں جس میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ[1] صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ

---

[1] صاحب تذکرہ شاہ ولی اللہ اشتیاق کے حالات اس نہج سے لکھے ہیں جس سے یہ دھوکا ہوا کہ اس کی مراد دلی کے نامور محدث شاہ ولی اللہؒ سے ہے۔ اب تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسین" اور "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ"۔ اُن کی تصانیف سے ہیں۔"

حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسینؓ کا ابطال کیا ہے نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے، اس کے بعد یہ کہہ کر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیزؒ کے خوب ہجو ملیح کی ہے اور آخر میں یہ لکھا ہے:

"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار بقول شاعر کے"

شیر کے بچے میں غرّش شیر سے افزوں ہے، بھونک میں کتے کی بلی کی سگی موجود ہے

یا مظہر جان جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں۔

"سنہ ۱۱۹۴ھ تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا۔"

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۴۰): یہ شاہ ولی اللہ ایک دوسرے صاحب ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے تھے۔ دلی میں رہتے تھے اور متوکل درویش تھے۔ اُن کی جن تصانیف کا ذکر اس تذکرہ میں کیا گیا ہے اُن کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ (ملاحظہ ہو نکات الشعرا صفحہ ۲ مطبوعہ انجمن ترقی اردو)۔

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ

"عالمگیر نے استیصال بادشاہان دکن کا جو ناانصافی سے کیا اور مکہ مسجد کو بند کیا اس کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا۔ خدا جانے اس حرکت کا کیا نتیجہ ہوگا۔"

مکہ مسجد کا بند ہونا نرا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدرآباد میں رہا ہے اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا ہے۔ شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں کہ مکہ مسجد موجود ہے اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔ لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگذر نہیں کرتا۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں، ان کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا تعریف کی ہے لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے۔

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت
تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام
رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق
اور کام کا نہ پایا اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا
نہ پایا۔"

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"عوام کی طبیعت توان اعتراضوں سے البتہ تشویش
میں پڑتی ہے، نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے،
جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے۔"

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلّی کے تھے۔ دلّی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اس میں جنم لیا وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے، یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے، زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلائق رہا کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دہانی، کبھی سلاطین اسلام کا دار الخلافت کبھی طغیانی کی بدولت بگڑ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا کبھی معرکہ جنگ و جدل و قتل عام ہے اور کبھی دن عید اور رات شب برات ہے۔ کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال ہے اور کبھی ایک مطلق العنان سپاہی کی لات سے خاصہ کھنڈر رہے، کبھی مورد بلیات و آفات ہے اور کبھی منزلِ حسنات و برکات۔ غرض یہ نگری یونہیں اجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی، مگر باوجود اس کے اس کے حسن عالم افروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی لیکن آخر زمانے میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں تو دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔

سب سے اول نادر شاہ کے حملے کا ایسا تھپیڑا لگا کہ اس نے جھاڑی

تو دیا۔ اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا۔ اب تک جو باکمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے، اِن حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے، سوائے ایک میر درد کے جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں۔

جن ایام میں معمورہ شاہجہاں آباد کا اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبانِ عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پُر شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود لٹیاے کے سبب خراب ہوا اور رصدۂ عقوبت و عذاب ہوا کو ہر ایک گوشہ نشین نے اور ہر ایک صابر زاویہ گزیں نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے اور ہر امیر عالی مقدار نے فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وہ سید والا تبار کہ نام نامی اس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے اور شاہجہاں آباد کو

چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنجِ عزلت سے نہ گئے۔"
یسے وقت شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعدارو
ل کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد
اتھیاں نے کچھ دنوں سے اس کا ساتھ دیا، اب لے دے
ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا، آصف الدولہ
نواب تھا اہلِ کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو تھا وہیں پہنچا اور
ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین
آرزو پہنچے اس کے بعد سودا تشریف لے گئے سودا کے انتقال کے
میر تقی نے ۱۱۹۷ھ میں دلی سے لکھنؤ کوچ فرمایا۔ میر صاحب کے جاتے
صوفی ہوگئی اور میر حسن، میر سوز، جرأت، سب لکھنؤ میں جا بسے اور
ذوق لکھنؤ میں آگئی۔ اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہ
لی سوسائٹی کا اثر دو زبان اور اردو شاعری پر کیا اثر ہوا اس تحت
ث سے خارج ہے۔ مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خاں
کوئی بات معلوم ہوگی اور کم سے کم اس قصے کی تحقیق ہو جائے گی
مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے
۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا، اور ۱۲۱۵ھ تک میر انشاء اللہ خاں، میرزا
شکوہ کے ہاں ملازم تھے یا اوسی سال نواب سعادت علی خاں
رسائی ہوئی، کیوں کہ میرزا سلیمان شکوہ اس سال (۱۲۱۵ھ)
واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین

کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا
یار خاں رنگین کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے
آزاد نے کس سے سنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجلس
دیتے ہیں، مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں
مجالس رنگین بھی ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی۔ میر انشاء اللہ خاں اور
یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم
یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یوں بھی اس میں نہیں ہو
ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مؤلف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ
جس میں سلاطین نامدار امرائے عالی مقدار اور شعرا
صاحب وقار کے حالات لکھے گئے ہیں دوسری جلد
میں غیر مشہور شعراء کا تذکرہ ہوگا"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ آیا
مؤلف نے شعراء کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا
اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان
کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے، صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے
جن شعراء کا کلام نہیں چھپا اُن کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے
مؤلف نے اپنے کلام سے صفحہ کے صفحے رنگ دئے تھے

کر دیا گیا ہے۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اِس کے طبع ہونے سے اُردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا اور جو لوگ اُردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء

مدرسہ آصفیہ حیدرآباد دکن

مقدمہ مآثر الکرام

(مصنفہ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی)

حسان الہند[1] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اِن علمائے ہند میں سے ہیں جن کا نام اس ملک میں ہمیشہ یادر ہے گا وہ نرے ملاہی نہ تھے بلکہ ادیب و شاعر مورخ و محقق بھی تھے اور ان کی تالیفات و تصنیفات خود اس امر کی شاہد ہیں۔ اس میں چنداں شک نہیں کہ ہندوستان کے عہد اسلامی میں ایسی ایسی تاریخیں لکھی گئی ہیں کہ جنکی نظیر فارسی زبان میں نہیں لیکن مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ صحیح فن تاریخ نویسی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا، البتہ مولنا غلام علی آزاد نے اس فن کی لاج رکھ لی اور آخر وقت میں بھی ذوق صحیح کی داد دی۔ ان کی تصانیف میں سے زیادہ تر فن تاریخ کی اس شاخ کے متعلق ہیں جسے فن اسماء الرجال کہتے ہیں اور آزاد نے اس بات پر فخر ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں پہلے وہی ہیں جنہوں نے

---

[1] حسان الہند میر غلام علی آزاد ابن سید نوح بلگرامی یکشنبہ ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ میں بمقام قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۰ھ میں بمقام روضہ جو خلد آباد اورنگ آباد دکن میں ایک مشہور مقام ہے چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

اِس فن پر قلم اُٹھایا ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے [illegible] تاریخ نظامی، ملا عبدالقادر
بدایونی اور علامہ ابوالفضل اپنی اپنی تاریخوں میں اپنے اپنے عہد کے امرا
و علماء کملاء کے حالات لکھ چکے ہیں، البتہ [illegible] ہے کہ مولانا آزاد نے اس میں
خاص اہتمام کیا ہے اور اس فن کی [illegible] توجہ کی ہے۔ اُن لوگوں نے
اپنے عہد کے مشاہیر کے حالات اپنی تاریخوں [illegible] ضمیمے کے طور پر لکھے تھے
آزاد نے اسے الگ فن قرار دے کر مستقل [illegible] لکھے ہیں۔

ماٰثر الکرام جو اب پہلی بار مولوی عبداللہ [illegible] کی سعی سے طبع ہوئی ہے
اسی فن کے متعلق ہے۔ یہ کتاب عموماً ہندوستان اور خصوصاً فقراء و علمائے
بلگرام کے حالات میں ہے۔ آزاد نے اس کتاب کی تالیف سے نہ صرف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۹۔ ؎۵ [illegible] سے آستین ہمت بایں وجہ بر شکستہ و کمر خدمت
بندگان سلف و خلف بایں [illegible] بست [illegible] دیکھو دیباچہ کتاب [illegible]

؎۶ سرو آزاد شعرا کا تذکرہ۔ ید بیضا شعرا کا تذکرہ۔ خزانۂ عامرہ ان شعرا کے حالات
ہیں جن کو دربار شاہی سے صلے ملے ہیں۔ روضۃ الاولیاء صوفیہ کے حالات میں سبحۃ المرجان
علماء کے تذکرہ میں۔ ماٰثر الکرام علماء و صوفیہ کے حالات میں نیز نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں
کی بے نظیر تالیف ماٰثر الامرا کی تکمیل و تہذیب میں جو سعی آزاد نے کی وہ بھی بہت
قابل قدر ہے دیکھو دیباچہ ماٰثر الامرا۔ نیز آزاد کے اُن خطوط سے جو مولوی
سید احمد صاحب زید بلگرامی مرحوم کے پاس تھے یہ امر ظاہر ہے۔

اپنے وطن کا حق ادا کیا بلکہ فن رجال میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے بلگرام ایک مردم خیز بستی ہے۔ اور اس معدن علم و فضل سے ایسے ایسے بے بہا لعل نکلے ہیں جن کے نام اس سرزمین میں ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔ ہم خوشی کی بات ہے کہ یہ فضیلت اسے اس وقت تک حاصل ہے۔ یوں بھی قصبات اور شہروں کی حالت میں بہت تفاوت ہے، آب و ہوا کی خوبی اور صفائی، اخلاق کی سادگی وجہ ریائی تکلفات اور تصنع سے بری مسابقہ اور منافسہ کی کشمکش سے محفوظ مسالک کی پختگی، یہ اور بعض اور وجوہ ایسے ہیں کہ جن کے سبب اہل قصبات کے جسم و دماغ اہل شہر کی نسبت زیادہ صحیح ہوتے ہیں۔ اگرچہ شہر کی ترغیبات ان میں سے اکثر کو اوسی منڈے میں کھینچ لے جاتی ہیں جہاں چند نسلوں کے بعد ان میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اگر علماء و فضلاء و دیگر مشاہیر کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل قصبات کا ملک پر بہت بڑا احسان ہے..............

.... کاش مولانا آزاد کی طرح دوسرے اہل قصبات بھی اس بات کا خیال رکھتے اور اپنے اپنے قصبے کے علماء و فضلاء و صوفیا و دیگر مشاہیر کے حالات قلم بند کر ڈالتے تو ہندوستان کی تاریخ کو اس سے بہت بڑی مدد ملتی۔ ہندوستان میں بکثرت ایسے قصبات ہیں کہ اگر وہاں کے حالات یا تاریخ لکھی جائے تو ایسی مفید معلومات

لہ مثلاً پانی پت۔ بدایوں۔ خیرآباد۔ امیٹھی۔ موہان۔ سرہند۔ سہالی وغیرہ وغیرہ۔

اس سے حاصل ہو سکتے ہیں جس کا بڑی بڑی مبسوط تاریخوں میں پتہ نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں مولانا نے خاص محنت کی ہے اور صرف کتب تاریخ متداولہ ہی تک تلاش و جستجو کو محدود نہیں رکھا بلکہ "اہالی و حوالی شہر" سے بھی حالات دریافت کئے اور نیز "سجلات شرعیہ" سے جو بزرگوں کی یادگار سے باقی تھے استفادہ کیا۔

یہ کتاب اول بلگرام میں لکھنی شروع کی تھی لیکن درمیان میں یعنی ۱۱۵۲ھ میں حج کے قصد سے مکہ چلے گئے زیارت حرمین شریفین سے واپس ہوکر دکن میں قیام کیا اور وہیں نا مکمل مسودہ منگوا کر اختتام کو پہنچایا۔ تاریخ اختتام کتاب "ختامہ مسک" سے نکلتی ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا آزاد نے اس کتاب میں کسی قدر اختصار کو مدنظر رکھا ہے اگر وہ اس زمانہ کی صحبتوں اور معاشرت اور طریقہ تعلیم و تعلم پر ذرا اور وسیع نظر ڈالتے تو یہ کتاب بہت زیادہ دلچسپ اور مفید ہو جاتی۔ لیکن تاہم جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ بہت قابل قدر اور نیز قابل تقلید ہے۔ زمانہ حال و گذشتہ کے حالات اور خصوصاً اون لوگوں کے تذکرے جو اس کارزار حیات میں جہاں قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے اپنی ہمت اور ریاضت، سعی اور مشقت سے پایہ کمال کو پہنچتے ہیں انسان کے اخلاق پر عجیب و غریب اثر ڈالتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طلبہ تحصیل علم کے شوق میں بے زاد راہ شہر بشہر پھرتے ہیں کھانے کی پروا ہے نہ کپڑے کی فکر مگر تحصیل علم کی دھن میں

ہمخوان ملے کہ کے عین سر چشمہ پر پہنچتے اور سیراب ہو کر واپس آتے ہیں
اور اس کے بعد جو کچھ حاصل کیا ہے اِس سے دوسروں کو فیض پہونچاتے
ہیں اور یہی نہیں بلکہ اسے ثواب کا کام خیال کرتے ہیں اور اس سے بھی
بڑھکر یہ کہ اگر وہ کسی شاہی خدمت وغیرہ پر مامور ہو گئے ہیں تو بھی فرصت
کے وقت سلسلہ درس و تدریس جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی تالیف
بھی ہوتی رہتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں اور آجکل کی حالت پر نظر ڈالتے
ہیں جبکہ علم کا چرچا گھر گھر ہے تو ہمیں ایک عجیب فرق نظر آتا ہے۔ محنت
اور ریاضت اب بھی غالباً اتنی ہی کرنی پڑتی ہے لیکن تحصیل علم کی وہ
چینک اور وہ دھن جو پہلے لوگوں میں تھی آجکل اس کے مقابلہ میں کم ہے
اس کی زیادہ تر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلے حصول علم میں آزادی تھی اور
آجکل یونیورسٹی کی پابندیوں نے ایسا جکڑ دیا ہے کہ اگر کچھ شوق ہوتا بھی ہے
تو دب دبا جاتا ہے۔ دوسری ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آجکل علم زیادہ تر
حصول ملازمت سرکاری کے لئے حاصل کیا جاتا ہے، علم کو علم کی خاطر
شاذونادر ہی کوئی پڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالانکہ آجکل طلبہ کی کثرت ہے
مگر حقیقی علم یا علم کا حقیقی شوق کم ہے۔ اور اگر ہے بھی تو اس کی چنداں
قدر نہیں۔ کون ہے جس کے دل میں قاضی عبدالحی کے تذکرے کے
پڑھنے سے جو اسی کتاب میں ہے جوش اور ولولہ پیدا نہ ہوگا۔ لکھا ہے
کہ سلطان محمد بن تغلق شاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو ولایت
فارس میں قاضی یحییٰ کے پاس بھیجا اور یہ عرض کرائی کہ آپ ہندوستان

تشریف لے چلیں اور شیخ موافقت کو سلطان شمہ کے نام سے معنون فرمائیں
سلطان ابو اسحاق والی شیراز کو جو یہ معلوم ہوا تو دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ یہ
سلطنت حاضر ہے اس کے سوا جتنے اور جو خدمت آپ فرمائیں اس کے
بجالانے کو میں حاضر ہوں مگر شیخ آپ ۔ ۔ ۔ سے نہ جا سکے۔ ایسی قدردانی
کی نظیر مشکل سے ملے گی اور شاید یہ شخصی سلطنت ہی میں ممکن ہے۔ غالباً
شخصی سلطنت کے نام سے ناظرین کے کان کھڑے ۔ ۔ ۔ ہوں گے لیکن اصل
یہ ہے کہ حکومت کی کوئی صورت بھی بری نہیں بشرطیکہ صحیح اصول کو پامال نہ کیا
جائے لیکن اگر صحیح اصول پر نظر نہیں تو حکومت کی ہر صورت خواہ قیاسی
طور سے کیسی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو مذموم ہے۔

حصول علم کے شوق میں ایک اور بات بھی مضمر ہے جو سب سے
زیادہ قابل قدر ہے۔ انسان کو انسان بنانے والی یعنی اس کا کیریکٹر سنوارنے
والی جو شئے ہے وہ شوق، سعی اور ریاضت و محنت ہے، خصوصاً جب کہ
مدعا حصول اغراض نفسانی نہ ہو۔ ان لوگوں کے کیریکٹر میں ایک خاص بات
پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صرف انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کے
دلوں میں کسی اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے کی لو لگی ہوتی ہے اور جو اس
دھن میں دن کو دن سمجھتے ہیں اور نہ رات کو رات، مصیبت کو مصیبت
خیال کرتے ہیں نہ راحت کو راحت، مگر راہ طلب میں برابر قدم بڑھائے
ہوئے چلے جاتے ہیں اور گو آخر میں گوہر مقصد ہاتھ آئے یا نہ آئے مگر
ایک ایسی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے جو اس سے زیادہ نایاب اور اس سے

کہیں بیش بہا ہے یعنی انسانیت یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ صفائی باطن۔ کون ہے کہ جس کے دل پر شاہ رحمت اللہ صاحب قدس سرہٗ کے تذکرے کے پڑھنے سے جو اس کتاب میں درج ہے ایک خاص اثر یا ایک خاص کیفیت طاری نہ ہوگی۔ ان کے دوسرے حالات کے ضمن میں مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ان کے ایک عزیز کی زبانی منقول ہے کہ میں اور شاہ رحمت اللہ صاحب قدس سرہٗ قصبہ سانڈی سے بلگرام جا رہے تھے دیکھتے کیا ہیں کہ سانڈی کے باغستان میں کسی نے چور کو مار کر درخت سے لٹکا دیا ہے یہ دیکھتے ہی شاہ صاحب نے فرمایا ذرا ٹھیرو اور آگے بڑھ کر چور کے پاؤں چوم لئے میں نے پوچھا حضرت یہ کیا ہے! فرمایا کہ اس چور نے اپنے شیوہ کو پایۂ کمال تک پہونچا دیا خدا تعالیٰ ہر شخص کو اپنی اپنی راہ میں اسی طرح ثابت قدم رکھے۔

ایسے بزرگوں کے تذکرے جنہوں نے اپنے تن، دھن، من کو تحصیل علم، تزکیہ نفس یا رضاجوی باری تعالیٰ میں وقف کر دیا تھا اس زمانہ کے لئے جبکہ ہر طرف سے مادیت کا شور دنیا دنیا کی پکار اور پیٹ کی دہائی سنائی دیتی ہے بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ پند و نصائح اور اخلاقی کتب اس قدر مفید نہیں ہوتیں جس قدر ان لوگوں کے تذکرے جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے۔ وہ صرف باتیں ہیں اور یہ کام، وہ صرف مردہ الفاظ ہیں اور یہ زندہ اعمال۔ لہٰذا اس سے اُس کے اثر میں بہت بڑا فرق ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے وطن کے علاوہ اپنے صوبہ کی بھی بہت

کچھ تعریف کی ہے اور ان کی تعریف بجا ہے۔ درحقیقت جیسا کہ اُنہوں نے
لکھا ہے پورب قدیم الایام سے معدن علم و علماء رہا ہے، علم و فضل کے
چرچے اب تک وہاں جاری ہیں۔ ترویج علم کے لئے سلاطین و حکام
کی طرف سے وظائف وزمین و مدد معاش مقرر تھی اور اس غرض کے لئے
مساجد مدارس، خانقاہیں بنوائی جاتی تھیں، طلبہ دور دور سے آتے تھے اور
صاحب توفیق ان کی خاطر تواضع اور خدمت کو سعادت عظمیٰ سمجھتے تھے
آزاد نے لکھا ہے کہ شاہجہاں کا یہ قول تھا کہ "پورب شیراز مملکت ماست"
لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مدارس اور خانقاہوں پر اوس
پڑ گئی، درس و تدریس کا بازار سرد پڑ گیا اور وہ جوش دھیمے ہو گئے۔ ہندوستان
میں پہلے عام طور پر تعلیم کا یہی طریقہ تھا جس کے نشان اب بھی کہیں کہیں
نظر آتے ہیں اب نیا دور شروع ہوا ہے اور زمانے نے دوسرا رنگ
بدلا ہے اور مشرق کی ہر چیز میں مغرب کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔

لیکن جہاں ہمیں اس زمانے کے علمی ذوق و شوق کو دیکھکر مسرت
ہوتی ہے وہاں ایک بات کا افسوس بھی ہوتا ہے۔ اُس زمانہ کے نصاب
تعلیم پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو حلقہ کہ کچھ عرصے پہلے
علماء نے کھینچ دیا تھا اس سے باہر قدم رکھنا اُنہیں قسم تھا۔ فقہ و حدیث و
تفسیر منطق و فلسفہ و علم کلام پر سارا زور تھا، ساری طباعی اور ذہانت
اسی پر ختم تھی یہاں تک کہ کتابیں بھی زمانہ دراز سے ایک ہی چلے آتی
تھیں اور انہیں پر حاشیہ پر حاشیہ اور شرح پر شرح اضافہ ہوتی

جاتی تھی۔ علوم طبیعیات کا تو کیا ذکر ہے تاریخ وجغرافیہ بھی جس میں مسلمانوں نے خاص امتیاز حاصل کیا تھا خارج از بحث تھا۔ غرض صدہا سال سے ہمارے ہاں کی تعلیم حالت جمود میں تھی سالہا سال کی بربادی اور تباہی کے بعد اب کہیں جا کے ہمارے علمار کی آنکھیں کھلی ہیں اور آنکھیں کیا کھلی ہیں دعا دینی چاہیئے اِس باہمت اور عالی دماغ شخص کو جس نے اس زمانے میں مسلمانوں کے سر سے بہت سی بلاؤں کو ٹالا اور مسلمانوں کو ان کی نازک اور پرخطر حالت سے آگاہ وخبردار کیا۔ یہ اوس کا طفیل نہیں تو اور کیا ہے کہ اسی کے صحبت یافتہ اور اسی کے دار العلوم کے تربیت یافتہ ایک بزرگ عالم نے قدیم سلسلہ تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے سامان مہیا ہوتے جاتے ہیں خدا اس کی ہمت میں برکت اور اس کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اس کام میں کامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ یورپین السنہ وعلوم سے جو نفرت مسلمانوں کے دل میں تھی وہ مرحوم ریفارمر بڑی جانکاہی سے رفع کر گیا ہے اور وہ طوفان بے تمیزی جو اُس وقت برپا ہو گیا تھا اب فرو ہو گیا ہے اور راستہ خس وخاشاک اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف ہے اور لوگ اس تغیر کے لئے آمادہ ہیں۔ عام لوگ تو اسے دینی کام خیال کر کے اس کی امداد باعث ثواب جانتے ہیں اور انگریزی تعلیم یافتہ یا دوسرے لوگ جو زمانہ کی ضروریات سے واقف ہو چلے ہیں اس کی اہمیت کو مانکر اس کے ساتھ ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ اس تحریک کا یہ نتیجہ ہو کہ علوم مشرقیہ ومغربیہ کو سمو کر ایک نیا کورس تیار کیا جائے

جو ہماری ضروریات اور حالت کے زیادہ مناسب اور زیادہ کارآمد ہو۔ البتہ اس قدر افسوس ہے کہ ہمارے علما نے مذہب التفضیلیہ کو ثابت کرنے کے ہاتھ بٹانے میں ... کہ مودودی صاحب جنہیں اندرونی حالات سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ بہ نسبت علما کے غریب دنیاداروں سے زیادہ امداد ملی ہے اور انہیں کے سہارے پر اب تک سارا کام چل رہا ہے۔

ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ اون علماء و فضلائے بلگرام میں سے جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہل تشیع میں سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب نے وہاں بعد کے زمانہ میں رواج پایا۔ اور اگر ان علماء میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور وہ شیعہ مذہب پر ہے یا ان کے نسب ناموں میں ان علماء کے نام نکلیں تو ہمارا یہ خیال اور بھی قوی ہو جائیگا۔ یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع و قصبات پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی لحاظ سے خاص اثر ڈالا ہے چنانچہ جونپور و دیگر مضافات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقن کو پہونچ جاتا ہے۔ جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت اندیشناک ہو جاتی ہے میرا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام لیا۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو جو اعتقاد کے

کیچے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔ ایسا ہر جگہ موجود ہے اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا اور قصبہ بلگرام بھی اس اثر سے نہ بچا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانے میں اہل تشیع وہاں نہ تھے اور اگر تھے تو خال خال لیکن بعد کے زمانہ میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہونچا ہے۔

آزاد نے حسب عادت میر سید محمد الترمذی کے تذکرہ میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کی کتاب تسویہ کا اچٹتا ہوا سا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن اس کتاب کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے اور اس لئے ہم اُسے یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوگا کہ بادشاہ اورنگ زیب انار اللہ برہانہ کی جزئیات پر بھی ایسی ہی نظر تھی جیسی کلیات پر۔ دوسرے یہ معلوم ہوگا کہ بعض باخدا لوگ ایسے بھی موجود تھے کہ وہ اورنگ زیب جیسے سخت گیر اور پر جلال شہنشاہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے تیسرے اس سے دینیات کے ایک معرکتہ الآرا مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی کی تصنیف سے ہے جو ایک درویش اور صوفی تھے اسمیں علاوہ اور امور کے جبرئیل و وحی کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

جبرئیل محمد در ذات محمد بود صلے اللہ علیہ وسلم
وہمچنیں جبرئیل باہر پیغمبرے در ذات وے بود
وآں قوت باطنی ایشاں بود کہ در غلبہ آں قوت
وحی ایشان نازل می گردید وہذا جبرئیل باہر پیغمبرے

بزبان وے سخن گفتہ ؎

جب یہ رسالہ (جو عربی زبان میں ہے) شاہ اورنگ زیب کی نظر پڑا تو انکار عظیم کیا۔ شیخ اس زمانہ میں رحلت کر گئے تھے لیکن اُن کے مریدوں میں سے دو شخص پایۂ تخت میں موجود تھے، ایک میر سید محمد جو ملازم شاہی اور امرائے دربار میں سے تھے، دوسرے شیخ محمدی جو لباس درویشی و زہد میں تھے۔ اول بادشاہ نے میر سید محمد سے تسویہ کی اِس عبارت کی شرح دریافت کی۔ سید نے شیخ کی مریدی سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں شیخ محمدی کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تمہیں شیخ کی مریدی کا اقرار ہے تو احکام شرع شریف سے اِس رسالہ کے مقدمات کو مطابق کر کے بتاؤ اور اگر مطابق نہیں کر سکتے تو اُس کی مریدی سے استغفار کرو اور کتاب کو آگ میں ڈالدو۔ شیخ محمدی نے جواب دیا کہ نہ مجھے اُن کی مریدی سے انکار ہے نہ استغفار کی ضرورت۔ لیکن جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک رسائی حاصل نہیں ہے جس وقت میں اِس رتبہ کو پہونچ جاؤنگا تو آپ کی درخواست کے بموجب اس کی شرح لکھ بھیجونگا اور اگر بادشاہ نے اِس رسالہ کا جلانا ٹھان لیا ہے تو اس فقیر متوکل کے گھر سے کہیں زیادہ شاہی مطبخ میں آگ موجود ہے حکم دیا جائے کہ یہ رسالہ اور اس کی جس قدر نقلیں دستیاب ہوں آگ میں جھونک دی جائیں بادشاہ اِس جواب کو سنکر ساکت رہ گئے[1]

---

[1] مراۃ الخیال (تذکرہ محمد بیگ) نسخہ قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن صفحہ ۱۶۶ ملاحظہ ہو

اس کے پڑھنے کے بعد ہمیں خیال ہوتا ہے کہ اگر سید احمد خاں مرحوم نے ملائکہ وغیرہ کی نسبت اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تو کون سی ایسی خطا کی۔ ایک ابلہ فریب عالم نما مولوی اپنی تفسیر قرآن میں جس میں اس نے عوام اور جہال کے خوش کرنے کا بہت کچھ سامان جمع کیا ہے لکھتا ہے کہ سر سید نے یہ خیالات برہمو سماج سے لئے اور اپنی نیک نیتی سے ضمناً اس عامیانہ خیال کو بھی تحریر میں لایا ہے کہ سر سید نے انگریزوں کو اطمینان دلایا کہ میں مسلمانوں کو نہ صرف مطیع سرکار بناتا ہوں بلکہ ان کے مذہب کی بیخ و بنیاد بھی کھوکھلی کئے دیتا ہوں۔ افسوس اس زمانہ کے مولوی کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ سلف صالحین میں سے بعض نامور بزرگ اور شیوخ ان مسائل پر اس قسم کے خیالات صاف و صریح الفاظ میں بیان کر چکے ہیں چنانچہ مولانا بحر العلوم فرماتے ہیں۔

جبرئیل کہ مشہور رسل علیہم السلام است و وحی
از جانب حق می رساند آن حقیقت جبرئیلیہ است
است کہ توتے از قوائے رسل بود متصور شدہ در عالم
مثال بصورتے کہ مکنون بود در رسل مشہود می شود
و مرسل می گردد و پیغام حق می رساند پس رسل مستفیض
از خود اند نہ از دیگرے[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۶۰) ماٰثر الامرا جلد سوم صفحہ (۲۰۶) مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ

[1] سوانح مولانا روم مولفہ شبلی نعمانی صفحہ (۱۲۶)

اِسی طرح مولانا روم اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

اِس کتاب کی فصل ثانی کے دیباچہ میں جس میں علم پر بحث ہے آزاد نے ایک مہمل اور غلط قصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ایران کے کتب خانوں کے جلانے کا بھی لکھدیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب سعد بن وقاص نے ملک فارس کو فتح کیا اور وہاں فلسفہ کی بے شمار کتابیں ہاتھ لگیں تو انہوں نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ انہیں کیا کیا جائے انہوں نے جواب دیا کہ اگر ان میں ہدایت ہے تو خدا نے ہمیں بھی اِس سے ہدایت دی ہے اور اگر ضلالت ہے تو خدا ہمارے لئے کافی ہے انہیں پانی یا آگ میں ڈالدو۔

اول تو اس میں ایک صریح تاریخی غلطی یہ ہے کہ سعد بن وقاص نے ملک ایران کو فتح نہیں کیا اور یہی غلطی مشہور مورخ ابن خلدون سے کی ہے[1]۔ غالباً مولانا آزاد کا ماخذ بھی ابن خلدون ہے کیونکہ بعینہٖ یہی الفاظ اس میں ہیں۔ دوسرے مسلمانوں نے جب ایران کو فتح کیا تو وہاں اسقدر کتب خانے کہاں تھے، علم کا چرچا ایران سے بہت زمانہ پہلے سے اُٹھ چکا تھا یہاں تک کہ جب سکندر نے ایران فتح کیا تو اُس وقت بھی کتب خانوں کا نام و نشان نہ تھا۔

البتہ یہ قصہ اسکندریہ کے متعلق متعدد تاریخوں میں بیان کیا گیا ہے

---

[1] دیکھئے مقدمہ ابن خلدون (۴۰۰)

اور ابن خلدون نے اور بعد میں آزاد نے غلطی سے اِس قصے کو ایران سے منسوب کیا ہے لیکن شمس العلما مولانا شبلی اِس کی تردید نہایت تحقیق و تنقید کے ساتھ کر چکے ہیں اور اب اُس کے متعلق کچھ لکھنا بے سود ہے تاہم ایک دو باتیں اِس کے متعلق کہنا ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا نے بڑی شد و مد اور تحقیق سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ اِس قصہ کا ماخذ ابو الفرج ہے سب سے اول اسی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور اور دوسروں نے نقل کیا[1]۔ لیکن ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ابو الفرج[2] سے قبل عبد اللطیف بغدادی اپنے رسالہ افادۃ الاعتبار میں ضمناً اس واقعہ کی طرف اِشارہ کر چکا ہے۔ مولانا نے نہایت سختی سے جھنجلا کر اس کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عبد اللطیف بغدادی نے اِس کا ذکر مورخانہ حیثیت سے نہیں کیا بلکہ ضمناً تذکرہ کیا ہے اور جن یوروپین مورخوں کا یہ بیان ہے کہ سب سے اول عبد اللطیف نے اس کو اپنی کتاب میں لکھا ہے اون کا بڑی حقارت سے ذکر کیا ہے اور ان پر فریب دہی اور تدلیس کا الزام لگایا ہے میں یہ مانتا ہوں کہ عبد اللطیف نے مورخانہ حیثیت سے اس کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ "یذکر" کے تحت میں اس کو لکھا ہے' اِس کا بھی اعتراف ہے کہ اس کے ساتھ

---

[1] رسائل شبلی دکتب خانہ اسکندریہ صفحہ ۱۳۱ و ۱۳۲ [2] یوحنا ابو الفرج عیسائی پیدائش سنہ ۶۲۳ھ ہجری۔ موفق الدین عبد اللطیف بن یوسف بغدادی سنہ پیدائش

جس قدر واقعات بیان ہوئے ہیں وہ سب بازاری گپیں[1] ہیں۔ لیکن اِس کا کیا علاج کہ یہ واقعہ عبداللطیف کی کتاب میں ابوالفرج سے قبل مذکور ہے اور کم سے کم "یذکر" کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عبداللطیف کے زمانہ میں لوگوں کی زبان زد ضرور تھا اور بلاشبہ ابوالفرج سے قبل مشہور تھا۔ البتہ اِس میں شک نہیں کہ جس شان سے اور نمک مرچ لگا کر اس نے بیان کیا ہے اس سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا اور اس سے بعد کے مورخین نے بے سوچے سمجھے نقل کر کے سب جگہ پھیلا دیا۔ لیکن اِس کا پتہ لگانا ابھی باقی ہے کہ یہ واقعہ مشہور کیسے ہوا اور ابوالفرج سے پہلے اِس کا چرچا کیسے تھا۔ غالباً باہمی عناد اور تعصب اِس قصہ کی ایجاد کا باعث ہوا ہے۔ مفتوح قوم فاتح قوم پر اکثر ایسے الزام بعد میں قائم کر دیا کرتی ہے اِن میں سے ایک یہ بھی ہے جس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے۔ علاوہ اِس کے مولنا شبلی نے اِس رسالہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ سوائے عبداللطیف ابوالفرج، مقریزی اور حاجی خلیفہ کے کسی اور کتاب میں اِس قصہ کا ذکر نہیں۔ اور اِسی کے ساتھ متعدد کتابیں جو مصر و اسکندریہ کے حالات میں لکھی گئی ہیں نام بنام گنوائی ہیں کہ اُنمیں سے کسی میں اِس کا حوالہ نہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے انہیں کتابوں میں سے ایک تاریخ الحکما[2] القفطی ہے جس میں یہ قصہ منقول ہے غالباً یہ کتب

---

[1] رسائل شبلی (کتب خانہ اسکندریہ) صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۹۔ [2] تاریخ الحکما جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی مطبوعہ لیپ سک ۱۳۲۰ھ صفحہ ۳۲۵-۳۵۶۔

حال ہی میں چھپی ہے اور اس لئے مولانا کی نظر سے نہیں گذری تھی۔ اس کے علاوہ دوسری کتاب مفتاح السعادۃ[1] ہے جو ایک ترکی عالم و فاضل طاش کبری زادہ (پیدائش سنہ ۹۰۱ھ وفات سنہ ۹۶۸ھ) کی تصنیف سے ہے افسوس کہ یہ بیش بہا کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی لیکن اِن کتابوں میں اِس قصہ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیوں کہ اِن دونوں صاحبوں نے بغیر کسی تحقیق کے ابوالفرج سے لفظ بہ لفظ نقل کرلیا ہے یا ممکن ہے کہ طاش کبری زادہ نے ثعلبی سے نقل کیا ہو، عبارت سب کی ایک ہے۔

خاک بلگرام میں ایک اور ایسا جید فاضل ہو گذرا ہے جسے فخر علمائے ہند کہنا بجا ہوگا علمائے ہند کے حالات میں کوئی کتاب اِس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس میں علامہ سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس کا تذکرہ نہو۔ یہ آزاد بلگرامی کے ہمعصر تھے۔ ہمارے دل نے ہرگز یہ گوارا نہ کیا کہ یہ کتاب جو علمائے ہند اور خصوصاً علمائے بلگرام کا تذکرہ ہے اِس فاضل بے عدیل کے حالات سے خالی رہے لہذا یہ تذکرہ آخر کتاب میں اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے اس شخص کے تبحر اور کمالات علمی کا حال معلوم ہوگا۔

---

[1] نسخہ کتب خانۂ آصفیہ صفحہ ۴۳۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۂ مخزنِ نکات

شیخ محمد قیام الدین (قائم) چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مختلف تذکرہ نویسوں نے کسی قدر اختلاف سے لکھا ہے۔ مثلاً میر صاحب اپنے (نکات الشعرا) میں اور میر حسن اپنے تذکرے میں محمد قائم لکھتے ہیں۔ علی ابراہیم اور لطف نے بھی اسی کی تقلید کی ہے۔ مصحفی نے قیام الدین علی لکھا ہے گردیزی بھی محمد قائم ہی لکھتا ہے۔ کمال اور گارساں دتاسی قائم الدین بتاتے ہیں۔ لیکن اصل نام محمد قیام الدین ہی ہے جیسا کہ خود انہوں نے اس تذکرے کے شروع میں لکھا ہے۔ میر صاحب اور مصحفی ان سے ذاتی طور پر واقف تھے۔

اگرچہ قائمؔ چاند پور کے رہنے والے تھے لیکن ملازمت کے سلسلے میں "بد و شعور" سے اُن کا رہنا دلی میں ہوا۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں وہ شاہی توپ خانے کے داروغہ ہو گئے۔ چنانچہ یہ تذکرہ بھی اُسی زمانے میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب کہ اُن کا قیام دلی میں تھا جب وہ دلی پہنچے ہیں تو میر تقی، خواجہ میر درد، سودا وغیرہ جیسے باکمال اُستاد وہاں موجود تھے اور اُردو شاعری شباب پر تھی۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں خواجہ میر درد سے اصلاح لی مگر کچھ دنوں بعد مرزا رفیع السودا کے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ "یہ اول شاہ ہدایت کے شاگرد ہوئے، اُن سے ایسی بگڑی کہ ہجو کہی۔ تعجب یہ ہے کہ شاہ موصوف باوجودیکہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت میں رکھتے تھے مگر انہوں نے بھی ایک قطعہ اُن کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے، اُن کے حق میں بھی کہہ سُن کے الگ ہوئے پھر مرزا کی خدمت میں آئے اور اُن سے پھرے مرزا تو مرزا تھے، انہوں نے سیدھا کیا" اگرچہ اس تذکرے میں انہوں نے میاں ہدایت اللہ "ہدایت" اور خواجہ میر درد دونوں کی بہت تعریف کی ہے اور کہیں ملال کا اظہار نہیں کیا، لیکن اپنی شاگردی اور مشورے کا بھی ذکر نہیں کیا۔ البتہ اُن کا دیوان دیکھنے پر ایک غزل میں یہ اشعار نظر آئے جن سے آزاد کے قول کی تصدیق ہوتی ہے

حضرت درد کی خدمت میں میرا ... نے[1] عرض کی یوں کہ

---

[1] اصل نسخے میں اسی طرح لکھا ہے۔ یہاں کوئی لفظ رہ گیا ہے۔

اے استاد زماں سنتے ہو امروہو سے تو ہدایت کو کروں
میں سید حا وا ں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو راست
ہوتے ہیں کسو سے بھی کبھی کج طینت تیر بنتی ہے کہیں
شاخ کماں سنتے ہو۔

مرزا کے حال میں بھی اگرچہ اپنی شاگردی کا اشارہ نہیں کرتے مگر
ذکر اس طرح سے کیا ہے جو ایک سعادت مند شاگرد کے شایاں
ہے۔ اور اپنی غزل کے ایک مقطع میں تو صاف صاف اس کا اقرار
کیا ہے :-

(قائم) بفیض حضرت (سودا) ہے ورنہ میں
طرحی غزل سے دمیر) کے آتا تھا بر کہیں

لیکن کچھ عرصے بعد جب امور سلطنت میں اختلال پیدا ہوا اور
امن وامان اور فارغ البالی جاتی رہی تو وہ باکمال بھی جن کی بدولت
دلی دلی تھی، ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگے اور وہ صحبتیں جو شعر
وسخن کی جان تھیں، خواب وخیال ہو گئیں۔ قائم بھی دل برداشتہ ہو کر
وطن چلے آئے اور کچھ دنوں ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں کی سرکار میں
بسر کی۔ مصحفی بھی اُن دنوں اسی سرکار کے متوسل تھے۔ دونوں کی ملاقات
یہیں ہوئی۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ اُس وقت وہ لباس درویشی میں تھے
نواب بڑی فیاضی سے اہل علم کی سرپرستی کرتے تھے اور شعر وسخن
سے خاص ذوق رکھتے تھے چنانچہ قائم نے اپنی غزل کے ایک مقطع

میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے :-

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سا اے آمیر
مجتمع سایہ میں ہیں جس کے سخنداں اتنے

آمیر، نواب محمد یار خاں کا تخلص تھا۔ تین ماہ سے زیادہ نہ رہنے پائے تھے کہ یہاں وہی انقلاب رونما ہوا۔ جو ہندوستان میں اس وقت ہر جگہ بپا تھا۔ قائم مجبور ہو کر رام پور چلے گئے اور نواب فیض اللہ خاں والی رام پور کے بیٹے احمد یار خاں نے اُن کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی اور فوجی خدمت انجام دیتے رہے۔ لیکن اس تنخواہ میں ان کی بسر نہ ہوتی تھی۔ جب زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ پہنچے اور راجہ ٹکیت رائے سے اپنے وطن کے عامل کے نام شقے اور پروانے حاصل کئے تاکہ اپنی قدیمی ملک اور یومیہ بحال کرائیں۔ اس میں انہیں کامیابی ہوئی مگر رام پور پہنچتے ہی اجل نے آلیا اور سنہ ۱۲[illegible]ھ میں انتقال کر گئے۔

ان کے سنہ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ مصحفی نے وفات کا کوئی سنہ نہیں لکھا صرف اتنا لکھا ہے کہ رام پور سے انتقال کی خبر پہنچی۔ مصحفی کا تذکرہ ۱۲۰۷ - ۱۲۰۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ علی ابراہیم (اور لطف) فیلن اور کریم الدین نے سنہ ۱۲۱۰ھ بتایا ہے۔ شیفتہ، اور بعض اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسی کو نقل کر دیا ہے گارساں دتاسی نے سنہ ۱۲۰۷ھ لکھا ہے۔ جرأت نے قائم کے انتقال کی تاریخ اس شعر سے نکالی ہے :-

جراتؔ نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات   یکتائی کے ساتھ
'قائمؔ' بنیاد شعر ہندی نہ رہی۔   کیا کہیئے اب آہ

اس مصرع سے ۱۲۰۸ھ ہی نکلتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔
'قائمؔ' کی شاعری کی سب تذکرہ نویسوں نے تعریف کی ہے
اور اکثر نے میرؔ و مرزاؔ کے بعد اُس کو مانا ہے۔ بعض تو اُسے 'سوداؔ'
سے بھی بڑھ کر مانتے ہیں۔ مصحفیؔ لکھتے ہیں:-

"در پختگیٔ کلام و چستی مصراع غزل و ردیف قصیدہ و مثنوی و غیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد راہ می رود، بلکہ در بعضے مقام غلبہ می جوید"۔

علی ابراہیم یا لطفؔ کہتے ہیں:-

"سچ تو یہ ہے کہ بعد سوداؔ اور میرؔ کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طور گویائی کا۔ اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے"۔

آزادؔ کی رائے ہے کہ

"ان کا دیوان ہرگز میرؔ و مرزاؔ کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے مگر کیا کیجئے کہ قبول عام کچھ اور شے ہے، شہرت نہ پائی"۔

میر حسنؔ فرماتے ہیں کہ۔

"طرزش بطرز طالبؔ آملی می ماند۔ مثنوی ہا بسیار گفتہ

دبیسے دریاہائے معانی سفتہ کہ کسے کم گفتہ"

کریم الدین رفیلن کی رائے ہے کہ

"عجب طرح کا شاعر خوش گفتار، بلند مرتبہ، موزوں طبع عالی مقدار ہے کہ اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کر سکتے .... بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں، حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ اور بے استعداد جو اس کو برابر سودا کے گنتے ہیں۔ خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں"۔

بخلاف اس کے شیفتہ کی رائے میں انہیں سودا کا ہم پلہ سمجھنا سودا ہے۔ البتہ وہ اُن کے قطعات و رباعیات کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قائم بہت بڑا شاعر ہے، لیکن اُسے میر و مرزا کا ہم رتبہ کہنا سراسر نا انصافی ہے۔ اس کا کلام ہر صنعت میں موجود ہے۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند، تاریخ سب کچھ کہا ہے۔ ہجو کہنے اور فحش بکنے میں وہ اپنے استاد کے ہم پلہ ہے۔ متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں بعض قصے سلیقے سے نظم کئے ہیں، قصیدوں میں بھی زور پایا جاتا ہے۔

اکثر تذکرہ نویسوں نے اُن کے تذکرہ شعرا کا ذکر کیا ہے، جو اب تک نایاب تھا اور اب شائع کیا جاتا ہے۔ قائم کا دعویٰ ہے کہ

اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میر اور علی الحسینی الگردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائم کو ان تذکروں کی اطلاع نہ تھی، لیکن ڈاکٹر شبر نگر کا یہ کہنا کہ قائم نے جو اقتباسات ریختے کے شاعروں کے دئے ہیں وہ وہی ہیں جو گردیزی کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ دونوں تذکرے ہمارے سامنے ہیں، اشعار کے انتخابات اور حالات دونوں مختلف ہیں۔

خواجہ اکرم نے اس تذکرے کے لئے ایک قطعہ تاریخی لکھا تھا۔ جس میں مادۂ تاریخ "مخزن نکات" تھا، قائم کو یہ مادہ پسند آیا اور تذکرے کا یہی نام رکھ دیا۔ اس سے سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ نکلتا ہے۔ اس میں قائم سمیت ۱۱۴ شعرا کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ یہ تذکرہ مختصر ہے، مگر بعض حالات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ قائم نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقۂ اول میں متقدمین کا، طبقۂ دوم میں متوسطین کا اور طبقۂ سوم میں متاخرین کا ذکر ہے۔ اگرچہ میر تقی میر نے بھی اپنے تذکرۂ نکات شعرا میں دکن کے شعرا کا ذکر کیا ہے، لیکن قائم نے اس کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"باید دانست کہ چوں فن ریختہ در آں وقت از محل اعتبار ساقط بود بنا بر علیہ ہیچ کس بر توغل آں اقدام نمی نمود"

ہیں دو چار سہ بیت کہ از انی کہ بنام اساتذہ معتبر مرقوم است
اغلب کہ منشائے تلاشش ہزلے بیش نباشد، اما بعد ازیں
بسمت بلاد دکن در عہد عبد اللہ قطب شاہ کہ با سخنوراں
بہ محبت و سوا سابیش می آمد، ریختہ گفتن بر زبان دکھنی
بسیار رواج گرفت"۔

اگرچہ عبد اللہ قطب شاہ عہد سے اس کی ابتدا قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ اس سے قبل سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ خود بڑے شاعر گزرے ہیں، تاہم "قائم" نے دکھنی ریختے کو خاص اہمیت دی ہے۔ اگرچہ وہ اس شاعری کے زیادہ قائل نہ تھے، چنانچہ ان کا شعر مشہور ہے :-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
ایک بات لچر سی بزبان دکھنی تھی

قائم نے طبقۂ اول کی ابتدا شیخ سعدی شیرازی سے کی ہے اور لکھا ہے کہ اس پر جمہور کا اتفاق ہے۔ کہ جب شیخ سعدی گجرات میں تشریف لائے اور جیسا کہ 'بوستان' میں مذکور ہے سومنات کی مجاوری کی یہاں زبان سے واقفیت حاصل کرکے ایک دو غزلیں ریختے میں لکھیں۔ اگرچہ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن سعدی کے نام سے جو ایک مشہور غزل فارسی اردو کی ملی جلی چلی آرہی ہے، اس کی نسبت عام طور پر یہی خیال تھا کہ شیخ سعدی شیرازی کی تصنیف ہی ہے چنانچہ

اپنے تذکرے میں اس خیال کی تردید کی ہے۔ سعدی کے بعد امیر خسرو کا ذکر کیا ہے اور پھر دوسرے قدیم شعرا کا۔

ہر طبقے کے شروع میں اس طبقے کے شعرا کی خصوصیات کا مختصر ذکر کر دیا ہے اور ان کی رائے اس بارے میں بہت خوب اور صائب ہے۔ بعض بعض شعرا کے کلام کے متعلق بھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ بہت کم ہے۔ اس خصوص میں میر صاحب کے تذکرے کو فوقیت حاصل ہے۔ بیان صاف اور سیدھا ہے عبارت آرائی اور تشبیہ و استعارہ سے کم کام لیا ہے۔ تذکرے کے آخر میں قائم نے اپنا ذکر بھی مختصر طور پر کیا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "ہر چند از باشندگان قصبہ چاند پور است اما از بدو شعور تا ایں حال بتوسل نوکری بادشاہی بدار الخلافت شاہجہاں آباد گزراندہ"۔ اس سے زیادہ اس تذکرے میں اُن کے حالات کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے رخصت ہونے سے قبل ہی یہ تذکرہ تحریر میں آ گیا تھا کیونکہ اس کے بعد ہی وہ لکھتے ہیں کہ شاہی انتظام میں خلل آجانے کی وجہ سے میں نے سفر کا ارادہ مصمم کر لیا تھا لہٰذا فرصت کو غنیمت سمجھ کر ان حالات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا۔

قائم کی شاعری کے ساتھ یہ تذکرہ بھی بلا شبہ قابل قدر ہے اور اس سے اردو شعرا کے حالات اور کلام کے متعلق بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

قائم نے اپنے تذکرے کے ساتھ اپنے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے

لیکن یہ انتخاب بہت ہی کم ہے اور وہ بھی الف کے چند شعر ہیں۔ اس لئے ہم یہاں اس کے کلام سے کچھ اور اشعار بھی درج کرتے ہیں تاکہ سخن فہم اُس کے کلام کی خوبی کا اندازہ کر سکیں۔

لیکن انتخاب سے قبل ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بعض نظمیں سودا اور قائم دونوں کے کلیات میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً موسم سرما کے ہجو میں جو مثنوی ہے اور جس کا مطلع یہ ہے :-

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

دونوں کے کلیات میں بے کم و کاست درج ہے۔ لیکن نظم غالباً سودا کی ہے۔ کیونکہ اسی کے ساتھ کی دوسری مثنوی موسم گرما کے ہجو میں موجود ہے۔ لیکن میر حسن کے تذکرے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے قائم ہی کی مثنوی خیال کرتے ہیں۔ ایک اور طویل عشقیہ مثنوی جس کا پہلا شعر یہ ہے :-

الٰہی شعلہ زن کو آتش دل ۔۔۔ تب دل دے بقدر خواہش دل

لطف یہ ہے کہ مثنویوں کے آخر میں سودا کے کلیات میں سودا کا اور قائم کے کلیات میں قائم کا تخلص موجود ہے۔ اس سے صحیح فیصلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ مثنوی قائم ہی کی ہے جو غلطی سے سودا کے کلیات میں درج ہو گئی ہے۔ اسی طرح

اور کئی مثنویاں جن میں چھوٹے چھوٹے قصے اور حکایتیں منظوم کی ہیں۔
دونوں کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں۔

انتخاب

قائم کے پہلے تین شعر عام طور پر مشہور ہیں اور بہت مقبول
ہوئے ہیں:۔

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ[1] — کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
نے تجھ پہ وہ بہار رہی اور نہ یہاں وہ دل
کہنے کو نیک و بد کے ایک الزام رہ گیا

اٹھ جائے گر بیچ سے پردہ حجاب کا
دریا ہی پھر تو نام ہے ہر ایک حباب کا
کیوں چھوڑتے ہو در و تہ جام مے کشو
ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا

---

[1] (ن) ٹوٹا جو کعبہ کون یہ

ایسی ہوا میں پاس نہ ساقی نہ جام ہے
رونا بجا ہے حال پہ تیرے سحاب کا

اس دشت پر سراب میں بھٹکے بہت حبیبؔ
دیکھا تو دو قدم پہ ٹھکانا تھا آب کا

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا
تیر سا کچھ دل سے گزر کر گیا

خاک سا ڈھیر سر رہ ہوں میں
قافلۂ عمر سفر کر گیا

چھپ کے ترے کوچے سے گزرا لیک
نالہ ایک عالم کو خبر کر گیا

تا بفلک نالہ تو پہنچا تھا رات
میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

پوچھ نہ قائمؔ کٹی کیونکر عمر
جون ہوا ایک چند بسر کر گیا

فلک جو دے تو خدائی تو لے نہ اب قائمؔ
وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یہاں حسن سے بھی دور گیا

برنگ طائر نو ہم اسیر اے صیاد
وہ ہیں کہ جن کا گلوں بیچ آشیانہ تھا

معاملہ یہ ہے دل کا اسے کہے گا وہ کیا
پیامبر کے ہیں آپ ساتھ جانا تھا

یہ سچ کہ جھوٹ ہے دعوائے دوستی لیکن
سمجھی ہیں بھی تو اک بار آزمانا تھا

رہبر فرقۂ اسلام رہا ساری عمر — حیف پر یہ ہے میں آپ مسلماں نہ ہوا
دیکھ مجھکو کہ سلیماں کا دیا زور مجھے — ایک چیونٹی سے یہ میں دست گریباں نہ ہوا
تھا گل تازہ میں پر حیف کہ بخت بد سے — زینت گوشۂ دستار عزیزاں نہ ہوا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی من گیا

کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہے صیاد
ترے قفس سے چمن مجھ پہ تنگ ہے صیاد
گرفتہ طبع جو مجھسا چھٹا قفس سے تو کیا
رہائی جس کی اسیری کا ننگ ہے صیاد
نہ گل بجا نہ بلبل چمن میں نغمہ سرا
مری خلاصی میں اب کیا درنگ ہے صیاد
قفس کی تنگی سے میں ہی تنگ ہوں قائمؔ
مری بھی تنگیٔ حالت سے تنگ ہے صیاد

کی کس کی نگاہوں نے یہ تاثیر ہوا پر
چلتی ہے جو یہ برق سی شمشیر ہوا پر
جی میں ہے میاں آج نگہ کی تری تیغ چمن

کیجے قلم ز قیمت تحریر ہوا پر

ست قصر کو ہستی کے گرا دیکھ کہ غافل
مانند حباب اس کی ہے تعمیر ہوا پر
کب بند ہوں بزنگ تعلق میں سبک روح
کھنچتی ہی کون رنگ سے تصویر ہوا پر

بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سحر کر
دے طول امل نہ وقت پیری
ہوئی صبح فسانہ مختصر کر
کچھ طرفہ مرضی ہے زندگی بھی
اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

نہیں کہتا میں دل ترک تمنا
یہ جتنی ہو سکے اتنی ہوس کر
فریب باغباں پہ ہو کے غافل
نہ اے بلبل اسے کشتہ خار و خس کر
بہار عمر ہے قائم کوئی دن
اسے جوں گل پیارے کاٹ ہنس کر

ہے بے اثر ایسی ہی جو اپنی کشش دل
جی لے ہی کے چھوڑے گی یہ ایک خلش دل
تھا تو مجھے آدیں کوئی اس کی کہ ناگاہ
لے جائے نہ گھر سے کہیں باہر تپش دل
زہر آب وہاں سے جو کچھ کام نہ نکلا

دے کر کے میں کی خون جگر پرورش دل
کس طرح کوئی گزرے ترے رہ سے پیارے
ہر گام پہ اس کوچے میں ہے جو خلش دل
ہاتھوں سے دل و دیدہ کے آیا ہوں بہت تنگ
آنکھوں کو روؤں یا میں کروں سرزنش دل

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم | پھر تجھکو نہ منہ دکھائیں گے ہم
مشکل ہے نہ آنا تجھ گلی سیں | پر یہ بھی سہی نہ آئیں گے ہم
جو آگے کہا کئے ہیں تجھ سے | سو اب کے وہ کر دکھائیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا | ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں | اس عہد سے بر نہ آئیں گے ہم
گر زیست ہی تجھ تلک تو پھر کیا | صدقے ترے مر ہی جائیں گے ہم
جوں چاہئے چاہ کا ہے رشتہ | جیتے ہیں تو کر دکھائیں گے ہم
اس پر بھی اگر ملیں گے تو خیر | قائم ہی نہ پھر کہائیں گے ہم

قائم جگہ ہر رونے کی یہ حالت تباہ
اس صحن گلستاں کے وہ ہیں دل فگار ہم
کھٹکا صبا کے پاؤں کا سن کر برنگ بو
آغوش گل میں ہوتے تھے نت بیقرار ہم

کیا جانتے تھے ہم کہ یہ ایک دن بہے گی راہ
اس مرتبہ کو ہوئیں گے بے اقتدار ہم

میرا اسلوب و لہجہ کہاں مرغ چمن میں
گل کتروں ہوں سو رنگ کے میں طرز سخن میں
غربت میں مرا حال جو دیکھے ہے تو قاصد
زنہار نہ کہیو اسے یاران وطن میں

ایک جا گر پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں
پائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اٹھا
جس نے دیکھا تجھے یک بار سر بام کہیں
عذر تقصیر بھی چاہوں گا میں اس سے اے دل
ٹک تو خاموش ہو دینے دے وہ دشنام کہیں
عزم کعبے کا تو قائم تو کیا ہے لیکن
رہن ہے کچھ نہ وہاں جامۂ احرام کہیں

ایک آب و تاب مہ و آفتاب رکھتے ہیں
یہ روکشی کی تری کب وہ تاب رکھتے ہیں

زبانِ عشق شکایت سے لال ہے ورنہ
ہم ایک گلے کے ترے سو جواب رکھتے ہیں

حسنِ معنی چاہیئے تزئینِ ظاہر ہیچ ہے
کیا کرے اس گل کو لے کے کوئی کہ جس میں بو نہیں
مدتوں اہلِ حرم پر حکمرانی کی ہے یاں
کیا ہوا گر مے کدے میں آج ہم کو رو نہیں
خوبرو دو دن کسی کے ساتھ کر لیں اختلاط
پر جو یہ چاہو کہ یہ ہوویں کسو کے سو نہیں
وضعِ دوراں کو خوشامد دوست ہے قائمؔ تو ہو
ہر کس و ناکس سے دب چلنا یہ اپنی خو نہیں

ہمسری اس قدِ رعنا سے ہے اے سرو غلط
تو بھی ہر چند ہے موزوں پہ یہ انداز کہاں
دل سے رخصت ہو بس اے خواہشِ گلگشت کہ اب
تابِ رفتار کدھر طاقتِ پرواز کہاں
ہمتِ عشق نہ ہو حسنِ خط و خال میں بند
صیدِ ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہاں
قائمؔ اس باغ میں بلبل تو بہت ہیں لیکن

دل لگالیے [illegible] سے جس کے وہ ہم آواز کہاں

غیر اس کے کہ خوب روئیے اور | غمِ دل کا کوئی علاج نہیں
اب بھی قیمت ہے دل کی گوشۂ چشم | اتنی یہ جنس بے رواج نہیں
نہ حرارت تو اسے طبیب کہ یہ | دل کا دھڑکا ہے اختلاج نہیں
وہ جہاں بھی ملے تو بس ہی ہیں | یہاں مجھے اتنی تو احتیاج نہیں
یا ئی

مجلسِ مے سے مشابہ ہے خرابات جہاں
جان کر یہاں جو نہ ہو مست وہ ہشیار نہیں
مے کی تو یہ کو مدت ہوئی قائم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں | دونوں عالم سے پھرے بیٹھے ہیں
چوں نمِ اشک تو کس سے ہے خفا | یہاں کوئی پل میں گرے بیٹھے ہیں
درد دل کیونکر کہوں میں اس سے | ہر طرف لوگ گھرے بیٹھے ہیں

کہاں کا غرۂ شوال کیسا عشرۂ ذی حج کا
ہمیں ہاتھ آئے مے جس دن ہم اُس دن عید کرتے ہیں
مزاج خس ہے اہلِ عشق کا جلنے کے عالم میں

۳۸۵ ھ

جلاتا ہے جو اُن کو اس کی یہ تاثیر دیکھی ہے
یہ کاسہ سر تلے رکھے جو بیٹھا ہوں تو پیاسے بیٹھے ہیں
جسے چاہیں اسے اک جام دیں جمشید کرتے ہیں
جنہیں کچھ سلسلہ ہے عشق سے تحقیق حاصل ہے
وہ کب مجنوں سے گمراہ کی تقلید کرتے ہیں
نہ جانے کیسے کس قالب میں قائم درد دل اس کا
نہیں آتی زباں سے دل میں جو تمہید کرتے ہیں

نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھو جو روئے ہیں خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے
حباب وار نفس دم رہا ہے آنکھوں میں
وہ محو ہوں کہ مثال حباب آئینہ
جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

جوں شمع دم صبح میں یہاں سے سفری ہوں
تک منتظر جنبش باد سحری ہوں
جاتا ہوں میں ہمیشہ وہ شمشیر کے نیچے
گویا کہ میں گرد قدم رہ گذری ہوں

نے گریۂ شب ہوں میں نہ آہ سحری ہوں
جوں بانگ جرس نیم نفس بے اثری ہوں
دیکھا نہیں جز سایۂ بازوئے شکستہ
حیراں زدہ جوں حسرت بے بال و پری ہوں
ہے سا پیراہن اپنے میں سماتا نہیں جوں گل
جس وقت سے آمادہ پئے جامہ دری ہوں
سو خضر سے کم حوصلہ واں جی سے گئے ہیں
جس دشت خطرناک کا میں رہ گذری ہوں
جوں سرو رکھا سنگ جفا سے مجھے آزاد
محروم تیرا جی سے میں اے بے ثمری ہوں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں — یہاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
تا کجا امتحان صبر کہ شوخ — دل ہے آخر یہ کچھ جماد نہیں
سچ ہیں سارے کمال حضرت شیخ — لیک دل کو کچھ اعتقاد نہیں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات — ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں
ہو سکے کس سے داد خواہ بتاں — اس ستم کی جہاں میں داد نہیں
یار اگر چاہتا ہے دے قائم — جان کچھ دل سے تو زیادہ نہیں

جوں شیشہ بھرا ہوں مے سے لیکن — مستی سے میں اپنی بے خبر ہوں

جو کہئے سو یہاں سے ہے فروتر   کیا جانے ہیں کس مقام پر ہوں

کونسا دن کہ مجھے اس سے ملاقات نہیں
لیک جی چاہے ہے جوں ملنے کو وہ بات نہیں

ہوس ہے عشق کی اہل ہوا کو ہم تو میاں
سنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

عبث ہیں ناصحا ہم سے زخود رفتوں کی تدبیریں
رکے ہے بحر کب گو موج سے ہوں لاکھ زنجیریں
ہماری آہ سے آگے تو پتھر موم ہوتے تھے
یہ کیا جانے وہ اب کیدھر گئیں نالے کی تاثیریں
گریباں کی تو "قائم" مدتوں دھجیں اڑائی ہیں
پہ خاطر جمع اس دن ہوئے جب سینے کو ہم چیریں

آوے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کروں
غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کروں
"قائم" یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ کی
اب کے جو میں نماز کروں بے وضو کروں

یوہیں رنجش ہو اور گلا بھی یوہیں — ہو جیے ہر بات پر خفا بھی یوہیں
کچھ نہ ہم کو ہی بھا گیا یہ طور — واقعی یہ کہ ہے مزا بھی یوہیں
صید گنجشک سے نہ ہاتھ اٹھا — آکے پھنس جائے ہے ہما بھی یوہیں
کیوں نہ روؤں میں دیکھ خندۂ گل — کہ ہنسے تھا وہ بے وفا بھی یوہیں

نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں
یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھلجڑیاں[1]

کمال جگ میں سزاوار ناز ہے یہ سچ
یہ ناز کرنے کو انساں میں کچھ کمال بھی ہو

عاشق نہ تھا میں بلبل کچھ گل کے رنگ و بو کا
ایک انس ہو گیا تھا اس گلستاں سے مجھ کو

ٹک تو خاموش رکھو منہ میں زباں سنتے ہو
اپنی ہی کہتے ہو میری بھی میاں سنتے ہو
سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

---

[1] (ن) گل پھڑیاں۔

خشک و تر پھونکتی پھرتی ہے سو آتش عشق
بچیو اس آنچ سے اے پیر و جواں سنتے ہو

کچھ لکھوں سوز دل اپنے سے اُسے اے قاصد
جائے کاغذ ہو اگر بال و پر پروانہ
شمع تک جاتے تو دیکھا تھا میں اس کو قائمؔ
پھر نہ معلوم ہوئی کچھ خبر پروانہ
قائمؔ سمجھ کے بولیو تو آپ کے حضور
پیارے معاملت ہے سخن آشنا کے ساتھ

یک شب دیکھی جن نے وہ زلف — لاکھوں دیکھے روز سیاہ
اتنی تو مت ہو جلد نسیم — ہم بھی چمن تک ہیں ہمراہ
کوندی ہے دل پر برق سی آج — پیش نظر ہے کس کی نگاہ
وعدہ کرکے رات کا تم — خوب ہی آئے واہ جی واہ
قائمؔ سے کوئی ہوئے خفا — بندۂ خادم دولت خواہ

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی
رو دیجے اس غم کدہ میں آج کس کس کو یہاں

دیکھتے نظروں سے اپنے اک خدائی کیا ہوئی
گو کسی حالت میں ہو میں مجھ سے ملول ہوں تجھے
ہے تو تو' وو ہی پہ تیری کبریائی کیا ہوئی

جوں موج میرا قافلہ غافل ہے سفر سے
کیا جانے کہاں جائے گا آیا ہے کدھر سے
کس رات میں جوں گل نہ ہوا غرق لہو میں
کس دن نہ بھری گود میری لخت جگر سے
وہ خار بیتیمی زدہ اس دشت میں میں ہوں
پالا ہے جسے آبلہ نے خون جگر سے

وسبدم اس بخشش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ
دل دیا تجکو تو ہم نے کچھ گنہگاری نہ کی

اگرچہ صبح تلک ہمدگر تھے گرم سخن
پہ کہہ سکا نہ کچھ اس سے میں بات مطلب کی
سوائے دل شکنی سب مباح ہے یہاں شیخ
خبر نہیں تجھے رندوں کے دین و مذہب کی
سوال بوسہ جو قائم کیا میں شب تو کہا

کیجے چھیڑ کہیں اور جا کے اس ڈھب کی
دم قدم تک ہے ہمارے ہی جنوں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو
میں کہا خلق تمہاری جو کمر کہتے ہیں
تم بھی اس کا کہیں کچھ ذکر و بیاں سنتے ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا خیر اگر ہے یوں بات
ہوئے گی ویسی ہی جیسی کہ وہاں سنتے ہو
نے ہجر چاہتا ہوں نہ وصل حبیب کو
یارب کہیں ہو صبر دل ناشکیب کو
وے بھی تو آدمی ہیں کہ جن سے ہے تم کو ربط
کیا شکوہ تم سے رو یئے اپنے نصیب کو

بھول کر بھی وہ نہیں یاد ہے جاتا اپنی
جان کو یاد ہے جس نے کہ بھلایا مجھ کو
کچھ تو تھی بات خلل کی کہ شب اس نے محرم
غیر کے آتے ہی مجلس سے اٹھایا مجھ کو
جی میں ٹھہریں تھیں جو کچھ سو گئیں وہ یار کے ساتھ
سر پٹکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ
اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کے سو چلے

بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ
میں دوانا ہوں سدا کا مجھے مت قید کرو
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
یارو کہتے تھے جو تم لالہ و گل ہے سو کہاں
سر پٹکنے تو ٹک آیا تھا میں کہسار کے ساتھ
ہائے صیاد یہ انصاف سے تیرے ہے بعید
یہاں تک کیجے ستم اپنے گرفتار کے ساتھ
گرچہ بلبل ہوں میں "قائم" ولے اس باغ کے بیچ
فرق کوئی نہ کرے گل کو جہاں خار کے ساتھ

آج اگر بزم میں ہے کچھ اثر پروانہ — اُٹھ گئے ہیں پائے لگن چند پر پروانہ
آتش عشق میں جلنا نہیں کار ہر کس — ہر کس سے نہ طلب کر جگر پروانہ
وضع پر اپنے ہیں یہاں شادی و غم اک کا — شام ماتم سے ہے کیا کم سحر پروانہ

ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے
دل مژہ تک پہنچ چکا جوں اشک — اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہے
آج قائم کے شعر ہم نے سنے — ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

جوں طفل سرشک ارغوانی — پامال ہوئی مری جوانی
ہر سانس گراں ہے تن پہ میرے — اللہ رے ضعف ناتوانی

دو چیز ہیں یادگار دوراں — تیرا ستم اپنی جانفشانی
ہے رشک مجھے پیامبر تک — گو تجھ سے کہے مری زبانی

وہ دن گئے کہ لہو آتا تھا چشم تر سے
اب لخت دل ہے کوئی یا پارۂ جگر ہے
غافل قدم کو اپنے رکھو سنبھال کر یہاں
ہر سنگ رہگزر کا دوکان شیشہ گر ہے

کب نالہ بلائے جاں نہیں ہے — کب آفت دل فغاں نہیں ہے
کب چشم پہ ناگوار نہیں خواب — کب دل پہ نفس گراں نہیں ہے
ہے کونسا دم کہ تازہ نوحہ — سر جوش لب و دہاں نہیں ہے
کس دن نہ دل برنگ اخگر — صد آتش غم نہاں نہیں ہے
کب رات ہوئی کہ چشم تر سے — جو نالۂ دل رواں نہیں ہے
سب کچھ ہے جو چاہیے مگر مہر — اک جنس ہے وہ کہ یہاں نہیں ہے
بس تابکجا اٹھائیں یہ غم — کیا ہم ہیں تو ہم میں جاں نہیں ہے
کہتا میں نہیں کہ ظلم ہے بد — پہ خوب تر مہرباں نہیں ہے
سو بات کہوں پر اس کے آگے — گویا منہ میں زباں نہیں ہے
قائم سا عزیز خوار ہو حیف — کوئی ہند میں قدرداں نہیں ہے

پھرے زمانہ جہاں تک ہے ہم سے یا نہ پھرے
کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے
فلک رلائے تو ہے ہم کو لیک یہ ڈر ہے
کہ بلبلہ سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے
ہزار حیف کہ گلچیں ہے اس جگہ گستاخ
میں جس چمن میں یہ چاہوں تھا یہاں صبا نہ پھرے

تھی خیر یہی کہ رات پیارے | تم غیر کی گفتگو نہ سمجھے
سمجھوگے ہمارے بعد ہم کو | پر حیف کہ رد برہ نہ سمجھے
ایک عرض تو تھی پہ اس سے پیارے | کیا کہیے جو بات کو نہ سمجھے
قسمت کہ وہ چارہ گر اپنا | جو زخم سے تا رفو نہ سمجھے
سو حرف ہیں خامشی میں لیکن | اس بات کو ہرزہ گو نہ سمجھے
شایان چمن نہیں وہ بلبل | ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے
سمجھا رہے ہم تو تجھکو قائم | پر کہیئے کیا جو تو نہ سمجھے

قطعات و رباعیات کی اگرچہ شیفتہ نے تعریف کی ہے لیکن وہ ایسے زیادہ تعریف کے قابل نہیں، اُن میں زیادہ تر لفظوں کے ہیر پھیر اور تلازمے سے مضمون پیدا کیے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک قطعہ اور ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

رباعی

قائم جو تو دوست سے دکھ پایا ہے ۔۔۔ کب بھولے ہے کسو جو زباں پر آیا ہے
رہ چپ نہیں کہتا کہ ہوگا ناخوش ۔۔۔ کھایا ہے اگر تو تو نمک کھایا ہے

قطعہ

انداز نگاہ رکھ سخن میں ۔۔۔ یعنی جو کہے ہے نیک کہہ تو
دو گوش ترے ہیں اور زباں ایک ۔۔۔ تا دو سنے نہ ایک کہہ تو

عبدالحق
سکریٹری انجمن ترقی اردو
اورنگ آباد (دکن)

مقدمہ چمنستانِ شعرا

رائے لچھمی نرائن متخلص شفیقؔ (صاحب) کے والد رائے منسا رام نواب نظام الملک آصفجاہ مرحوم کے عہد میں پیشکار صدارت شش صوبہ دکن تھے۔[1] رائے منسا رام اپنی ایک کتاب[2] کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "بندۂ عقیدت شناس منسا رام آصفجاہی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی نبیرۂ بال کشن عابد خانی نے تخمیناً مدت پچاس سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بڑی اچھی طرح بسر کی، صدارت کل کی خدمت انجام دی اور مورد عاطفت و شفقت رہا"

شفیقؔ کھتری قوم سے تھے اور ان کے بزرگ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا بھوانی داس لشکر عالمگیری کے ہمراہ دکن میں آئے اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ رائے منسا رام کو صغر سنی ہی میں یتیمی کا داغ نصیب ہوا۔ سن شعور کو پہنچکر ایسی لیاقت حاصل کی کہ نواب مغفرت مآب آصفجاہ اول کے عہد میں پیشکار صدارت صوبہ جات دکن کی خدمت پر فائز ہو گئے۔ منسا رام چار پشت سے

[1] تمام عریضہ بات آخر سلسلۂ ماثر نظامی

خاندان آصفجاہ کے نمک خوار تھے۔

رائے منسارام محض دفتر کے پیشکار یا سررشتہ دار ہی نہ تھے بلکہ تاریخ و انشا کا بھی ذوق رکھتے تھے اور صاحب تالیف و تصنیف ہوئے ہیں۔ ایک کتاب اُن کی مآثر نظامی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اس زمانے میں لکھی تھی جب ناموافق حالات کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں نواب نظام الملک آصفجاہ اول کے حالات ہیں۔ ابتدا میں ان کے بزرگوں کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔ یہ حالات کچھ تو مصنف کے چشم دید ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو ثقات سے معلوم ہوئے اور بعض حالات خود نواب آصفجاہ مرحوم کی زبان مبارک سے سننے میں آئے۔ یہ کتاب ۱۲۰۰ھ میں مرتب ہوئی اور جب انیس سال کی گمنامی اور گوشہ نشینی کے بعد حضرت مرشد زادۂ آفاق تہنیت پور خلافت و ریاست... نواب عالیجاہ بہادر اسد جنگ نے یاد فرمایا تو یہ رسالہ بطور تحفہ حضور میں پیش کیا۔ انکی دوسری تالیف قانون دربار آصفی ہے یہ کتاب بھی زمانۂ گوشہ نشینی کی لکھی ہوئی ہے سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ ہے۔ اس میں ضوابط دربار کے علاوہ بعض بعض بڑے کام کی باتیں بھی آگئی ہیں مؤلف نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے دو روز میں لکھی۔

اس سے یہ معلوم ہوگا کہ شفیق ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جہاں علمی چرچا تھا اور خود ان کے والد صاحب تالیف و تصنیف تھے۔ شفیق کی ولادت ۱۱۵۸ھ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی

ہندوستان سے لیکر دکن تک ریختہ گوئی کی گرم بازاری ہے اور منجملہ دوسرے
شہروں کے اورنگ آباد بھی مرکز شعروسخن بنا ہوا ہے اگرچہ اس وقت
ذرائع آمدورفت کی یہ آسانیاں نہ تھیں جو اس وقت ہیں لیکن اس پر
بھی شمال کے اساتذہ کا تازہ کلام یہاں پہنچتا رہتا ہے اور بڑے اشتیاق
سے پڑھا جاتا ہے اور مشہور خاص وعام ہوجاتا ہے۔ جس سے صاحب ذوق
لوگوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ان باکمال
اساتذہ کی تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

'شفیق' کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق فارسی، عربی، صرف ونحو
انشا وغیرہ میں ہوئی اور جیسا کہ خود انھوں نے اس تذکرے میں لکھا
ہے، شیخ عبدالقادر صاحب سے کتب متعارفہ کی سند حاصل کی۔ بدو سن
شعور ہی سے ان میں شعروسخن کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اور گیارہ سال
کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ میر غلام علی 'آزاد' بلگرامی جن کا شمار ہندوستان
کے جید علماء میں ہے اور جو فن شعر گوئی اور تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے
تھے، دکن ہی میں تھے۔ 'شفیق' کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔
لکھتے ہیں کہ "میر عبدالقادر مہربان نے جو حضرت آزاد کے تلامذہ میں
سے تھے، مجھے "صاحب" تخلص عنایت فرمایا۔ غزلیات کا دیوان جس میں
تقریباً دو ہزار بیت تھے، مرتب کیا لیکن جب ذرا استعداد بڑھی اور
اصطلاح شعرا اور قواعد شعرا میں مہارت حاصل ہوئی تو اسے تقویم
پارینہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اب کہ میری عمر اٹھارہ سال کی ہے، مجھ

یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب میر محمد مسیح کا تخلص فارسی میں صاحب ہے تو میں نے میر صاحب وقبلہ (آزاد بلگرامی) سے تخلص کی التجا کی۔ آپ نے ازراہ شفقت "شفیق" تخلص عطا فرمایا۔ چونکہ میرے ریختے عوام وخاص میں مشہور ہو چکے تھے۔ اس لئے ریختے میں "صاحب" ہی تخلص رہنے دیا اور جن بحروں میں "شفیق" نہیں کھپ سکتا وہاں ناچار "صاحب" ہی رکھنا پڑا۔ اس نئے تخلص کی خوشی اور شکریے میں وہ ایک قطعہ موزوں کرتے ہیں اور "تخلص نوی" اس کی تاریخ نکالتے ہیں۔ مہربان شفیق کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کے حالات میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔

میر غلام علی آزاد ۱۱۵۲ھ سنہ ۱۷۳۹ء میں اورنگ آباد وارد ہوئے اور بابا شاہ مسافر کے تکیہ میں قیام کیا اور سات سال یہیں بسر کر دیئے "آزاد" کی عمر کے اڑتالیس سال دکن ہی میں گزرے اور یہیں وفات پائی اور خلد آباد میں پیوند زمین ہوئے۔ آپ کی فیض صحبت سے دکن کے اکثر باکمال مستفیض ہوئے۔ انہیں میں "شفیق" تھے۔ شفیق کو آزاد سے بکمال عقیدت مندی تھی اور جہاں کہیں ان کے تالیفات میں آزاد کا نام آیا ہے تو ان کا ذکر بڑے ادب واحترام اور خلوص وارادت سے کرتے ہیں اور ہر جگہ انھیں "میر صاحب قبلہ" "پیر ومرشد" یا "قبلہ وکعبہ برحق" اور اپنے آپ کو "غلام" لکھتے ہیں۔ (غالباً اس میں آزاد کے لفظ کی رعایت بھی ملحوظ ہے) گل رعنا میں آزاد کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے کلام میں جابجا حضرت کے کمال اور اپنے تعلقات وعنایات کا ذکر کیا ہے

ایک پر زور قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے۔

للہ الحمد صبا مژدہ عشرت لائی	کہ بہار اب کے تجمل سے چمن میں آئی
شاہ گل تخت چمن پہ ہے بصد زینت و ناز	سرو و شمشاد ہیں استادہ وہاں مجرائی

بہاریہ تشبیب کے بعد گریز کی ہے:۔

طبع حضرت سے اگر وام کرے رنگینی	اب جو کرتی ہے بہار ایسی چمن آرائی
یعنی وہ حضرت آزاد کہ خورشید و قمر	آستاں اسکی پہ رکھتے ہیں جبیں فرسائی
قبلۂ ہر دو جہاں، مرشد ارباب سلوک	ختم ہے ذات مبارک پہ کرم فرمائی
علم منقول میں اسکو دم عیسےٰ ہے مگا	علم معقول میں اسکو ہے ید بیضائی
قمریان عرب اس کی ہیں ثنا خوانی میں	عندلیبان عجم کی ہے سخن پیرائی
بسکہ رکھتا ہے سخن پیچ و شیریں کاری	ہند کے طوطیوں کو اس سے ہے شکر خائی
نگہ لطف مرے پر ہے ہمیشہ مبذول	مجھ کو زیبا ہے غلامی، اسے ہے آقائی

اس کے بعد دعا ہے اور دعا کے بعد یہ مقطع ہے۔

فارسی شعر کہو مدح میں اسکی صاحب	کہ ملے تجھکو خطاب ملک الشعرائی

اسی طرح ایک پوری غزل آزاد کی شان میں کہی ہے۔ غزل کیا ہے گویا اپنے پیر و مرشد کی شان میں چھوٹا سا قصیدہ ہے:۔

سرور ہر دو جہاں آزاد ہے	والیٔ کون و مکاں آزاد ہے
کنت کنزا کے معانی پر خبیر	واقف سر نہاں آزاد ہے
مرکز ادوار چرخ چنبری	قطب الاقطاب زماں آزاد ہے
اسم اعظم ہے زباں زد اسکے تئیں	جسکے تیئں ورد زباں آزاد ہے

خورد و بزرگ کے تئیں یہاں ہے رسوخ — مرشد پیر و جواں آزاد ہے

ایک دم میں دین و دنیا بخش دے — جس کے اوپر مہرباں آزاد ہے

دل سے اب صاحب ہوا ہے کا غلام — بادشاہ انس و جاں آزاد ہے

کہاں تک لکھوں "شفیق" کی عقیدت کے اظہار کے لئے یہ بہت کافی ہے۔

حضرت آزاد کا ذوقِ سخن محتاجِ بیان نہیں، ایسے صاحب ذوق اور باکمال لوگ کم ہوتے ہیں ان کا کلام اور ان کی تصنیفات اس کی شاہد ہیں اس کے ساتھ تاریخ و سیرت کا ذوق بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ ان کے تذکرے اس فن کے بہترین نمونے ہیں مآثر الامرا جو تاریخی لحاظ سے بے مثل کتاب ہے، انھیں کے فیضِ اثر کا نتیجہ ہے بلکہ بہت کچھ حضرت آزاد، ہی کے قلم کی ممنون ہے۔ ادب میں ان کی نظر بہت وسیع تھی اور تحقیق و تلاش میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں میں ہے شفیق بڑا خوش قسمت تھا کہ اُسے "آزاد" سا استاد ملا۔ اس نے بھی استاد کے قدم بقدم چلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ شاعر تو وہ لڑکپن سے تھا، فارسی اور اردو دونوں میں اس کا کلام موجود ہے اگرچہ کمیاب ہے۔ اسکے علاوہ اس کی تصنیفات و تالیفات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو شعرا کے تذکرے اور دوسری تاریخی کتابیں یہاں اُن تالیفات ✱ کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے۔

✱ اس مقدمہ میں رائے منسا رام اور شفیق کی تالیفات کا ذکر آیا ہے، ان میں سے تحقیق شگرف لائبریری حیدرآباد کی فہرست سے ماخوذ ہے، باقی کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔

تاریخ
حقیقت ہائے ہندوستان

شفیق اس کتاب کی حقیقت دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں کہ راقم کے والد رائے منسارام نے جو چار پشت سے نمک خوار خاندان آصفی ہیں ۱۲۰۴؁ میں اورنگ آباد سے فردوں کے چند طبلق میرے پاس حیدرآباد بھیجے یہ میرے جدّا جد کے لکھے ہوئے تھے، جو سرکار حضرت کلاں علیہ المغفرۃ والرضوان میں خدمت مستوفی گری اور پیشکاری صدارت الملک ہندوستان پر فائز تھے، یہ فردیں نواب مغفرت مآب نظام الملک کے دستخط سے مزین تھیں لیکن ان میں سے بعض بوسیدہ ہو گئی تھیں اور اکثر کرم خوردہ تھیں۔ ان فردوں میں قدیم زمانہ کے مختلف سنین سے سنہ ۱۱۳۹ف تک کے مداخل و مخارج و جمعیت سپاہ وغیرہ کا حساب بطور سیاق و اصطلاح اہل جرائد میں درج تھے ان سب کو سادہ عبارت میں تحریر کیا اور رقمی اعداد کو الفاظ میں لکھا اور اسکے علاوہ دوسری معلومات بھی فراہم کر کے مناسب مقامات پر اضافہ کیں۔

یہ کتاب شفیق نے اس وقت کے رزیڈنٹ اور اپنے سرپرست کپتان ولیم کرک پیٹرک کے لئے تالیف کی۔ کتاب کے نام سے اس کا سنہ تالیف (سنہ ۱۲۱۴ھ) نکلتا ہے، اس میں چار مقالے ہیں۔

مقالہ اوّل میں دفتر قدیمہ کی فردوں کی کیفیت ہے۔

مقالۂ دوم میں صوبہ ہائے ہندوستان کا حال ہے۔

مقالہ سوم میں صوبجات دکن کا ذکر ہے۔

مقالہ چہارم میں مسلمان سلاطین ہند کا مختصر حال سلطان معز الدین سام سے لیکر شاہ عالم بادشاہ تک ہے۔

یہ کتاب اچھی ضخیم ہے اور اس میں ہر سرکار پرگنہ اور حویلی کے مدخل اہمیت اور فاصلہ درج ہے ضمنی طور پر مختصر تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں۔

غرض یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔

تتمۂ شگرف

یہ بھی دکن کی تاریخ کے متعلق ہے۔ مختلف صوبوں کے جغرافی اور تاریخی حال اور اعداد و شمار ہیں۔ اس کے بعد سلاطین بہمنیہ کا ذکر ہے جو تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہے سلطنت بہمنیہ کے زوال پر جو حکومتیں قائم ہوئیں (یعنی عادل شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی، برید شاہی، اور خاندیس کے فاروقی سلاطین) ان کا مختصر حال ہے۔ آخر میں سلاطین تیموریہ کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ تک ہے۔ یہ نام بھی تاریخی ہے جس سے سنہ تالیف ۱۲۰۰ ہجری نکلتا ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد کے رزیڈنٹ مسٹر رچرڈ جانسن کے نام معنون ہے۔

مآثر آصفی

یہ خاندان آصفجاہ کی تاریخ ہے یعنے خواجہ عابد (نظام الملک آصفجاہ اول کے دادا) سے لیکر آصفجاہ ثانی تک کے حالات ہیں، مرہٹوں نے جو ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس کا بھی ذکر ہے نیز اس زمانہ کے امرا و اہل

راجاؤں کے حالات بھی لکھے ہیں۔ کتاب ۱۲۰۱ھ میں تالیف ہوئی۔

بساط الغنائم

یہ مرہٹوں کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب اس نے سر جان ملکم کی فرمائش سے لکھی جو اس وقت حیدرآباد میں تھے، اس میں مرہٹوں کی تاریخ ابتداء سے مؤلف کے وقت تک کی ہے اس کا ایک حصہ شفیق نے کسی مرہٹی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۱۴ھ نکلتا ہے۔

حالات حیدرآباد

اس میں بلدہ حیدرآباد کی مساجد، محلات و باغات اور شہر کی مختصر تاریخ ہے اور بیدر اور ورنگل کے حالات بھی درج ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۲۱۴ھ کی تالیف ہے۔

تذکرے

شام غریباں

یہ تذکرہ ان ایرانی شعرا کا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ نام بھی مضمون کی مناسبت سے رکھا ہے۔ اگرچہ حالات بہت مختصر ہیں مگر کتاب دلچسپ ہے اور اشعار کا انتخاب خوب ہے۔ لطائف وظرائف سے خالی نہیں۔ بعض بعض جگہ اشعار کے متعلق خاص نکات بھی بیان کر دئیے ہیں۔

گل رعنا

یہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے اس میں وہ ایرانی نژاد بھی ہیں جن کے باپ دادا ہندوستان میں آئے اور یہیں رہ گئے اور ہندی نژاد بھی اس میں دو فصلیں ہیں ایک میں شعرائے اسلامیان کا اور دوسری میں ہندو سخن پردازان اصنامیان کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ "شام غریباں" سے بہت بڑا ہے اور اکثر حالات بھی مفصل بیان کئے ہیں۔ اپنے استاد آزاد بلگرامی کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اکبر کا حال کوئی ۴۰ صفحوں میں ہے مگر سب کا سب ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ افسوس کہ شفیق نے اس میں تحقیق سے مطلق کام نہیں لیا۔ وہ اس مورخ کے ادعائے راست گوئی کو اس کے جذبات تعصب، حسد و رشک سے جدا نہ کرسکے۔ علامہ فیضی کے حالات بھی بلا کم و کاست بدایونی سے نقل کر دئے ہیں۔ شفیق بدایونی کو بالکل نہیں سمجھے۔

"شام غریباں" کے مقابلہ میں اس تذکرے میں تاریخی واقعات اور لطائف و ظرائف بھی زیادہ ہیں بعض بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی کردی ہے اور ان کے نکات بھی بتا دئے ہیں۔ مثلاً میر محمد افضل الہ آبادی "ثابت" کے ایک قصیدے میں کثرت سے طبی تلمیحات و اصطلاحات ہیں۔ اسکے اشعار نقل کر کے ان تمام تلمیحات و اصطلاحات کی شرح لکھی ہے۔ اسی شاعر کا ایک دو مصرعے کا قصیدہ ہے، اس کا انتخاب درج کیا ہے اور اس کے مشکل مقامات کا حل بھی لکھ دیا ہے۔ یہ تذکرہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

چمنستانِ شعرا

یہ ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ شفیق، لکھتے ہیں کہ "جب ہندوستان سے تازہ تازہ میر محمد تقی میرؔ" اور فتح علی خاں کے تذکرے پہنچے تو سارے عالم میں غلغلہ پڑ گیا اور اشعار ریختہ کے اشتیاق میں ایک دنیا تہ و بالا ہو گئی، کیونکہ اہل دکن کو ان اشعار کا بہم پہنچنا دشوار رہے۔ اس لئے میری فکر ناقص میں یہ بات آئی کہ ان دونوں تذکروں کے اشعار کو اور دوسرے جواہر پاروں کو ان کے ساتھ ملا کر ایک سفینہ تیار کروں۔ اس تقریب سے بعض احباب سخن داں کے حالات و کلام کے جمع کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ دوست احباب نے بھی اسکی تائید کی بلکہ اصرار کیا اور میں اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ ہو گیا"۔

و شفیق، نے اس تذکرے کی ترتیب میں عجیب جدت دکھائی ہے اب تک جتنے فارسی اردو کے تذکرے لکھے گئے ہیں (سوائے میر صاحب کے تذکرے کے، جس میں کوئی ترتیب نہیں) ان میں ناموں کی (یعنے تخلصوں کی) ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے لیکن شفیق، نے اس تذکرے کی ترتیب حروف ابجد یعنے حساب جمل کے لحاظ سے رکھی ہے اس میں کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ہوتی، نہ خود مؤلف نے اس کی کوئی وجہ بتائی ہے۔ سوائے اسکے کہ جوانی کی ترنگ کہا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جوانی کا زمانہ ہے، عبارت میں رنگینی پائی جاتی ہے، بعض اوقات

تشبیہات و استعارات میں باتیں کرتے ہیں۔ جہاں کہیں موقع ملتا ہے شاعر کے تخلص یا اس کے پیشے وغیرہ کی مناسبت سے اسی قسم کے الفاظ اور تشبیہات میں اس کا حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں (مثلاً ملاحظہ ہوں۔ آشنا، آوارہ، بہار، داود، خاکسار، ذکی، محمد علی حشمت، مخلص، ناطق وغیرہ کے حالات) لیکن عبارت گنجلک نہیں، بیان صاف اور شستہ ہے اور زبان پر قدرت ہے۔ کہیں کہیں میر صاحب (میر تقی) کی طرح اصلاح بھی دے دیتے ہیں۔ یا شعر میں کوئی کنایہ یا خاص نکتہ ہوتا ہے تو اسکی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں، جس سے شفیق کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگرچہ شفیق نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں پر رکھی ہے لیکن انکے علاوہ جہاں جہاں سے جو جو حالات مل گئے ہیں حوالے کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب کے مطالعہ میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم حاکم کے تذکرہ مردم دیدہ، اور تذکرہ مجمع النفائس تالیف سراج الدین خاں آرزو، سرو آزاد، اور حاجی علی اکبر رمال اور رضا خاں انوار کی بیاضوں کا حوالہ ملے گا۔

بعض اوقات اشعار کے متعلق مغالطہ ہو جاتا ہے اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اشعار خصوصاً مشہور اشعار مختلف شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں، شفیق نے اس باب میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ہے جن اشعار کا پتا نہیں چلا وہ تذکرے کے آخر میں جمع کر دئے ہیں کہ ان کا پتا چلانا دشوار ہے، خصوصاً ان اشعار کے لئے کہ ایک ہی تخلص کے کئی شاعر

ہیں۔ ہندوستان سے اشعار اکثر صرف تخلص کے ساتھ آتے ہیں اور نادان
پڑھنے والے سب کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ
شعر حقیقت میں اس کا ہے۔

شفیق، ہر شاعر کے تذکرے میں انصاف کو ملحوظ رکھتا ہے اور کبھی کسی
پر ناگوار نکتہ چینی نہیں کرتا چنانچہ یقین، کے بیان میں خود لکھتا ہے کہ "جب
کسی شاعر کے کلام میں کوئی ثقیل مصرع نظر پڑا تو خود ایک دوسرا مصرع لکھ دیا
ہے اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ یہ مصرع بھی خوب معلوم ہوتا ہے۔" اپنے مصرع
کو ترجیح نہیں دی، بلکہ پڑھنے والے کی پسند پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن یقین کا تذکرہ مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے۔ اس میں اس نے اس قدر مبالغے بلکہ
غلو سے کام لیا ہے کہ خلاف عادت شفیق، کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا، وہ
اسے اردو کا سب سے بہتر شاعر خیال کرتا ہے اور ہندوستان میں کسی کو
اس کی ٹکر کا نہیں سمجھتا۔ کہتا ہے کہ "اگرچہ مرزا سودا کا غزل، رباعی، مخمس،
مثنوی، قصیدے، قطعہ بند وغیرہ میں بڑا رتبہ ہے اور وہ بہت عالی تلاشی
کرتے ہیں۔ لیکن یقین کے ریختہ میں کچھ اور ہی فصاحت و ملاحت ہے۔

اگر ہزار برس تک پئے یہ سودا ‌ ‌ ‌ ‌ کرے جو فکر تتبع یقین کا از دل و جاں
کہے گا معنی باریک و خوب و شیریں پر ‌ ‌ ‌ ‌ ولے نزاکت و یہ لطف و قیل کہاں

وہ یکتائے عصر اور یگانۂ زمانہ ہے اور ایسا معنی آفرین اور ریختہ رس
دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔" میر صاحب نے اپنے تذکرے میں جو یقین کی بہ
طعن و تعریض کی ہے اور اسے متبدل بند کہا ہے اور سرقہ کا الزام لگایا ہے تو

اس "شفیق" آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور میر صاحب کو خوب سخت سست کہتا ہے، "سودا" نے جو میر صاحب کی ہجو کہی تھی اسے نقل کرکے اس کی داد دیتا ہے۔ اسکے بعد "توارد" و "سرقہ" پر بحث کی ہے، دوسرے علما کے اقوال نقل کئے ہیں اور خود اپنا قطعہ بھی جو اس مضمون پر لکھا ہے نقل کیا ہے غرض میر صاحب کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور خود میر صاحب کے ذکر میں بھی ان کی حرف گیری پر چوٹ کی ہے۔

غرض "یقین" کی شاعری کا بہت بڑا مداح اور معتقد ہے اور اُسکی تقلید کو فخر سمجھتا ہے۔ اپنے کلام میں کہیں کہیں اس کا اشارہ کیا ہے مثلاً ایک غزل کا مقطع ہے:-

دیوان "یقین" خوش خط صاحب نے لکھایا ہے — اوراق طلائی پہ کھینچی ہیں گی تحریریں

"یقین" کا تذکرہ اور کلام تقریباً ۴۶ صفحوں میں درج ہے۔ اسی سے قیاس ہوسکتا ہے کہ وہ اس شاعر کو کیا سمجھتا تھا۔

حاجی میر علی اکبر رمال "حاجی" سے "شفیق" نے رمل وغیرہ کی تحصیل کی تھی۔ حاجی کے تذکرے میں خود بھی اپنے اظہار کمال کے لئے ایک زائچہ دیا ہے جس سے عام ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی ہے ایک نوجوان طالب علم کا شوق نمود و نمائش سمجھنا چاہیئے۔

"شفیق" کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑا ہے اور بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ درج ہے جو ان دونوں میں نہیں پایا جاتا بہت سے ایسے ہیں جو "شفیق" کے ہم عصر ہیں اور جن سے اُسکی ذاتی ملاقات

ہے اور خود ان شاعروں سے ان کا منتخب کلام لیکر درج تذکرہ کیا ہے۔ ایسے حالات خاص طور پر قابل اعتبار ہیں۔

سب سے قابل تعریف بات یہ ہے کہ شفیق نے یہ تذکرہ (۱۸) برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور بغیر کسی کی مدد کے بہت تھوڑے عرصہ میں ختم کر دیا۔ اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کا تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں۔ اس سے شفیق کی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کا نام "چمنستان شعرا" تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف نکلتا ہے جہاں تک تحقیق کیا گیا، اس تذکرے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے، جو کتب خانۂ آصفیہ سرکار عالی حیدر آباد میں ہے اور یہ بھی کرم خوردہ، فرسودہ اور مشکوک ہے۔ یہ اسی نسخہ کی نقل ہے۔ اس کی تصحیح میں بیحد دقت اٹھانی پڑی، بعض عبارتیں اصل کتب سے جو اس کا ماخذ ہیں، صحیح کرنی پڑیں، کہیں قیاس سے کام لینا پڑا اور بعض بعض مقام پر کچھ الفاظ جو کتاب کے ازلی دشمن کیڑے چٹ کر گئے ہیں، ویسے ہی چھوڑ نے پڑے اور ان کی جگہ نقطے دے دیئے ہیں، بہت سے اشعار جو تذکرے میں مشکوک یا کرم خوردہ تھے، شعرا کے اصل دیوانوں سے تلاش کر کے لکھے گئے بعض الفاظ جو مشتبہ تھے اور ان کی صحت نہ ہو سکی، ان کے سامنے استفہام کی علامت لکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں گی اگر دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تو جہاں تک ممکن ہوگا اصلاح کی کوشش کیجائیگی۔

ایک کام اسکی ترتیب میں اور کیا گیا ہے جسے غالباً ناظرین

پسند فرمائیں گے، یعنے "تحفۃ الشعرا" تالیف افضل بیگ خاں قاقشال اورنگ آبادی (سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ) سے ان ریختہ گو شعرا کا حال اور کلام جو شفیق کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں حاشئے میں درج کردیا ہے۔ جن جن شاعروں کا اس میں اردو کلام نہیں وہاں صرف حالات ہی لکھ دیئے گئے ہیں اور جہاں حالات میں کوئی نئی بات نہیں ہے وہاں صرف کلام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مشترک کلام ہر جگہ خارج کردیا گیا ہے۔ بعض شاعر ایسے بھی ہیں، جن کا ذکر "چمنستان" میں نہیں ہے، ان کا حال اور کلام ہر حرف کے آخر میں درج کردیا گیا ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو ضرور بصیرت ہوگی اور وہ "تحفۃ الشعرا" کے مطالعہ سے مستغنی ہوجائیں گے۔ یہ تذکرہ "چمنستان" سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اصل میں یہ فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، اس میں ضمناً ایسے شعرا بھی آگئے ہیں جو اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ بعض شعرا کے حالات اس میں کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔

شفیق کا کلام

شفیق کے اردو کلیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرگو شاعر تھا۔ زبان پر قدرت تھی اور شاعری کے نکات سے خوب واقف تھا۔ اور اس کا کلام شعر کی تقریباً ہر صنف میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ اردو کا اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں ہے مگر اوسط درجہ کے شعرا میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ غزلوں کے علاوہ قصیدوں اور مثنویوں میں خوب زور دکھایا ہے۔ شہر آشوب و اسوخت، مخمس، مثلث، رباعیاں اور تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں

سے کہیں کہیں شفیقؔ کے ذاتی حالات کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً شفیقؔ نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کے فرزند میر احمد علیخاں عالیجاہ کے متوسلین میں تھے یہ بڑے قدرداں اور مہزور رئیس تھے اور شفیقؔ کو انھیں کی سرکار سے تعلق تھا۔ ان کی مدح میں اس نے کئی قصیدے لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک قصیدے میں صاف صاف نام اور پتا بتا دیا ہے:۔

یک زبردست ہے مرا والی
یک قوی دل مرا ہے پشت و پناہ
حق و باطل ہے سامنے جس کے
یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ
یعنے نواب میر احمد خاں
اسدالملک حضرت عالیجاہ
باپ جس کا نظام دولت و دیں
جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

ایک دوسرے قصیدے میں لکھتے ہیں:۔

جناب پاک یعنے میر احمد خان عالیجاہ
کہ جس کی عمر و دولت کا نگہبان ایزد سبحان

آگے چلکر سفر میں رہنے کی صعوبت اور اپنے ضعف کی شکایت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی ملازمت ایسی تھی جس میں دورہ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

مگر فضل خداوندی مری اب دستگیری کر
نشست شہر فرما دے عنایت کر کے نیم ناں

آخر میں اپنے لڑکے کی لئے درخواست کی ہے:۔

مدد خرچ اب مرا دستخط ہوئے اس بندہ زادکو
تعین ہو ڈیوڑھی کا بلدہ کی جتبک کہ ہی ناداں

ایک اور قصیدے میں بھی اپنے آقا کا نام اور خطاب کا ذکر کیا ہے

چراغ دودہ حیدر جناب میر احمد خاں
کہ جس کے جد کے تیغ چرخ بریں سے ذوالفقار آئے
وہ اسد الملک اسد اللہ اس کا باہہ بل ہے
کہ جسکی دھاک سے شیروں کو تب بی اختیار آئے
نظام الدولہ آصف جاہ کا فرزند ارشد ہے
کہ دولت جسکے در پہ جبہہ سا امیدوار آئے

ایک صاحب سُنی شفیق کو بے حد الفت ہے اور اکثر غزلوں میں انتہائے محبت سے "میرا میاں میرا میاں" کر کے اسے یاد کیا ہے بعض غزلیں کی غزلیں اسکی یاد میں ("میرا میاں" کی ردیف میں) لکھ ڈالی ہیں ایک قصیدہ بھی اسی ردیف میں لکھا ہے اور بڑے شوق اور محبت سے اس کا ذکر کیا ہے جسکے دو چار شعر یہ ہیں:۔

ہے مرا ایمان وجاں میرا میاں
مجھ کو ہے ورد زباں میرا میاں

انتظاری کی نہیں طاقت مجھے
جلد آ میرے سیاں میرا سیاں
گل ملے بلبل کو اور قمری کو سرو
میرے تئیں میرا سیاں میرا سیاں

ایک غزل میں معمے کی طرز میں نام بھی بتا گئے ہیں اور وہ نام "شکر و سیاں" ہے۔

"ذکا" (سید امتیاز خاں) سے بھی اپنی عقیدت کا بار بار اظہار کیا ہے۔

عقیدت ہے ذکا سے میرے تئیں از بسکہ اے صاحب
مجھے ورد زباں ہر رات دن یا پیر یا ہادی

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:-

یک آن جدائی نہ ہو صاحب سے "ذکا" کو
اللہ کرے میری جو نیت ہے بر آوے

"شفیق" کو ادبی تحقیق و نکات سے خاص ذوق تھا - توارد پر جو بحث اس نے کی ہے اور ایک غزل کے ضمن میں جو قطعہ توارد دیکھا ہے وہ سب اس تذکرے میں موجود ہے۔ اردو کلیات میں ایک قصیدہ نظر پڑا جس کا مطلع یہ ہے:-

ساقی اس ابر رشک فام کو دیکھ
اس طرف دیکھ مے کے جام کو دیکھ

کچھ شعر لکھنے کے بعد گریز کی ہے اور الفاظ کے متحرک و ساکن

ہونے کی بحث کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک ہمعصر مقتول نے ان کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب دیا ہے۔

"شفیق" نے ختم (بسکون تا) کو ختَم (بہ فتح تا) لکھ دیا تھا معترض کی تردید اور اپنی تائید میں یہ اشعار لکھے ہیں:

گر ختم کہوے ختم کو "صاحب"
ہے روا حرکت مقام کو دیکھ
ریختے کی زباں میں یہہ غلطی
ابتدا سے ہے انتظام کو دیکھ
آبرو زلف کو زلَف بولا
اور الفاظ ناتمام کو دیکھ
نقل ہے وقت مغرب اعظم شاہ
یوں کہا اپنے ایک غلام کو دیکھ
ہووے "اسواری" اس گھڑی تیار
سیر چاہے ہے جی یہ شام کو دیکھ
مولوی جیون استاد شاہ
تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھ
لفظ اسواری نہیں سواری ہے
کچھ تو اس صحت کلام کو دیکھ
شاہ نے تب تو یہ جواب دیا

میری طرز سخن تمام کو دیکھ
یہ عبارت کہاں ہیں ہندی میں
اس میں جائز ہے تو نظام کو دیکھ

شفیق کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ عربی کے جو لفظ عام طور پر اردو میں بہ تبدیل حرکت وغیرہ بولے جاتے ہیں اور جو زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں وہ اسی طرح فصیح ہیں خواہ وہ اصل لغت کے اعتبار سے غیر صحیح کیوں نہ ہوں ہر زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے ہیں تو لہجے کے تغیر سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو جاتی ہے،

علاوہ غزلوں اور قصیدوں کے شفیق کا زور کلام دیکھنا ہو تو ان کی مثنوی "تصویر جاناں" دیکھنی چاہیئے جو رسالہ "تجلی" حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں بڑا زور سراپا کے بیان میں دکھایا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بہت پامال ہے اور ہمیشہ بھونڈا اور بے مزہ ہو کر رہ جاتا ہے اور یہی حال اس مثنوی کے سراپا کا بھی ہے تاہم اس سے شفیق کی قادر کلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر کوئی شفیق کے نام اور حال سے واقف نہ ہو اور اس کا کلام پڑھے تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لکھنے والا ہندو ہے وہ تمام بزرگان دین اسلام کا ذکر اسی ادب، احترام اور عقیدت سے کرتا ہے جیسے کوئی سچا اور پکا مسلمان۔ اور یہ کوئی تصنع سے نہیں بلکہ درحقیقت دل سے اور عقیدت سے ہے۔ معراج کے بیان میں جو مثنوی لکھی ہے اور جو "اردو"

میں شائع ہو چکی ہے اسے دیکھئے، کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر کیا لکھے گا
اردو کلیات میں ان کے متعدد قصیدے حضرت علی کی شان میں ہیں۔
امام آخرالزماں کی منقبت میں کئی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت
غوث الاعظم جیلانی کی مدح میں ہے۔ ایک حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی
تعریف میں۔ علاوہ ان قصائد کے ان کے تمام کلام میں جہاں کہیں مسلمانوں
کے بزرگوں اور اولیا کا ذکر آتا ہے تو وہ ان کا نام اور ذکر اس
عقیدت اور ارادت سے کرتا ہے جیسے مسلمان۔ اس کے کلام میں اسلامی
تلمیحات کثرت سے آتی ہیں، برخلاف اس کے ہندو دیوتاؤں وغیرہ کا
ذکر شاذ ہی کہیں آیا ہو تو آیا ہو۔ یہ تعلیم، صحبت، ماحول اور اس زمانہ کے
اقتضاء کا اثر تھا۔ آج کل کے لوگوں کو شاید یہ چیزیں پڑھ کر حیرت ہو،
لیکن یہ اس زمانہ کی یادگاریں ہیں، جب ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح
رہتے سہتے تھے اور کسی کو کسی سے پرخاش نہ تھی۔ یہ خوشحالی امن و آزادی
اور ترقی کی شان تھی۔ جب افلاس کا منحوس قدم آیا تو جہالت، تنگ دلی
تعصب اور ناعاقبت اندیشی نے ایسا اندھا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود
کلہاڑی مارنے لگے ایک دن آئیگا کہ وہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور
گلے مل مل کر اپنے آنسوؤں سے اس داغ کو دھوئیں گے۔

"شفیق" نے "حسب حال زمانہ" کے عنوان سے ایک شہر آشوب
بھی لکھا ہے، جس کے ابتدائی چند شعر یہ ہیں :-

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب ادھر

کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ہے بتر
اس دکن کے بیچ چھ صوبوں کے چھ تھے بادشاہ
عادل اور فیاض، صاحب عزم اور صاحب ہنر
ان کی دولت میں مرفہ اور سبھی خوش حال تھے
کیا رعیت، کیا سپاہی، کیا امیر نامور
آسماں وہی ہے اور وہی زمیں خلقت ہو وہ
پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر
شامت نیت ہے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور
تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

زمانہ کی یہ شکایت ہر عہد میں رہی ہے اور رہیگی آسمان نے ہزاروں رنگ بدلے، دنیا نے سینکڑوں پلٹے کھائے۔ مگر انسان کی شکایت کم نہ ہوئی۔ بے عیب نہ کوئی کتاب ہے نہ کوئی آدمی، نہ کوئی نظام ہے اور نہ کوئی زمانہ۔ یہ نقص کسی نہ کسی صورت میں رہتی دنیا تک رہیگا۔ بلاشبہ انسان کے کمال کی آزمائش اسی میں ہے۔

مقدمہ ذکرِ میر

میر تقی میر اردو کے ان چند مسلم اساتذہ میں سے ہیں جن پر اردو
ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ اہلِ ذوق میر صاحب کے کلام کو سر اور آنکھوں
سے لگاتے ہیں اور پڑھ پڑھ کے سر دھنتے ہیں۔ جب تک یہ زبان دنیا
میں قائم ہے یہ ذوق کبھی کم نہ ہوگا۔ میر صاحب خود بھی اسے سمجھتے تھے،
کیا کہہ گئے ہیں —

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

یہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں، حقیقت حال ہے جس سے کسی کو انکار نہیں
ہو سکتا —

اردو ادب کے شائقین میں کون ایسا ہوگا جو اس با کمال شاعر کے حالات سننے کا مشتاق نہ ہوگا، جس نے اردو شاعری کو (غزل کی حیثیت سے) انتہائے کمال تک پہنچا دیا تھا اور جس کے بعد آج سے پھر یہ رتبہ کبھی نصیب نہ ہوا۔ پر حالات خود اس کے اپنے لکھے ہوئے آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی (تاریخ) میں کہاں۔ مورخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے، آپ بیتی کے لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے ایک لفظ ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدتوں تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے اور کچھ کیا بھی ہے اپنی بیتی آپ لکھ جایا کرے تو ادب کے خزانہ میں بے بہا جواہرات انمول ہوں۔ ذکر میر ایسا ہی انمول موتی ہے۔

اردو میں شعراء کے تذکروں کی کچھ کمی نہیں، اور کونسا تذکرہ ہے جس نے میر صاحب کا ذکر نہ کیا ہو اور اُن کی تعریف کے پل نہ باندھے ہوں مگر حالات کے نام سے وہی چند باتیں ہیں جن سے نہ دل سیر ہوتا ہے اور نہ تحقیق کی پیاس بجھتی ہے۔ بعض ان میں سے میر صاحب کے ہم عصر اور جان پہچان والے بھی ہیں اور بعض اُن کے معتقد بھی، لیکن وہ کلام کی تعریف کو حالات کی تحقیق پر زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کے خیال سے یہ ہے بھی صحیح! آدمی فانی ہے کلام باقی ہے۔ مگر کلام کو آدمی سے جو تعلق ہے وہ کیونکر جدا

ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ میر صاحب کے متعلق بہت سی سُنی سُنائی غلط سلط روایتیں چلی آتی ہیں جن کے پرکھنے کی کوئی کسوٹی نہ تھی اب ذکرِ میر کی بدولت بہت سی باتیں جو اندھیرے میں تھیں اُجالے میں آ گئیں۔

جیسا کہ اُس زمانے میں رواج تھا، میر صاحب نے یہ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ ان کا تذکرہ نکات الشعرا فارسی ہی میں ہے، لیکن ذکرِ میر کی زبان زیادہ رنگین، شیریں اور فصیح ہے، کہیں کہیں مسجّع اور مقفّی ہو گئی ہے مگر سادگی اور بے ساختہ پن اس کا اصلی حسن ہے جو شروع سے آخر تک جلوہ نما ہے۔ جگہ جگہ اپنے والد اور دوسرے بزرگوں کے قول یا ان کی پند و موعظت یا گفتگو جو سراسر حقانیت اور اخلاق سے مملو ہے ایسی پاکیزہ زبان میں اور ایسے موثر طریقے سے بیان کی ہے کہ کتاب میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔

میر صاحب کو (جیسا کہ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو گا) لڑکپن ہی میں یتیمی کا داغ سہنا پڑا اور ظالم پیٹ انھیں وطن سے دلّی کھینچ لایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنت مغلیہ کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا۔ اور عقل و ہمت اور اخلاق و استقلال اہلِ ملک سے رخصت ہو چکے تھے۔

دہلی اگرچہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی

تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیواؤں سے کہیں دکھیاری ہے، اولوالعزم تیمور اور بابر کی اولاد اُن کے شہرۂ آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی، اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار و انحطاط کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ ترو زوال گردو پیش منڈلا رہا تھا، بادشاہ سلامت دست نگر اور امیر اُمرا مضمحل اور پریشان تھے۔ سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا۔ نادر کی بے پناہ تلوار اور اس کے سپاہیوں کی ہوس ناک غارت گری نے دلی کو نوچ کھسوٹ کے ویران و برباد کر دیا تھا۔ ابھی یہ کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ حالات میر صاحب نے اپنی آنکھوں دیکھے اور دیکھے ہی نہیں، اُن کے چرکے سہے اور اُن انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ یہ دلی کے اقبال کی شامِ تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی ہے*۔

میر صاحب نے ان تباہیوں اور بربادیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں اور خود غرضیوں کے منظر اپنی آنکھوں دیکھے، ان میں شریک رہے، ان کے زخم کھائے اور پھر انھیں اپنی آپ بیتی میں ایسے پردرد الفاظ میں

---

* مقدمہ انتخاب کلام میر از عبدالحق

بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے اپنے اعمال کا نقشہ پھر جاتا ہے میر صاحب
نے ان تمام واقعات اور حالات کو بڑی صحت اور خوبی سے لکھا ہے
ور اس زمانے کی تاریخ کے لئے یہ کتاب بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔ بعض
مقامات پر وہ مورخ کی حیثیت سے رائے بھی دیتے ہیں۔ مثلاً پانی پت
کی آخری جنگ میں مرہٹوں کے طریقۂ جنگ کے متعلق فرماتے ہیں "حقیقت
ہر دو لشکر آنکہ اگرد کھنیاں بجنگ گریز کہ طور قدیم آنہا بود می جنگیدند،
غلب کہ غالب می گردیدند"۔ ہم اس جگہ تاریخی حالات و واقعات پر کچھ
لکھنا نہیں چاہتے، جن لوگوں کو مغلیہ سلطنت کے آخری ایام کی تاریخ کا
شوق ہے ان کے لئے یہ حصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں ہم صرف یہ دیکھنا
چاہتے ہیں کہ اس کتاب سے ہمیں میر صاحب کی زندگی کے متعلق کیا کیا
نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور کون کون سی غلط فہمیاں رفع ہوتی ہیں۔

۱۔ آب حیات میں نیز گلزار ابراہیمی میں میر صاحب کے والد کا
نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ میر صاحب اس کتاب میں ہر جگہ میر علی متقی
لکھتے ہیں اور کہیں ایک مقام پر بھی میر عبداللہ نہیں آیا۔ والد کی عادات
خصائل، اشغال و افکار، اخلاق و اطوار کو بڑی خوبی سے لکھا ہے اور
سب کچھ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرتے کرتے
لکھتے ہیں "جوان صالحے عاشق پیشہ بود، دل گرمی داشت، بخطاب
علی متقی امتیاز یافت"۔ اس جملے میں خطاب کے لفظ سے کچھ شبہ پیدا ہوتا
ہے کہ شاید اصلی نام کچھ اور ہو۔ ساری کتاب میں کہیں اس کا اشارہ تک

نہیں کہ سوائے اس کے اُن کا کوئی اور نام بھی تھا، جہاں کہیں انھوں نے والد کا ذکر کیا ہے تو علی متقی یا درویش کے نام سے کیا ہے۔ سید امان اللہ میر صاحب کے والد کے مرید خاص تھے اور گھر بار چھوڑ کر مرشد ہی کے قدموں میں آپڑے تھے۔ میر صاحب کے بچپن کا زمانہ انھیں کے پاس گزرا وہ انھیں ہر جگہ عم بزرگوار لکھتے ہیں، وہ ایک درویش سے ملنے جاتے ہیں، میر صاحب بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ درویش پوچھتا ہے کہ یہ کس کا لڑکا؟ سید امان اللہ جواب دیتے ہیں" فرزند علی متقی" اس طرح باپ کے مرنے کے بعد جب پہلی بار دلی گئے اور خواجہ محمد باسط نے انھیں نواب صمصام الدولہ امیر الامرا کے ہاں پیش کیا اور امیر الامرا نے دریافت کیا کہ یہ کس کا لڑکا ہے تو وہاں بھی یہی نام بتایا اور وہ فوراً پہچان گئے۔ اُن کے والد کا ایک پیر بھائی ایک مدت کے بعد اُن سے ملنے آتا ہے، وہ پوچھتے ہیں کہ کیسا آنا ہوا تو وہ کہتا ہے کہ پیر میرے خواب میں آئے اور فرمانے لگے"...... اما بجبار برخوردن تو با علی متقی ضرور" غرض ان کے والد کا نام کتاب میں بار ہا آیا ہے میر صاحب کی زبان سے ہو یا کسی دوسرے کی زبان سے، لیکن ہر جگہ علی متقی ہی لکھا ہے۔ اس سے وثوق ہوتا ہے کہ اصلی نام یہی تھا۔

۲۔ بعض لوگوں نے اُن کی سیادت میں بھی شبہ کیا ہے جس کا ذکر آبِ حیات میں مذکور ہے۔ آزاد نے یہ قصہ تذکرہ شورش (غلام حسین) سے نقل کیا ہے جس نے سب سے پہلے یہ افترا باندھا ہے۔ لیکن میر صاحب نے

اس کتاب میں ہر مقام پر اپنے والد کے نام کے ساتھ "میر" کا لفظ لکھا ہے اور اپنے والد اور دوسروں کی زبانی اپنا نام بھی میر محمد تقی لکھتے ہیں۔ یہ محض غلط ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو، ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ والد کی وفات کے وقت اُن کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی، اس وقت نہ شعر کہتے تھے اور نہ شعر گوئی کا خیال تھا۔ شعر کا ذوق دلی میں آ کر پیدا ہوا۔ یہیں انھوں نے تحصیل علم کی، یہیں شعر کہنا سیکھا اور یہیں اُن کے کلام کو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی اور آخر دم تک دلی ہی کو یاد کرتے رہے۔

۳۔ یہ ممکن نہیں کہ میر صاحب کا ذکر ہو اور خان آرزو (سراج الدین علی خان) کا نام نہ آئے۔ خان آرزو فارسی کے بڑے اُستاد اور محقق اور شاعر تھے، کبھی کبھی ریختے میں بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ میر صاحب پہلی بیوی سے تھے اور جب وہ مر گئیں تو اُن کے والد نے خان آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی۔ لیکن میر صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بڑے بھائی خان آرزو کے حقیقی بھانجے تھے اور میر صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی دوسری بیوی سے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ میر علی متقی کی پہلی بیوی خان آرزو کی بہن تھیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ خان آرزو میر صاحب کے سوتیلے ماموں ہوتے ہیں۔ تمام تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے باپ کے مرنے کے بعد خان آرزو ہی کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی اور انہیں کے فیضِ تربیت سے علمی استعداد اور

شاعر کا ذوق حاصل کیا۔ جب میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا چھپ کر شائع ہوا تو اس بیان پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ اس کتاب میں میر صاحب نے خان آرزو کا بڑے ادب سے ذکر کیا ہے اور اُن کے کمال اور سخن فہمی کی بیحد تعریف کی ہے اور مرزا مظہر (فطرت، موسوی خاں) کے حال میں انھیں "استاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا ہے۔ ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آزاد کا یہ قول نہایت ناگوار گزرتا ہے کہ "خانصاحب حنفی مذہب تھے میر صاحب شیعہ، اس پر نازک مزاجی غضب، اعراض کسی مسئلے پر بگڑ کر الگ ہو گئے +" قیاس یہی ہوا کہ یہ بھی آزاد کا ایک چٹکلا ہے جو حسبِ عادت لطف داستان اور رنگینیٔ بیان کی خاطر لکھ گئے ہیں۔ لیکن جب یہ کتاب (ذکر میر) ہماری نظر سے گزری تو معلوم ہوا کہ آزاد بڑی پتے کی بات لکھ گئے ہیں۔ میر صاحب خان آرزو کے دل آزار برتاؤ اور بے مروتی کے نہایت شاکی ہیں۔ ایک تو لڑکپن اور ناتجربہ کاری، دوسرے یتیمی کا تازہ تازہ داغ، پھر غریب الوطنی اور بے روزگاری، اس پر بے مروت بھائی اور سنگ دل ماموں کا یہ سلوک، میر صاحب کی زندگی تلخ ہو گئی غیور تو وہ بچپن ہی سے تھے، جیسا کہ خود ان کے والد ‡ نے اس کا اعتراف

٭ یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔
+ آبِ حیات، تذکرۂ میر
‡ دیکھو صفحہ ۵۹ —

کیا ہے، اُن کے دل پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ نوبت جنون تک پہنچ گئی۔

اب قابلِ غور یہ ہے کہ میر صاحب کے ان دو بیانات میں اس قدر تفاوت اور تضاد کیوں ہے حالانکہ نکات الشعرا بھی دلی ہی میں لکھا گیا اور ذکرِ میر بھی وہیں شروع کی اور رسوائے آخر کے کچھ کچھ اوراق کے (جس کی صراحت آگے چل کر کی جائے گی) ساری کتاب وہیں لکھی۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تذکرہ میر صاحب کے خیال میں ایک ایسی چیز تھی جو مقبول ہونے والی تھی اور چونکہ اس قسم کا یہ پہلا تذکرہ تھا (جیسا کہ میر صاحب نے خود تحریر فرمایا ہے) اس لئے یقین تھا کہ لوگ اسے شوق سے پڑھیں گے اور ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے گا انھوں نے اس ناگوار اور بدنما ذاتی اور خانگی قضیے کو چھیڑنا مصلحت نہ سمجھا اور تقاضائے غیرت نے بھی مناسب خیال کیا کہ اس پر پردہ ڈال دیا جائے، لیکن جب وہ آپ بیتی لکھنے بیٹھے تو رہا نہ گیا، ساری رام کہانی کہہ سنائی اور سچ بھی ہے وہ آپ بیتی ہی کیا جس میں بری بھلی جو کچھ بھی گزری ہو صاف صاف نہ لکھ دی جائے اب وہ واردات قلب ہو یا حالات و واقعات اپنے ہوں یا دوسرے کے، جو کچھ آنکھوں نے دیکھا یا دل پر گزرا سب ہی لکھنا پڑتا ہے اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ کتاب کبھی دوسرے ہاتھوں میں جائیگی یا مقبول ہوگی اور حقیقت بھی یہی ہے، آج تک یہ کتاب گمنامی میں رہا

رہی، یہ محض اتفاق ہے کہ آج اس کی اشاعت کا موقع نکل آیا ورنہ جہاں اور بہت سے جواہر پارے خاک میں مل گئے یہ بھی کیڑے مکوڑوں یا کسی عطار کی پڑیوں کی نذر ہو جاتی۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جو مشہور چلا آتا ہے کہ خان آرزو میر صاحب کے استاد تھے صحیح نہیں ہے۔ ہاں وہ اتنی بات کے تو اقراری ضرور ہیں کہ دوبارہ جب دلی آئے تو ماموں ہی کے ہاں آ کے ٹھیرے، چنانچہ فرماتے ہیں "بعضے چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یاران شہر خواندم" اس کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم کا حال لکھا ہے کہ کیونکر اتفاق سے راستے میں میر جعفر سے مٹھ بھیڑ ہوئی اور ان سے فارسی پڑھنی شروع کی، اتفاق سے جب وہ اپنے وطن پٹنے چلے گئے تو میر سعادت علی سے جو امروہے کے باشندے تھے، ملاقات ہوئی، انھوں نے میر صاحب کو ریختے میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی اور اس وقت سے ان کی شعر گوئی کی بنیاد پڑی میر صاحب نے بھی ایسی جان توڑ کے محنت کی اور وہ مشق بہم پہنچائی کہ تھوڑے ہی عرصے میں اُن کی شہرت سارے شہر میں پھیل گئی حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے بلکہ شاعر پیدا ہوئے تھے۔

۴۔ میر صاحب کے لکھنؤ پہنچنے کا حال بھی عجیب ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے اور آزاد نے نمک مرچ لگا کر اسے ایک افسانہ بنا دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کے سحر نگار قلم نے اس وقت اور

موقع کی اور میر صاحب کی قطع وضع اور ان کی بے کسی اور استغنا کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ ذرا ما کا لطف آ جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے عبرت کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ لیکن لکھنؤ پہنچ کر سرائے میں اترنا، مشاعرے میں جانا، اُن کی پرانی وضع پر اہل مشاعرہ کا ہنسنا اور شمع سامنے آنے پر غزل میں حسب حال فی البدیہ اشعار کا پڑھنا حقیقت سے بعید ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دلی اجڑ گئی تھی، قدردان اُٹھ گئے تھے، اہل کمال کس مپرسی کی حالت میں تھے اور ان کا ٹھکانا صرف ایک ہی رہ گیا تھا یعنی لکھنؤ کا نوابی دربار جو اس وقت بہار پر تھا۔ زمانے کے ہاتھوں تنگ آ کر ہر باکمال قدردانی کا بھوکا اپنے عزیز وطن سے منہ موڑ کر وہیں جا پہنچا تھا۔ میر صاحب اگرچہ دلی میں تنگ حال اور شکستہ دل تھے مگر بڑے غیور تھے۔ وہ بعض اور لوگوں کی طرح دوسروں پر بار ہونا یا احتیاج لے کر پہنچنا اپنی وضع کے خلاف سمجھتے تھے۔ جس طرح شجاع الدولہ نے ازراہ قدردانی مرزا سودا کو دلی سے بلا بھیجا تھا اسی طرح آصف الدولہ نے نواب سالار جنگ کے ذریعے زاد راہ بھیج کر میر صاحب کو لکھنؤ بلایا۔ لکھنؤ پہنچ کر نواب سالار جنگ کے ہاں گئے جو اُن کے حال پر پہلے ہی سے مہربان تھے انھوں نے فوراً بندگان عالی کی خدمت میں اطلاع کی۔ چار پانچ روز بعد بندگان عالی مرغوں کی لڑائی کے لیے تشریف لائے۔ میر صاحب بھی وہاں تھے محض فراست سے سمجھ گئے کہ میر صاحب ہیں،

نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے۔ اپنے شعر میر صاحب کو مخاطب کر کے سنائے اور پھر میر صاحب سے کلام سننے کی فرمائش کی مگر میر صاحب نے اپنی غزل کے صرف دو چار ہی شعر سنائے اس سے ظاہر ہے کہ میر صاحب فقیروں کی طرح لکھنؤ نہیں گئے جیسا کہ آزاد نے بیان کیا ہے بلکہ عزت سے بلائے گئے اور آخر دم تک اسی عزت سے رہے۔

۵۔ میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو بڑے مبالغے سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔ اس کا راز اُن کی ابتدائی تربیت اور پرورش اور بعد کے حالات میں ہے۔ میر صاحب کے والد بڑے پائے کے درویش تھے، لوگ اُن کے قدم لیتے اور ہاتھ چومتے تھے، بڑے بڑے لوگ ان کے ملنے کی تمنا کرتے تھے۔ ایسے حالات میں درویش دماغ دار نہ ہو تو ممکن ہے، لیکن صاحبزادے کے دماغ کا کیا پوچھنا وہ تو آسمان ہی پر ہوتا ہے۔ سید امان اللہ جو اُن کے والد کے مرید خاص تھے، میر صاحب انھیں چچا کہتے تھے۔ سید صاحب نے انھیں بڑے چاؤ چوچلے سے پالا۔ یہ شب و روز انھیں کے پاس رہتے، انھیں کے ساتھ کھاتے، انھیں کے ساتھ سوتے، جب کبھی کسی درویش سے ملنے جاتے تو میر صاحب کو ساتھ لیتے جاتے اور یہ ان کی ملاقاتوں اور صحبتوں میں حاضر رہتے۔ اُن کے والد

کی خدمت میں بھی اکثر درویش اور صوفی حاضر ہوتے، یہ چپکے چپکے سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہتے تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں جو اپنے والد کی تلقین اور دوسرے درویشوں کی باتیں اور اقوال لکھے ہیں وہ سراسر درویشی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہیں سے اُن میں غیرت، استغناء، قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا ہونے لگی تھی۔ ابھی دس گیارہ ہی برس کی عمر تھی کہ دُھری یتیمی دیکھنی پڑی، ایک تو بچا جو باپ سے زیادہ ناز بردار تھا داغِ مفارقت دے گیا، دوسرے اُسی سال باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پھر عزیز و اقارب کی طوطا چشمی، خصوصاً بھائی کی بے مروتی اور ماموں کی بدسلوکی اور دل آزاری، اس پر بے سر و سامانی اور پریشانی، ان سب پر مزید ملک و حکومت کی ناگفتہ بہ حالت جہاں آئے دن نئے نئے انقلابات اور دلخراش واقعات، خانہ جنگیاں بربادیاں برپا رہتی تھیں۔ ان سب نے اُن کے دل پر ایسے چرکے دیے کہ تن بدن کا ایک ایک تار تلملا اٹھا۔ اسی نے اُن کے کلام میں فصاحت کے ساتھ وہ سوز و گداز اور درد پیدا کر دیا جو اُن کے بعد آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

آزاد نے خانِ آرزو سے ناچاقی کی وجہ میر صاحب کی نازک مزاجی ہی قرار دی ہے اگرچہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی قدر تامل ہوتا ہے تاہم دوسرے واقعات ایسے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت نازک مزاج ضرور تھے مثلاً سادات خاں ذوالفقار جنگ بخشی کے ہاں ملازم

ہیں، ایک روز خان موصوف شب ماہ میں چاندنی میں بیٹھے تھے اور قوال
کا لڑکا ان کے سامنے بیٹھا کچھ گا رہا تھا، اتنے میں میر صاحب پہنچے، خان
نے کہا میر صاحب اسے اپنے ریختے کے دو چار شعر بتا دیجئے تو یہ اپنے
طور پر درست کرکے گا لے گا۔ میر صاحب نے کسی قدر ترش ہو کر کہا کہ مجھ
سے یہ نہیں ہو سکتا، تو اس نے اپنے سر کی قسم دی اور خوشامد کی تو میر صاحب
نے چار و ناچار چند شعر اسے یاد کرا دیئے لیکن یہ بات انھیں ایسی ناگوار
گزری کہ اس کے بعد سے خان صاحب کے ہاں جانا چھوڑ دیا اور ناراض
ہو گئے خان موصوف نے بہت سماجت کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔
مگر اس شخص کی مروت کو دیکھئے کہ اس نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور صرف
میر صاحب کی خاطر سے ان کے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا
دے کر نوکر رکھ لیا۔ راجہ جگل کشور جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وکیل بنگالہ
تھے اور بڑے امیر آدمی تھے، شوق اور قدردانی سے میر صاحب کو گھر سے
اٹھا کر اپنے ہاں لے جاتے ہیں اور اپنے شعر اصلاح کے لئے پیش کرتے
ہیں مگر میر صاحب اس کے کلام کو قابل اصلاح نہیں سمجھتے اور سب پر
خط کھینچ دیتے ہیں۔ راجہ ناگرمل جو میر صاحب کا بڑا قدردان تھا، اس
کی رفاقت محض اس وجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اس کے ایما سے بادشاہی
امرا سے کر کے آئے تھے اس پر اس نے عمل نہ کیا، بادشاہ بڑے اشتیاق
سے بار بار بلاتے ہیں مگر یہ نہیں جاتے۔ غرض میر صاحب کو اپنی وضع کا
بڑا پاس تھا اور ابتدائی تربیت اور فقر و فاقے نے وضعداری کے ساتھ

نازک مزاجی بھی پیدا کر دی تھی۔

۲۔ اس کتاب میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد انکی بعض نظموں کی اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ان کے سوتیلے ماموں خان آرزو نے اپنے بھانجے (میر صاحب کے بڑے بھائی) کے اشتعال سے انھیں طرح طرح سے ستانا شروع کیا اور ان کی خصومت اور دل آزاری اور بدسلوکی حد سے بڑھ گئی تو اس بےکسی اور بے نوائی کے عالم میں ان کے قلب پر اس کا بڑا صدمہ ہوا اور بہت ہی دل شکستہ اور دل گرفتہ رہنے لگے اس غم و غصے کی حالت میں ان پر ایک جنون کی سی حالت طاری ہو گئی اور انھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی، اس وہم کے ساتھ وحشت و دیوانگی بڑھنے لگی اور حالت نازک ہو گئی۔ اس تمام کیفیت کو میر صاحب نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ان کی مثنوی "خواب و خیال" پڑھیے تو اس واردات کی سچی تصویر اور اس خواب کی پوری تعبیر نظر آتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض خواب و خیال نہیں بلکہ ایک واقعہ تھا جو ان کے مایوس اور حزیں دل پر گزرا تھا۔

اس مثنوی کے شروع میں اپنی پریشان حالی کا ذکر کیا ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے بیگانے ہو گئے، یاروں نے بے وفائی کی۔ اور عزیز و اقربا نے بے مروتی۔ ناچار وطن چھوڑنا پڑا اور یہ پہلا وقت تھا جو گھر سے قدم باہر نکالا۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی | در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں | مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

اب دلی پہنچتے ہیں۔

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت | بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا | مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

اب اس کے بعد سے جنون کی کیفیت بیان کی جو عجیب و غریب ہے۔

میر صاحب کو دو بار کاماں جانا پڑا اور دونوں بار پریشان حالی ان کے ہمرکاب تھی۔ پہلی بار، جب دیکھا شہر کی حالت رہنے کے قابل نہیں رہی تو راجہ (ناگرمل) سے اجازت چاہی کہ شہر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاتا ہوں، یہاں رہنے کی تاب نہیں۔ راجہ نے اپنی عنایت سے اجازت دی۔ میر صاحب توکل علی اللہ لواحقین کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور بہ ہزار پریشانی کاماں پہنچے۔ یہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ تھی۔ عشرہ وہیں بسر کیا اور عاشورے کے روز وہاں سے آگے چلے دوسری بار جب راجہ جاٹوں کے ہاتھوں سے تنگ آکر اپنے تمام متوسلین کے ساتھ قلعے سے نکل کر کوچ کرتے ہوئے کاماں پہنچتے ہیں تو میر صاحب بھی بہ سبب ملازمت اس قافلے کے ساتھ ہیں۔ یہ عالم بھی پریشانی کا تھا اور غالباً اسی حالت میں انھوں نے ایک مخمس لکھا ہے۔ زمانے کی شکایت میں فرماتے ہیں۔

ے تلخ کام اٹھایا مرے تئیں — دلّی میں بیدلا نہ پھرایا مرے تئیں
ثیموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں — حاصل کہ میں سرمہ بنایا مرے تئیں
میں مشت خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

تلاش معاش میں جگہ جگہ مارے مارے پھرنے کے متعلق کئی بند لکھے
ں، ایک یہ ہے ـــ

نا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا — ضعف قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
اج ہو کے تاں کا طلب گار داں گیا — چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جان ناتوان پہ کیا صبر اختیار

گے چل کے کہتے ہیں ـــ

بت مری رواد دل پر درد نے نہ کی — تاثیر اشک سرخ و رخ زرد نے نہ کی
بیر ایک دم بھی دم سرد نے نہ کی — دل جوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں، گیا جان سے قرار

ر بند تو دو آخر کے ہیں جو میر صاحب کی حالت اور مزاج کا سچا نقشہ ہیں۔

ں سر بہ سر خراب ہے تعمیر کیا کروں — آشفتگی حال کی تعبیر کیا کروں
ونا بہائے چشم کی تعزیر کیا کروں — زردی رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہوگئی بہار

الت تو یہ کہ مجھکو غموں سے نہیں فراغ — دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
ینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ — ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

اسی طرح شہر آشوب اور مستزاد (جو دلی کے حال پر لکھی ہے) اور خاص کر جو نظم دنیا کے نام سے ہے اُن کا لطف اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آتا ہے۔ آخری نظم (دنیا) کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کتاب کے آخری صفحے کے لفظ لفظ کو نظم کر دیا ہے۔ غرض میر صاحب کے کلام کے سمجھنے اور لطف حاصل کرنے میں بھی اس کتاب سے بہت کچھ رہنمائی ہوتی ہے۔

۷۔ ذکر میر میں جہاں اُس زمانے کی معاشرت اور حکومت کے بہت سے واقعات ملتے ہیں وہاں ایک یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ اُس زمانے میں ہندو مسلمان کی کوئی بحث ہی نہ تھی۔ اس سے بڑھ کر بُرا کونسا زمانہ ہوگا جب کہ ملک میں ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، لوٹ مار کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور زوال اور انحطاط کا انتہائی وقت آگیا تھا، تاہم ہندو مسلمانوں کے تعلقات آپس میں ایسے تھے جیسے بھائیوں بھائیوں میں ہوتے ہیں۔ وہ لڑتے بھی تھے، ملتے بھی تھے، مگر اس دوستی محبت اور لڑائی بھڑائی میں مذہب و ملت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ یہ آفت اس زمانے کی لائی ہوئی ہے جس میں بدبختی سے دونوں مبتلا ہیں یا اس کا انجام سب سمجھے ہوئے ہیں مگر اپنے وہم کے ہاتھوں لاچار ہیں۔ خود میر صاحب کئی راجاؤں کے متوسل تھے، اُن کی مروت اور انسانیت کا ذکر کس محبت اور عزت سے کرتے ہیں۔ راجہ ناگرمل کی شرافت اور وضعداری دیکھئے۔ جاٹوں کی چیرہ دستی اور مردم آزاری سے آزردہ ہو کر دلیرانہ قلعہ

موڑ باہر نکل کر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ بیس ہزار گھروں کو جو انہیں کی
جیسے آباد تھے اور اکثر ان کے متوسل تھے اور جن میں ہندو مسلمان سب ہی
تھے ساتھ لیکر جاتے ہیں۔ یہ وقت خطرے سے خالی نہ تھا۔ میر صاحب لکھتے
ہیں "راقم منتظر بر خدا کردہ آنچہ لازمۂ سرداریست بکار بردہ باہر دو پسر
برادرت تمام سوار شدہ بیرون قلعہ آمدم چناں ہمت بامداد غرباں گماشت
ناموس لفرے کہ ہم آنجا نگذاشتند از لطف داداریے ہمال و بہ یمن
ہمت خوب در دو سہ روز مع این قافلہ گراں داخل کاما گشت"۔ اگرچہ
ملک کی حالت بہت خراب وخستہ اور ابتر تھی، عام و خاص، نواب اور راجہ
سب خود غرضی میں مبتلا اور ناعاقبت اندیشی میں گرفتار تھے، مگر پرانی
وضعداریاں برابر چلی جاری تھیں، بزم ہو یا رزم، غم ہو یا شادی، معاملات
ہوں یا مطالبات اُن میں وہ تنگ دلی اور تعصب نہ تھا جس کا جلوہ
ہمیں آج کل نظر آرہا ہے۔ بداخلاقی اُن میں بھی تھی، بد معاملگی اس وقت
بھی تھی، غداری اور بے وفائی سے وہ زمانہ بھی خالی نہ تھا، مگر وہ عیب
جسے مذہبی تعصب کہتے ہیں، اس سے اُن کے سینے پاک تھے۔

۱۸۔ میر صاحب بڑے مہذب اور باوضع شخص ہیں وہ کہیں مذہب کا
ذکر یا بحث نہیں کرتے، تاہم ضمناً بعض واقعات سے اُن کے مذہب اور مشرب
کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اپنے والد کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں
"روزے در خدمت شیخ سوال کرد کہ بندہ آنچہ عقائد خود درست کردہ ام
بخدمت عالی واضح است، اما در حق حاکم شام چہ فرمایند"۔ شیخ نے

فرمایا "کہونگا"۔ کچھ مدت کے بعد منہ اندھیرے محرم خاں خواجہ سرائے شاہجہانی کی مسجد تشریف لائے میرے والد کے نوکر وضو کے لئے پانی لانے کو دوڑے، والد خود اٹھے اور آفتابہ لے کر ہاتھ منہ دھلانے لگے۔ فرمانے لگے "اے علی متقی میں عمر بھر کبھی اُس کا نام زبان پر نہیں لایا ہوں، اس کا شکر کس زبان سے ادا کروں"۔ والد کہتے تھے کہ اس کے بعد سے میں نے بھی اس کا نام کبھی نہیں لیا۔

سبحان اللہ! کس خوبی اور حکمت سے تلقین کی ہے یہ بزرگ شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی، میر علی متقی کے پیر و مرشد تھے اور میر علی متقی کا شیخ سے یہ کہنا کہ "میں نے جیسا کہ آپ پڑھا ہے، اپنے عقائد درست کرلئے ہیں" شیخ کے اثر کو ظاہر کرتا ہے۔ میر صاحب بھی آخر اسی باپ کے بیٹے تھے، ابتدا سے درویشوں میں تربیت پائی، خود درویش منش واقع ہوئے تھے، اسی لئے اُن کا مشرب وسیع اور دل صاف تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ جب میر صاحب سادات خاں ذوالفقار جنگ کے پاس تھے تو ایک لڑائی میں وہ بھی ساتھ تھے، لڑائی قصبۂ سامر کے پاس ہوئی جو اجمیر سے بیس کوس ہے۔ غرض ملہار راؤ کے بیچ میں پڑنے سے لڑائی موقوف ہوئی اور صلح صفائی ہوگئی۔ میر صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی زیارت کے لئے اجمیر جا پہنچے۔ اس ماجرے کو ان چند الفاظ میں بیان کرتے ہیں، "من پس از صلح برائے حصول سعادت زیارت درگاہ فلک اشتباہ خواجۂ بزرگ رفتم"۔

۹۔ میر صاحب کی وفات کا سال تو صحیح صحیح معلوم ہے، ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں انتقال ہوا، ناسخ نے تاریخ کہی ہے "واویلا مرد شہ شاعراں" لیکن پیدائش کا سال معلوم نہ ہونے سے اُن کی عمر کے متعلق بہت اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "عمرش تخمیناً قریب بہ ہشتاد است"۔ تذکرے کی تالیف کا سنہ ۱۲۰۹ھ ہے۔ اس حساب سے تقریباً ۹۶ سال ہوتے ہیں۔ جہاں نے اُن کی عمر ۸۰ ہی برس لکھی ہے۔ اگرچہ میر صاحب نے اس کتاب میں اپنی پیدائش کا سنہ نہیں لکھا تاہم بعض حالات اور قرائن ایسے موجود ہیں جن سے اُن کی عمر اور پیدائش کا تخمینی سنہ معلوم ہو سکتا ہے۔

جب سید امان اللہ کا (جنھیں میر صاحب عم بزرگوار کر کے لکھتے ہیں) انتقال ہوا اور رنج و غم سے اُن کی حالت بہت نڈھال ہوئی تو ان کے والد ان کو سمجھانے لگے، اس میں ایک فقرہ بھی فرمایا "کہ ما من نہ طفل مائے، الحمد اللہ کہ دہ سالہ" اور اسی سال میر علی متقی کا بھی انتقال ہو گیا۔ گویا باپ کی وفات کے بعد اُن کی عمر دس سال کی تھی یا زیادہ سے زیادہ گیارہ سال کی ہوگی۔ باپ کے مر جانے سے اس چھوٹی سی عمر میں فکر معاش ہوئی جس کی تلاش میں وہ اکبر آباد کے آس پاس بہت کچھ پھرے۔ جب مایوس ہوئے تو شاہجہاں آباد کا قصد کیا۔ نواب صمصام الدولہ امیر الامرا نے اُن کے باپ کے حقوق کا خیال کر کے میر صاحب کا ایک روپیہ روز مقرر کر دیا اور یہ روزینہ نادر شاہ کے حملے تک ملتا رہا۔

اس جنگ میں نواب صاحب کے مارے جانے سے بند ہو گیا۔ نادر کا حملہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا۔ اس کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ساٹھ سال بتائی ہے اور کتاب کی تاریخ اس قطعہ سے نکالی ہے۔

مسمی باسمی شد اے باہنر — کہ این نسخہ گرد و بہ عالم سمر
ز تاریخ آگہ شوی بیگمان — فزای عدد بست و ہفت از برا

کتاب کا نام "ذکر میر" ہے جس کے عدد ۱۱۷۰ھ ہوتے ہیں۔ اس میں ۲۷ ملائے تو ۱۱۹۷ھ ہوئے۔ اس میں سے اگر ساٹھ گھٹا کئے تو ان کی پیدائش کا سال تقریباً ۱۱۳۷ھ نکلتا ہے۔ اس حساب سے نادر کے حملے کے وقت ان کی عمر کوئی پندرہ سال کی سمجھنی چاہئے۔ اس حادثے کے بعد وہ پھر دہلی جاتے ہیں اور چند روز اپنے ماموں خان آرزو کے مہمان ہوتے ہیں۔ ایک مدت کے بعد جب راجہ ناگر مل کے ہمراہ اکبر آباد جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو لکھتے ہیں کہ تیس سال بعد وطن میں آنا ہوا۔ یعنی اس وقت ان کی عمر ۴۵، ۴۶ برس کی ہوگی۔

آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے دلی ۱۱۹۰ھ میں چھوڑی لیکن گلشن ہند (اور گلزار ابراہیم) میں ان کے لکھنؤ جانے کی تاریخ ۱۱۹۷ھ لکھی ہے اور لکھا ہے کہ اس وقت مرزا محمد رفیع سودا اس جہان فانی سے عالم باقی کو سدھار چکے تھے۔ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں میر صاحب کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وقت وہ دلی ہی میں ہیں، حسن کے تذکرہ کا سنہ تالیف ۱۱۹۴ھ ہے

غرض لطف ہی کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب لکھنؤ ۱۱۹۷ھ میں پہنچے۔ اس حساب سے میر صاحب کے لکھنؤ پہنچنے اور ذکر میر کے ختم ہونے کا ایک ہی سال ہوتا ہے اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ تھی۔ اب اگر سنہ پیدائش ۱۱۳۷ھ اور سنہ وفات ۱۲۲۵ھ ہو تو میر صاحب کی عمر تقریباً ۸۹ برس ہوتی ہے، بہرحال ۹۰ سے زائد کسی حال میں نہیں اور میری رائے میں یہی صحیح بھی ہے۔

۱۰۔ ذکر میر ایک نادر الوجود کتاب ہے۔ ہماری زبان میں ایک نہیں بیسیوں تذکرے شعرا کے لکھے گئے ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے مگر کسی تذکرے میں اس کتاب کا نام نہیں۔ آزاد نے بہت تفصیل سے میر صاحب کے کلام اور تصنیفات کی فہرست دی ہے مگر ذکر میر کا ذکر اس میں بھی نہیں۔ سوائے ڈاکٹر اسپرنگر کے کہ اس نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے اور کہیں اس کا پتہ نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ کتاب خان بہادر مولوی بشیر الدین احمد صاحب بانی مسلم ہائی اسکول اٹاوہ کے ہاتھ لگ گئی اور ان کی عنایت سے ہمیں دیکھنی نصیب ہوئی اور اس کے شائع کرنے کا موقع ملا۔ میں مولوی صاحب کے اس لطف و کرم کا بیحد ممنون ہوں۔ یہ نسخہ بہت صاف اور اچھا لکھا ہوا ہے۔ کتابت ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۸ء) کی ہے یعنی میر صاحب کی زندگی ہی میں لکھا گیا اور کیا تعجب ہے کہ انہیں کے نسخے کی نقل ہو۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ اور محاورات کے معنے بھی دیئے ہیں جو ہم نے

بجنسہ چھاپ دئیے ہیں البتہ مضامین کے عنوان اس میں نہیں تھے وہ ہم نے اضافہ کئے ہیں۔ جب پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے۔ وائس پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور کو جو علم و ادب کا خاص ذوق رکھتے ہیں یہ معلوم ہوا کہ میرا ارادہ اس کتاب کے شائع کرنے کا ہے تو انھوں نے مجھے فوراً لکھا کہ ایک نسخہ اس کا میرے پاس بھی ہے۔ کہو تو بھیج دوں، چنانچہ انھوں نے میرے لکھنے پر اپنا نسخہ مجھے مستعار عنایت فرمایا جس کا میں بہت شکرگزار ہوں۔ میں نے کتاب کا چھپنا روک دیا اور ٹاوے کے نسخے سے مقابلہ کرنا شروع کیا اس سے بعض بعض جگہ بہت مدد ملی۔ پروفیسر صاحب کا نسخہ ایسا اچھا لکھا ہوا نہیں ہے جیسا ٹاوے کا ہے اور ناقص بھی ہے یعنی ایک چوتھائی سے زائد کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخری حصہ میر صاحب نے بعد میں بڑھایا ہے، چنانچہ لکھنؤ جانے کا حال لاہور کے نسخے میں مطلق نہیں۔ جہاں کہیں ان دو نسخوں کی عبارت میں اختلاف تھا۔ اس اختلاف کو ہم نے حاشیے میں (ل) کا نشان کر کے لکھ دیا ہے، کتاب کے آخر میں میر صاحب نے کچھ لطیفے بھی جمع کر دئیے ہیں بعض پرانے اور تاریخی ہیں اور بعض خود کے زمانہ کے ہیں اور پر لطف ہیں۔ مگر افسوس کہ بعض اُن میں سے ایسے فحش ہیں کہ اُن کا لکھنا یا بیان کرنا ممکن نہیں، اس سے اُس زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہے ورنہ میر صاحب کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا ہے! اس وجہ سے نیز اس لئے کہ یہ ایک غیر متعلق چیز تھی ہم نے یہ لطیفے اس کتاب سے خارج کر دئیے ہیں

مقدمۂ تمدن ہند

مترجم کا مختصر تذکرہ

شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی مرحوم ہندوستان کے عہد جدید کے
ان نامور علما میں سے ہیں جنہوں نے علوم والسنہ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کرکے
ہند کے تمدن علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ہے - یہ لوگ حقیقت جدید
جدید تعلیم کے رہبر و رہنما ہیں اور انکے متعلق وہ شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی جو اسوقت انگریزی
تعلیم یافتہ اصحاب کے متعلق عام طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قدیم علوم و تہذیب سے
بے بہرہ رہ جاتے ہیں جس سے حمیت قومی میں ضعف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے - اس
شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ اس نقص کی طرف جلد مبذول ہوگئی اور اسکی اصلاح
کی ہر طرف کوشش کی جا رہی ہے -

مرحوم بلگرام کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے اور یہ خاندان
مسلمانوں کے اُن معدودے چند خاندانوں سے ہے جنھوں نے ایسے زمانہ میں جبکہ

ہند میں مختلف قوتیں کام کر رہی تھیں اور باہمی کشمکش سے ملک میں بے اطمینانی تھی زمانے کا رخ پہچاننا اور عاقبت اندیشی اور دور بینی سے کام لے کر ادھر کو چلے جدھر زمانہ جا رہا تھا اور جہاں آخر سب کو جھکنا پڑا۔

اُنکے آباء اجداد شہر واسط سے جو عراق عرب میں بغداد و بصرہ کے درمیان واقع ہے چھٹی صدی میں ہندوستان آئے۔ اور اودھ میں مقیم ہوئے۔ اُنکے جد امجد مولوی سید کرامت حسین خان بہادر وائسرائے کے دربار میں شاہ اودھ کی طرف سے قائمقام تھے۔ بعد الحاق انکے والد اور چچا دونوں انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ اور معتبر خدمات پر سرفراز رہے۔

انکے چچا سید اعظم الدین حسین خاں لارڈ ولیم بنٹنگ کے مصاحب (اے ڈی سی) اور اورنٹیل انٹرپریٹر (ترجمان السنۂ شرقیہ) تھے اور بعد میں سندھ میں پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے اور دریائے سندھ کی نگرانی بھی انہیں تحویل کی گئی۔ یہ ایسی باوقعت اور اہم خدمت تھی کہ سوائے انگریز کے کسی دوسرے کو ملنی محال تھی لیکن چونکہ امیران سندھ اپنے ہاں انگریز کا آنا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے یہ اعظم الدین خان کا انتخاب کیا گیا جس سے انکی وقعت اور قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آنریبل نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) بسبیل تذکرہ فرماتے تھے کہ جب اہل سندھ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سید ہیں تو انکے بنگلے پر جو دریا کے کنارے تھا لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور بوجہ خوش اعتقادی بے انتہا حرمت و توقیر کرتے تھے اور بیماروں کے لیئے تعویذ مانگتے تھے چنانچہ انکا قاعدہ تھا کہ فرصت کے بعد عربی کے اشعار یا قرآن کی آیات جو اسوقت یاد آتیں کاغذ کے پرچوں پر لکھ لکھ کر ٹوکرے میں ڈالتے جاتے تھے اور دوسرے روز لوگوں کو تقسیم کر دیتے

تھے اور ان میں سے اکثر اچھے بھی ہو جاتے تھے۔ انگریزی خوب جانتے تھے
لیکن جب تک وہاں رہے کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھی تاکہ لوگ بدگمان
ہو جائیں۔ مگر بدگمانی سے نہ بچ سکے۔ چونکہ بہت وجیہ گورے چٹے تھے لوگوں میں مشہور
و گیا کہ دراصل یہ انگریز ہے لیکن مسلمان بنا ہوا ہے اسلئے وہاں عام طور پر بھی پیدا ہو گئی
ہاں تک کہ جان سے مار ڈالنے کی سازش کی گئی۔ انھیں بھی اسکی اطلاع ہو گئی اور راتوں
ات جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ دو بار بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے
ہار میں ڈپٹی کلکٹر اور سٹلمنٹ افسر (افسر بندوبست) رہے۔ دیسی طبقہ میں سی۔ ایس آئی
کے پہلے گروہ میں سے تھے۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے آرہ ہاؤس کے بچانے
میں کنور سنگھ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور مشہور آرہ گاریسن ہاؤس کے ہیرو سمجھے جاتے
ہیں۔

مرحوم کے والد سید زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری
اور ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدہ پر رہے اور ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۵ء تک اپنی خدمات کے فرائض کو حسن و خوبی
کے ساتھ انجام دیا۔ اور پنشن پانے کے بعد ریاست حیدرآباد میں کمشنری انعام کی
خدمت پر تقرر ہوا۔

مرحوم کے چچا اور والد مشرقی علوم و السنہ کے عالم اور فاضل تھے اور بعد ازاں
انہوں نے مدرسہ عالیہ میں جو لارڈ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں قائم کیا تھا تعلیم پائی،
ہندوستان میں یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔

مولوی سید علی مرحوم اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء
میں تولد ہوئے۔ آٹھ برس کے سن سے چودہ برس تک علوم عربیہ حاصل کرکے

ہیں کہ حافظہ انکا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی لکیر تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں عربی فارسی تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۸۶۶ء میں انگریزی میں داخل ہوئے یہاں بھی انہوں نے خوب ترقی کی دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں شریک ہوئے اور ۱۸۷۴ء یعنی کل آٹھ سال میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے میں انکی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ کالج کے مدرس اور پروفیسر مرحوم کی ذہانت قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔ اسکے بعد تین سال تک قانون کا مطالعہ کیا اور سال بھر بعد امتحان ڈپٹی سول سروس میں کامیاب ہوئے اور کل ضلع بہار میں نمبر اول رہے۔ بعد ازاں ٹامسن اسکالرشپ پاکر وہ رڑکی کے انجینئرنگ کالج میں داخل ہوگئے۔ ابھی پورے چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے کہ حیدرآباد دکن کے نامور مدبر اور عالی دماغ وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے جنکی قدردانی اور جوہر شناسی مشہور آفاق ہے انھیں حیدرآباد میں طلب کر کے اپنے پرسنل اسٹاف میں داخل کیا اور ولایت جاتے وقت اپنے ساتھ لیگئے اور لندن کے شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل کر دیا۔ اور بجائے تین سال کے دو سال میں ایسوشی ایٹ کا امتحان بدرجہ اعلیٰ پاس کیا اور علم طبقات الارض میں (مرچی سن) تمغہ پایا۔ علاوہ اسکے کیمسٹری، طبیعیات، مکانیک، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیوٰۃ وغیرہ علوم میں دستگاہ وافر حاصل کی۔ پروفیسروں نے انکی لیاقت و ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور اعلیٰ درجہ کے صداقت نامے دئے ہیں۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے بزمانہ قیام انگلستان ایسے ماہرین فن اور علمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اسوقت آسمان فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ مثلاً پروفیسر ہکسلے، پروفیسر جڈ، پروفیسر گتھری، پروفیسر شنڈلر وغیرہ جو ہر ایک

اپنے فن میں یکتا تھا اس سے قبل انہوں نے ۱۹۱۴ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان میٹری کولیشن بدرجۂ اعلیٰ پاس کیا تھا اور اس امتحان میں انکی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں تکمیل تعلیم کے بعد انہوں نے فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا، اور اطالین زبان اور علوم کی تحصیل کے لیے کچھ مدت اٹلی میں قیام کیا۔ اور اس طرح علوم مغربی و مشرقی سے بہرہ ور ہو کر حیدرآباد واپس آئے جہاں سرکار عالی نے انہیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا کچھ عرصے کیلئے وہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے۔

مرحوم مختلف السنہ و علوم کے فاضل تھے اور لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی زبانیں خوب جانتے تھے مرحوم پہلے مسلمان تھے جو بار بار مدراس یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے کے سنسکرت کے ممتحن مقرر ہوئے اور ویدوں اور ویدک علم ادب میں امتحان کے پرچے مرتب کیے میں نے کئی پنڈتوں سے یہ سنا ہے کہ انکا تلفظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے سے وید پڑھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا پنڈت پڑھ رہا ہے۔ اور یہ تو ہم نے خود دیکھا ہے کہ وہ جرمنی، فرانسیسی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ نہایت روانی کے ساتھ بلا تکلف پڑھتے چلے جاتے تھے۔

مرحوم آخر عمر تک (باستثنا بعض عارضی تقررات کے) معتمد تعمیرات و ریلوے و معدنیات رہے۔ سر آسمان جاہ بہادر مرحوم کی وزارت میں بعض انقلابات سے بددل ہو کر انہوں نے امتحان وکالت کی تیاری اسوقت کی جبکہ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی۔ ایل میں صرف چار مہینے باقی رہ گئے تھے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس امتحان میں تمام یونیورسٹی میں اول رہے اور طلائی تمغہ، یونیورسٹی لا اسکالرشپ اور چند انعام کتب

حاصل کیا۔ اس سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں کسی مسلمان طالب علم کو قانونی امتحان میں یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا یہ امتحان انہوں نے نومبر ۱۸۹۱ء میں پاس کیا اس سے مولوی سید علی مرحوم کے خداداد حافظہ اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ ہند نے انہیں شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا اور بلاشبہ وہ اس کے مستحق تھے

سنہ ۱۹۰۶ء میں بعض پولیٹیکل وجوہ سے ایک پنشن قرار وظیفہ (۱۰۰ ماہانہ) لیکر خدمت سے علیحدہ ہو گئے اور انگلستان میں جا کر مقیم ہو گئے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرار مقرر کئے گئے اسی سال انڈیا آفس میں عربی فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور ہوئے، یہ بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کی تعداد چھ ہزار سے کم نہیں۔ اس کی فہرست کا ترتیب دینا معمولی کام نہ تھا بلکہ ایک بڑا اور اہم کام خیال کیا گیا انڈیا آفس لائبریری کا حصہ دہلی منیوسکرپٹ (قلمی نسخہ ہائے دہلی) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دلی کا شاہی کتب خانہ تھا جو غدر کے بعد لندن بھیج دیا گیا

شاہجہان نے پورب کو شیراز کہا تھا، لیکن پورب میں بلگرام کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ عجیب مردم خیز خطہ ہے اسی قصبے سے سید مرتضی صاحب تاج العروس علامہ سید عبد الجلیل و مولانا آزاد وغیرہ ہم جیسے فاضل پیدا ہوئے اور اس آخری دور میں شمس العلما مولوی سید علی مرحوم اور انکے بڑے بھائی مولوی سید حسین نواب عماد الملک بہادر سی۔ ایس۔ آئی کا شمار بھی انہیں باکمال علما میں ہو سکتا ہے۔

مولوی سید علی مرحوم بلاشبہ مختلف علوم دانستہ کے عالم تھے لیکن جب انکے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انکے علم کے مقابلہ میں انکا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً جفاکشی اور

علمی کام کی طرف کم راغب تھے، دوسرے دکن کی آب و ہوا اور خاص کر یہاں کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ آدمی کرتا بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے اور خاص کر علمی کاموں کو زیادہ راس بھی نہیں۔ یہ سرزمین آج سے نہیں بلکہ صدہا سال سے کچھ ایسی انقلاب انگیز واقع ہوئی ہے کہ ہر دور میں ایک نہ ایک طوفان بپا رہا ہے۔ گو اب جنگ و جدل کا زمانہ نہیں رہا طوائف الملوکی اور غارت گری کا دور ختم ہو چکا ہے مگر پھر بھی کوئی ایسا شوشہ نکل آتا ہے کہ چین سے بیٹھنا اور اطمینان سے کام کرنا نصیب نہیں ہوتا اور خصوصاً مرحوم کی سی بے چین اور متلون طبیعت کیلئے اس دلدل سے نکلنا بہت دشوار تھا لیکن باوجود اسکے مرحوم علمی کام کی طرف سے غافل نہ رہے، اگرچہ انکا کام زیادہ تر بلکہ کل کا کل ترجمہ ہی تک رہا۔ لیکن اس زمانہ میں بہ نسبت ناقص اور فضول تالیف و تصنیف کے غیر زبانوں کی عمدہ تصانیف کا ترجمہ بسا غنیمت اور قابل قدر ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی اور خاص کر مسلمانوں کی اس وقت جیسی کچھ حالت ہے اسے مد نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ علمی بیداری کا پہلا دور ترجمہ ہی ہے۔ اگر غیر زبانوں کی علمی اور اعلیٰ تصانیف کے ترجمے ہو جائیں، تو آئندہ دور کی تالیف و تصنیف کیلئے بیش بہا سرمایہ اور پیش خیمہ ہوگا یہاں ہم مرحوم کی تالیفات و تراجم کی فہرست پیش کرتے ہیں۔

۱۔ میڈیکل جورس پروڈنس یعنی اصول قانون متعلق بہ طب۔ یہ کتاب علاوہ اطبا و وکلا اور حکام عدالت کے عام ناظرین کیلئے بھی بہت دلچسپ ہے (ڈاکٹر بیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے) اس کتاب میں انسانی فطرت کے تاریک پہلو کو پڑھ کر بڑی عبرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ماثر وزارت سر آسمان جاہ مرحوم سرکار نے مترجم کو کچھ ہزار روپے بطور صلہ عنایت فرمائے۔ اس کتاب میں ایک امر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ علمی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا

۲۔ رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ اس میں مرحوم نے مشہور و معروف کتاب کلیلہ و دمنہ کے متعلق بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور اس امر کے پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں یہ کتاب کہاں کی ہے، پھر کہاں کہاں گئی اور کس کس زبان میں اسکا ترجمہ ہوا اور کیا کیا تغیرات عمل میں آئے۔ مرحوم کی یہ مختصر تالیف بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ اسے مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے ایک اجلاس منعقدہ علی گڈھ میں پڑھا تھا مرحوم فرماتے تھے کہ بزمانۂ قیام لندن ایک علمی سوسائٹی میں مسلمانوں کے تمدن و علم و ادب کا ذکر تھا، ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق اپنی اپنی رائے دے رہا تھا، اسی میں مرحوم نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے تمام آثار اور انکے کارنامے دنیا سے نابود بھی ہو جائیں اور دو کتابیں کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ باقی رہ جائیں تو انکے کارہائے نمایاں کیلئے کافی ہیں۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ کلیلہ و دمنہ کی طرح ایک رسالہ الف لیلہ پر بھی لکھیں اور اسکے لئے دوا لمایہ یوں بھر کتابیں جمع کی تھیں۔

۳۔ فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

۴۔ غارہائے الورہ کا گائڈ۔

۵۔ حیدرآباد کے اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات۔

۶۔ تمدن عرب۔ موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔ درحقیقت یہ کتاب عربی و اسلامی تمدن پر بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے

۷۔ تمدن ہند۔ یہ کتاب بھی موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا مفصل ذکر اس دیباچہ کے دوسرے حصے میں کیا گیا ہے۔

۸۔ مرحوم نے موسیو سدیو کی کتاب تمدن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اردو میں کیا

کیا تھا، لیکن جب انہوں نے یہ سنا کہ اسکا ترجمہ عربی میں ہوگیا ہے تو اسکو طبع نہیں کرایا
حالانکہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا اس لئے کہ عربی میں کامل کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا
بلکہ صرف اس کا خلاصہ شائع کیا گیا ہے [1]

مرحوم نے حیدرآباد سے ایک عربی سہ ماہی رسالہ الحقایق نامی ۱۳۰۹ھ میں جاری
کیا تھا جسکے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے۔ اس رسالہ میں اچھے اچھے مضمون لکھے گئے،
لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی، علامہ مولوی سید علی شوستری
ڈاکٹر لائیٹنر، مولوی سید کرامت حسین صاحب جیسے فاضل اور عالم لوگ تھے لیکن افسوس ہے
کہ استقلال کے ساتھ کام نہوا اور رسالہ کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں
کی بھی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان اور دیگر ممالک اسلامی میں تعلقات و روابط
قائم رکھنے اور ایک کو دوسرے کے خیالات وحالات سے آگاہ کرنے کا ذریعہ عربی
زبان ہی ہو سکتی ہے۔ نیز یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آیندہ اسلام کی ترقی وعروج میں عربی زبان
کو بہت بڑا دخل ہوگا اس لئے کہ اسوقت مختلف اسلامی ممالک میں باوجود موجودہ انحطاط
وانتشار کے باہمی اتحاد اور ہمدردی قائم رکھنے والی علاوہ دیگر اسباب کے ایک عربی
زبان بھی ہے اور آیندہ چل کر یہی بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کرنے میں مدد دیگی
مسلمانوں کو اس زبان کی تحصیل سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہئے کیونکہ ہماری مذہبی
علمی، تاریخی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی ترقی بغیر اس زبان کے ناقص و ناممکل رہے گی

اپنے زمانۂ ملازمت میں مرحوم نے ایک بہت قابل قدر کام کیا تھا اور اگر وہ
جاری رہتا اور قاعدہ سے چلایا جاتا اور اسکا چلانے والا ایسا شخص ہوتا جس کے دل
میں علمی ترقی اور قومی ہمدردی کی آگ ہوتی تو وہ بڑے برکت وخیر کا باعث ہوتا۔

[1] اس کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے۔ انشاء اللہ ناظرین الناظر جلد اوس سے مستفید ہوں گے۔

مرحوم نے نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدر دان امیر تھے ایک ایک سر رشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہونچایا جائے۔ مرحوم اس سر رشتہ کے نگران مقرر ہوئے اور انکی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کیلئے کوئی مناسب شخص نہیں ملا تھا لہذا انہوں نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور انکا تقرر خدمت ناظم سر رشتۂ علوم و فنون پر بمشاہرہ ۵۰۰ ہوا اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں لیکن ملک کی بدنصیبی سے یہ سر رشتہ ٹوٹ گیا اور کام اب تک بند ہے جس ضرورت سے یہ سر رشتہ قائم ہوا تھا وہ اب تک باقی ہے اور جب سے شمالی ہند و دیگر حصص ملک میں اردو پر لے دے ہوئی ہے ضرورت اور نمایاں طور پر محسوس ہو رہی ہے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بعد اردو کی سرپرستی دو مقامات پر خاص طور پر ہوئی ایک تو پنجاب میں دوسرے حیدرآباد دکن میں۔ پنجاب میں اسکے بانی ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائڈ تھے۔ ان صاحبوں کی تحریک سے پنجاب یونیورسٹی نے بیش بہا اور گرانقدر انعامات کے ذریعہ سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو زبان میں لکھوائیں اور ترجمہ کرائیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری رہا۔ لیکن حال میں اس عام مرض کی وجہ سے جو ملک کی بدقسمتی سے ہر جگہ شائع ہو گیا ہے بعض حضرات نے وطن پرستی کے پردے میں پنجابی کو اردو کا حریف بنا کر لا کھڑا کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی نے اردو کی سرپرستی سے بیقدر اپنا ہاتھ روک لیا ہے۔ اب اردو کو صرف ایک دولت آصفیہ کا آسرا

رہگیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان کو علاوہ اسکے کہ دکن نے اسکی نشو ونما میں ابتدا سے بہت بڑا حصہ لیا ہے اور مختلف وجوہ سے بھی دولت آصفیہ پر بہت بڑا حق حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرکار عالی نے عربی فارسی اُردو تصانیف کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور اب بھی جاری ہے، لیکن خاص اصول اور جوش کے ساتھ یہ کام ابتک نہیں ہوا ہے۔ اب کہ سب طرف سے مایوسی ہے سرکار عالی کا یہ فرض ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرکے اس مفید اور ضروری کام کو اصول کے ساتھ چلائے۔ اور نہیں تو کم سے کم پنجاب یونیورسٹی کی طرح متعدد بیش قدر انعامات مقرر کرکے عام طور پر اشتہار دے اور علمی کتابیں اُردو میں لکھوائے۔ یا ترجمہ کرائے تاکہ مولفین و مترجمین کی ایک حد تک حوصلہ افزائی ہو سکے۔ اسپر توجہ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں اہل قدر قدر شناسی کا مادہ پیدا نہیں ہوا کہ مصنفین و مولفین اس کے بھروسہ پر بڑے بڑے کام کر سکیں۔ اور اس لئے ضرورت ہے کہ ایک زمانہ تک اس کے سر پر حکومت و دولت کا ہاتھ رہے۔

مرحوم کو کتابوں کا حد درجہ شوق تھا چنانچہ ایک نہایت عمدہ کتاب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یوں تو قریباً ہر فن اور علم کی کتاب ہے لیکن خاص کر وہ تمام مطبوعات جو یورپ میں اسلامی علوم، علم ادب پرانے زمانہ میں شائع ہوئی ہیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کی ہیں صرف ان کتابوں ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں کے وہ موقت الشیوع رسالے بھی جمع کئے ہیں جن میں اسلامی مباحث پر عمدہ عمدہ مضامین شائع ہوئے ہیں اسلامی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کسی دوسری جگہ ایسا

بے بہا مجموعہ موجود نہیں کاش کوئی خدا کا بندہ جس کے دل میں درد ہو یہ کتاب خانہ خرید کر
مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ کی نذر کر دے تاکہ کالج جب حقیقی یونیورسٹی بن جائے
تو یہ اسکے لئے باعث رونق و افادہ ہو اور اُس محسن کو زندگی جاوید حاصل ہو۔

مرحوم بہتیرے عمدہ اور نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے چنانچہ کتاب الوصایا لابو
حاتم السجستانی کا قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبد القادر
بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں تھا،
فرانس کے کسی عالم نے بغرض طبع طلب کیا کیونکہ دنیا میں اس کتاب کا اور کوئی نسخہ نہیں ہے
جب کتاب کتب خانہ کی الماری سے نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئی
ہے کہ فرانس پہونچتے پہونچتے آٹا ہو جائے گی تو یہ رائے قرار پائی کہ اسکا فوٹو لے لیا جائے
چنانچہ دس کاپیاں بذریعہ فوٹو لی گئیں۔ مرحوم کے ولایت پہونچنے سے چار روز پہلے سب
کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ مرحوم کو جب معلوم ہوا تو اس پروفیسر کے پاس پہونچے جس نے
فوٹو لیا تھا اور جا کر منت اصرار کیا کہ ایک نسخہ مجھے بھی عنایت ہو۔ پروفیسر موصوف نے عذر
کیا کہ اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں سوائے ایک کتاب کے جو میرے ذاتی کتب خانہ کیلئے ہے مگر چونکہ
آپ مجھ سے زیادہ شایق معلوم ہوتے ہیں لہذا وہ نسخہ آپ کی نذر کرتا ہوں چنانچہ وہ
نسخہ اب تک مرحوم کے کتاب خانہ میں موجود ہے اسکی جلد بھی بہت قیمتی ہے۔

مرحوم نے جمہرۃ اللغۃ لابن درید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانسو روپیہ میں
خریدی۔ انکے ایک معزز دوست جو حیدرآباد میں ایک اعلیٰ خدمت پر تھے ان سے مستعار لے گئے
اور کچھ عرصہ بعد کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں ڈیڑھ دو ہزار کو فروخت کر دی۔ مرحوم
بھول گئے تھے، چار سال بعد جو ایک روز کتب خانہ میں آئے اور اس کتاب کا ذکر آیا تو

معلوم ہوا کہ اسکا ایک نسخہ کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ دیکھنے کیلئے طلب کی تو معلوم ہوا کہ
یہ نسخہ تو انہیں کا ہے اور جب سکے فروخت کی کیفیت سنی تو بہت رنج ہوا۔ آخر بڑی احتیاط
سے اسکی ایک نقل لی اور جب برلن گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی اُسے بیحد پسند آئی
چونکہ روپیہ کی ضرورت تھی لہذا پندرہ ہزار میں فروخت کر دی۔

تزک بابری کا کامل ترکی نسخہ اب تک دنیا میں کہیں طبع نہیں ہوا۔ اصل ترکی
نسخہ ایک سینٹ پیٹرزبرگ میں ہے اور دوسرا فرانس میں لیکن دونوں ناقص ہیں
مرحوم نے ترکی تزک کا کامل نسخہ نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کے کتب خانہ میں دیکھا
اور وہاں سے انگلستان جاتے وقت نسخے ساتھ لیتے گئے۔ یورپ کی علمی سوسائٹیوں
میں جب تزک کا ذکر آیا تو مرحوم نے اس قلمی نسخہ کو پیش کیا بعد مقابلہ اور تحقیق کے یہ ثابت
ہوا کہ سوائے اس نسخے کے باقی جس قدر نسخے دنیا میں اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں
ناقص ہیں۔ چونکہ تصحیح کیلئے متعدد نسخوں کا ہونا ضروری ہے اور اسمیں تاخیر بھی بہت ہوتی
ہے لہذا یہ قرار پایا کہ گب میموریل فنڈ کی طرف سے کل کتاب کا فوٹو لے لیا جائے چنانچہ
ایسا ہی ہوا اور یہ تمام کیفیت عکسی نسخے میں درج ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں جاگیر نواب سالار جنگ مرحوم
محکمۂ مالگذاری کی نگرانی میں تھی، بعض حاسدوں نے محکمۂ مالگزاری میں یہ شکایت کر دی کہ مولوی
سید علی ایک نایاب کتاب کتب خانہ سے لیگئے ہیں انکو لکھا جائے یا تو کتاب واپس کریں
ورنہ انکے وظیفہ سے اسکی قیمت وضع کر لی جائے۔ چنانچہ محکمۂ مالگزاری کی طرف سے
یہی لکھا گیا۔ مرحوم نے اسکے جواب میں اصل نسخہ اور ایک جلد اس کے عکسی نسخے
کی معتمد مالگزاری کی خدمت میں بھیجدی اور لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب کا کوئی نقصان
نہیں کیا بلکہ اسے زندہ کر دیا ہے۔

مرحوم کو ابن عرب شاہ مصنف تاریخ تیموری کی ایک دوسری نادرالوجود کتاب جو مصر کی تاریخ پر مشتمل تھی ولایت سے دستیاب ہوئی۔ مرحوم نے اسے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں طبع کرانا شروع کیا، لیکن دوران طبع میں وجع مفاصل کا مرض لاحق ہوگیا اور اسی وجہ سے وہ تکمیل کو نہ پہونچ سکی۔

مرحوم کو اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیل علم کیلئے سہولتیں پیدا کی جائیں، ایک مرتبہ انکی رائے ہوئی کہ حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون کی ترتیب بدل دی جائے موجودہ کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتاب کتب کی حروف تہجی پر تقسیم کیگئی ہے۔ اس ترتیب کیا یہ خرابی ہے کہ جب تک کوئی پوری کتاب نہ پڑھے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فلاں مصنف کی اس میں کون کون سی کتابوں کا ذکر ہے اور کن کن مقامات پر ہے۔ مرحوم نے یہ تجویز کی تھی کہ کل کتاب کے مصنفین کو حروف تہجی پر مرتب کیا جائے اور ہر مصنف کے نام کے ذیل میں اسکی تصانیف لکھدی جائیں تا کہ جب کوئی کسی مصنف کا تذکرہ دیکھنا چاہے تو اسکے حالات اور تصانیف ایک جگہ مل جائیں چنانچہ اس کام کے انجام دینے کیلئے ایک شخص کو مامور کیا اور تقریباً دس برس تک پندرہ روپیہ ماہانہ خرچ کرتے رہے لیکن افسوس ہے کہ چونکہ مرحوم میں استقلال نہ تھا اسلئے یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہونچا

اسی طرح مرحوم کو فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم کرنے کا خیال پیدا ہوا عالم موصوف نے ایک جلد میں قرآن مجید کو اصل عربی میں اور دوسری میں اسکا فہرستی انڈکس یورپ میں شایع کیا ہے۔ جسکے طفیل میں قرآن پاک کی ہر صورت اور آیت آسانی سے نکل آتی ہے اور یہ مصنفین و مولفین کیلئے نہایت کارآمد اور مفید ہے لیکن اس میں ہر آیت اور سورت کیلئے صرف ہندسوں کا نشان ہے لیکن مرحوم

یہ چاہتے تھے کہ بجائے ہندسوں کے سورۃ کا نام لکھدیں چنانچہ اس طریقہ پر انڈکس مرتب کرلیا گیا تھا اور ارادہ تھا کہ بیروت میں طبع کراکر کم قیمت پر فروخت کیا جائے لیکن افسوس کہ طبع کی نوبت نہ آئی۔

مرحوم اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب ایسے لوگوں میں سے کوئی اُن سے ملنے جاتا تو اُس سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں اور اگر اس اثنا میں کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب صاحب علم سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے فرزند نواب ولی الدین خان بہادر تشریف لائے ہیں۔ مرحوم نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نواب صاحب سے عرض کر دو کہ میں ایک عالم سے گفتگو کر رہا ہوں جس کو آپ کی خاطر سے ترک نہیں کر سکتا، اگر آپ کو مجھ سے ملنا ایسا ضروری ہے تو دو گھنٹے انتظار فرمائیے اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد آپ سے ملوں گا۔

یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے، وہ نہ صرف اہل علم کی قدر و منزلت کرتے تھے بلکہ انکے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا حالی کی انکے دل میں بہت وقعت تھی۔ چنانچہ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حیات جاوید چھپ چکی ہے اور مولوی عبداللہ خان صاحب کے پاس کچھ نسخے آئے ہیں تو رات کے آٹھ بجے کتاب منگوائی، اور اسی وقت مطالعہ کرنا شروع کیا اور بہت سا حصہ پڑھ ڈالا اور دوسرے دن بغیر ختم کئے نہ چھوڑی۔

ایک روز یہ واقعہ بیان کیا کہ علامہ نولڈکی ہشتادسالہ سالگرہ پراسکے شاگردون اور اور مداحوں نے اسکی یادگار میں مختلف علمی رسائل لکھکر ایک کتاب کی صورت میں طبع کرائے ۔ جو ایک ایسے فاضل کی یادگار کیلئے نہایت موزون اور عمدہ یادگار ہے اسی طرح انہوں نے یہ تجویز کی کہ ہم لوگون کو چاہئے کہ مولانا حالی کی علمی خدمات کی شکرگزاری کی یادگار میں ایک ایک رسالہ لکھیں اور خود بھی ایک رسالہ لکھنے کا وعدہ کیا اور راقم سے بھی تحریک کی اور اس کتاب کے اخراجات طبع وغیرہ کی خود ذمہ داری لی۔

جس زمانے میں تمدن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے تو اول صبح کو اٹھکر چند ورق حیات جاوید کے پڑھ لیتے تھے اور اسکے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے ۔

ایک بار حیات جاوید کے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ جو لوگ تذکیر و تانیث اور دلی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دورازکار اور فضول بحثون اور جھگڑون میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں جب ہماری زبان میں ایسی کتاب موجود ہے جو ہادی اور راہبر کا کام دے سکتی ہے تو پھر ان لاطائل بحثون میں پڑنا محض تضیع اوقات ہے زبان دلی اور لکھنؤ کی تابع نہیں ہے بلکہ خیالات کی تابع ہے جن لوگون کے خیالات رکیک ہیں انکی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی ۔

مرحوم مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو بہت پسند کرتے تھے چنانچہ تمدن عرب میں جا بجا آیات قرآنی کا ترجمہ اس ترجمہ سے لیا ہے ۔ ایک روز مولوی عبد اللہ صاحب نے جن سے مرحوم کو بہت خصوصیت تھی اور ہم کو ان سے مرحوم کے اکثر حالات معلوم ہوئے ہیں آیت استوی علی العرش پڑھی اور کہا کہ مولوی نذیر احمد نے اسکا ترجمہ یہ کیا ہے کہ عرش پر جا براجا مرحوم پھڑک اٹھے اور کہا کہ استوی کا ترجمہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔

مرحوم جب نواب وقار الامراء بہادر مرحوم کے ساتھ شملہ تشریف لے گئے تو مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ نے اپنی تالیف ارمغان دہلی کے بعض اجزا پیش کیے مرحوم نے انکی بہت تعریف کی اور سفارش کر کے پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اور انعام کیلئے خود گزارش لکھ کر سرکار میں پیش کی۔ سرکار عالی سے بعد ازان مولف کو گران قدر انعامات عطا ہوئے۔

مولوی صاحب موصوف پر ایک بار کئی ہزار روپیہ کی ڈگری ہوئی جس سے وہ بہت پریشان تھے انہون نے مرحوم کو اطلاع دی مرحوم نے کل رقم انکے پاس بھجوا دی۔

مرحوم بہت با مروت تھے۔ اگر کوئی شخص اُن سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اُسے پوری نہ کرسکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اسکی شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اسکی مقصد برآری میں کوشش کرتے یہان تک کہ کتابیں جو انہیں بہت عزیز تھیں انکے دینے میں بھی تامل نہ تھا بشرطیکہ وہ سچا قدر دان ہو۔ خاص کر طالب علمون اور اہل علم کا بہت خیال کرتے تھے چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خان، مرحوم کے یہان مدعو تھے بارہ ۱۲ بجے کھانے کے بعد سے چار ۴ بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ مرحوم نے ان کی درخواست پر تحفۃً کامل مبرد کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستر ۷۰ روپیہ ہے مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم جو خود کتابون کا شوقین ہے اہل علم کی درخواست رد نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ سنہ ۱۳۲۲ھ مین جب سرسید مرحوم آخر بار حیدرآباد تشریف لائے اور بشیر باغ میں سرکار عالی کے مہمان رہ کر فروکش ہوئے۔ تو چونکہ مرحوم

کو اپنے کتب خانہ کی نادر کتب کے دکھانے کا شوق تھا، سر سید کو اپنے مکان پر لے گئے اور کتابیں دکھانا شروع کیں منجملہ دیگر کتب ایک بیش بہا کتاب ایسی تھی کہ اس میں اول سے آخر تک اسپین کی اسلامی عمارات کے نقشے اور بہت عمدہ تصویریں تھیں سر سید مرحوم نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ کالج کی لائبریری میں رکھی جائے تاکہ مسلمان اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ مرحوم نے کہا بیشک اسی قابل ہے اور چلتے وقت وہ نسخہ سر سید کی گاڑی میں رکھ دیا۔

مرحوم نے رد المنطق لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کروا کر مولوی شبلی کے نذر کی تھی انگلستان بھیج کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے آپ وہ نسخہ بھجوا دیجئے۔ مولانا اپنی عادت کی موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپکے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لئے آپ طلب کرتے ہیں مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا جواب دیا کہ پانسو روپیہ کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھیجوا دیں۔ چنانچہ اسکے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالی کی درخواست پر دار العلوم کے نصاب تعلیم کے ترتیب کرنے کیلئے حیدرآباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے مارے مرحوم سے ملے نہیں لیکن کتب خانہ کے جلسہ انتظامی میں اتفاق سے جب ملے بطیب خاطر ہوگئے تو مرحوم اسی خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا۔

جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو انکی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ انکا مہمان ہو۔ چنانچہ مولانا شبلی جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے مرحوم کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً

آپہونچے اور اپنے گھر لیگئے۔ لیکن جب مولنا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اٹھ گئے تو مرحوم
کو بہت رنج ہوا اور یہ رنج انکے خطوط سے صاف مترشح ہوتا ہے۔

مرحوم اپنے دوستوں کو مدد دینے اور انکے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور
اور اس میں وہ کسی رکاوٹ یا مشکل کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات حیرت
انگیز کام کرجاتے تھے۔ چنانچہ منجملہ دیگر واقعات کے ہم ایک واقعہ کا یہاں ذکر کرتے
ہیں۔ مرحوم کے والد مولوی سید زین الدین خان صاحب کی عمر کا اکثر حصہ پٹنہ میں صرف
ہوا تھا، اور مولوی خدابخش خان صاحب کے مرحوم سے بہت تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ
کا ذکر ہے کہ مولوی خدابخش خان صاحب مرحوم کسی مقدمہ میں وکیل ہوکر حیدرآباد تشریف
لائے اور دیرینہ تعلقات کی وجہ سے مرحوم ہی کے مکان پر ٹھہرے۔ انھیں ایام میں
ایکبار انھوں نے مرحوم سے یہ خواہش ظاہر کی کہ برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا وکیل ہوں
اگر آپ کی سعی سے سرکار عالی مجھے وکالت درجۂ اول کی سند عطا کردے تو میں آپکا بہت
ممنون ہوں گا۔ مرحوم نے نہایت خوشی سے اس میں مقدور بھر کوشش کرنے کا وعدہ
کیا۔ دوسرے ہی روز وہ میر افضل جنگ صاحب مرحوم میر مجلس عدالت العالیہ (چیف جسٹس ہائیکورٹ)
کے یہاں پہونچے اور بہت منت اور لجاجت سے اظہار مطلب کیا اور کہا کہ مولوی صاحب
ہمارے والد کے دوست اور ہمارے بزرگ ہیں۔ اگر آپ کی عنایت سے انکا یہ کام
نکل جائے، جو کوئی بڑی بات نہیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ مگر میر صاحب مرحوم نے کچھ ایسا
غیر متوقع اور دل شکن جواب دیا کہ اسکے بعد مرحوم نے مولوی خدابخش خان کا ان سے
تعارف کرانا بھی پسند نہ کیا اور بغیر ملائے ساتھ واپس لے گئے۔ جب راستے میں تمام واقعہ
مولوی صاحب سے بیان کیا تو مولوی صاحب مرحوم کو بے انتہا رنج اور مایوسی ہوئی مرحوم نے

کہا آپ دل شکستہ اور مایوس نہوں، اگر میر افضل حسین صاحب نے سند نہیں دی تو کچھ مضائقہ
نہیں، انشاءاللہ اب ہم کوشش کرینگے کہ آپ خود میر مجلس ہوجائیں اور دوسروں کو سندیں
عطا کریں۔ چنانچہ مرحوم نے جان توڑ کے کوشش کی اور آخر مولوی خدابخش خان صاحب کو
میر مجلس کرا کے رہے۔

مرحوم کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی علمی کام یا تجارت کیلئے روپیہ
طلب کرتا تو وہ حتی الامکان بڑی خوشی سے اسکی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد کے
ایک صحاف نے ان سے آکر کہا کہ مجھے آپ کوئی کتاب جلد باندھنے کیلئے دیجئے
مرحوم نے ایک کتاب دی اور کہا اگر تم عمدہ جلد باندھو گے تو ہم تمھیں اور کام دینگے
جب وہ جلد باندھ کے لے گیا تو مرحوم نے بہت پسند فرمائی اور اسکے کام کی تعریف
کی۔ صحاف نے کہا سرکار یہ کیا کام ہے افسوس سامان نہیں، اگر میرے پاس سامان ہوتا
تو پھر آپ میرا کام دیکھتے۔ مرحوم نے فوراً اسے دو ہزار روپیہ کا سامان ضروری مشینیں
منگوادیں۔ مطبع شمسی (حیدرآباد) بھی اسی قبیل سے ہے اور مرحوم کے فیض کی یادگار ہے۔
کبھی کبھی وہ طالب علموں کی بھی اسی طرح مدد کرتے رہتے تھے۔

مرحوم اگرچہ شیعہ خاندان سے اور شیعہ والدین کی اولاد تھے اور اسی سے شیعہ بھی
کہے جاتے تھے، لیکن وہ تعصب سے بالکل بری تھے اور شیعہ سنی کی تفریق کو بہت برا خیال
کرتے تھے۔ مالک مرحوم کا کتب خانہ نہایت وسیع تھا، عجیب بات ہے کہ اس میں
مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔

چنانچہ جب مرحوم کتب خانہ دیکھنے کیلئے رامپور گئے تو نواب صاحب رامپور سے
بھی کتب خانہ کے متعلق ذکر آیا۔ نواب صاحب نے کسی قدر فخر سے فرمایا کہ ہم نے دو

کام کیا جو ہمارے اجداد نے نہیں کیا تھا یعنی اس کتاب خانے میں سنی مذہب کی کتابیں تو جمع تھیں ہی لیکن ہم نے مذہب شیعہ کی کتب بھی جمع کی ہیں خصوصاً ملا محمد باقر مجلسی کی بحار الانوار کی پچیس جلدیں جو حال ہی میں طہران میں طبع ہوئی ہیں ہم نے منگائی ہیں"۔ مرحوم نے فرمایا کہ شیعوں کی مذہبی کتب محض بیکار ہیں اور ہرگز قابل استدلال نہیں۔ جب بخاری و مسلم جیسی کتابیں جنکے متعلق بے انتہا چھان بین کی گئی ہے استقام و اغلاط سے بری نہیں ہیں تو ملا باقر کی کتاب کس شمار میں ہے" نواب صاحب نے فرمایا کہ اور کچھ نہیں تو اتنا تو ضرور ہے کہ اہل بیت نبوی کے فضائل جو سنیوں نے خصوصاً بخاری و مسلم کے جامعین نے قلم انداز کر دئیے ہیں وہ اس میں درج ہیں۔ مرحوم نے کہا یہ بھی ایک مہمل بات ہے نبی روحانی و اخلاقی اصلاح کیلئے مبعوث ہوا تھا نہ کہ اپنے اہل بیت کے محامد بیان کرنے کیلئے۔ ایک معمولی تمیز دار شریف آدمی بھی اپنے اہل بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کو خلاف آداب سمجھتا ہے، نبی کا درجہ اس سے بہت ارفع تھا ان سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا خلاف قیاس ہے"۔

ایک روز مرحوم نے فرمایا کہ کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی جو پڑھا لکھا اور عالم شخص تھا میں نے پوچھا "تم حضرت عمرؓ سے کیوں عداوت رکھتے ہو؟ ایرانی عالم نے جواب دیا کہ "ہم حضرت علیؓ کی پیروی کرتے ہیں"۔ اس پر میں نے کہا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی جیسا کہ آپ لوگوں کا خیال ہے تو وہ اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کبھی نہ کرتے۔ ایرانی نے تعجب سے پوچھا "اس واقعہ کی تصدیق کی آپ پاس کیا دلیل ہے؟" مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے فوراً تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو

شیعہ مذہب کا عالم ہے لاکر دکھائی۔ یہ کتاب یورپ میں طبع ہوئی ہے اور تیرہ کے دیباچہ میں مصنف کے شیعہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے۔ ایرانی عالم اس کتاب اور واقعہ کو دیکھکر تائب ہو گیا اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی حضرت عمر کو برا نہ کہونگا اور تعجب کیا کہ ہمارے لوگ ان باتوں کو کیوں چھپاتے ہیں۔

قیام طلبۂ حیدرآباد میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، ایک روز راقم، مولوی عبداللہ خان صاحب اور ظہیر الدین فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے شیعہ مولوی تشریف لائے۔ مرحوم نے عبداللہ خان سے کہا کہ ذرا یعقوبی کی تاریخ جلد دوم تو اندر سے لیکر آؤ۔ جب وہ کتاب لیکر آئے تو انھوں نے پوچھا کہ آپ اسمیں کیا ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں، تو مرحوم نے انکے ہاتھ سے کتاب لیکر ایک مقام پر سے پڑھکر سنانی شروع کی۔ یہ وہی مقام تھا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس کے بعد شیعہ عالم سے مخاطب ہوکر کہا کہ دو آج کئی روز سے ہم میں اور ہماری بیوی میں بحث ہو رہی ہے، وہ میری اس بات کو قبول نہیں کرتیں کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے ہوا اور اسقدر مہر مقرر ہوا تھا، اور ان سے ایک بیٹا مسمی زید پیدا ہوا تھا۔" اسپر حاضرین جلسہ میں سے ایک صاحب نے کہا کہ علمائے شیعہ اس واقعہ کے منکر نہیں ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جبر و اکراہ کا نکاح تھا۔ مرحوم نے نہایت تعجب سے کہا کہ "یہ خیال نہایت جاہلانہ اور ذلیل ہے دنیا میں کوئی ایسی طاقت تھی کہ وہ فاطمہ کی لڑکی کو علی سے چھین سکے یا اس سے زبردستی نکاح کر سکے؟" آخر مولوی صاحب خفیف سے ہو گئے۔ وہ گئے اور کچھ عجب نہیں کہ

ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ خلفائے اربعہ کے مناقشات

اور خانگی جھگڑوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے مرحوم نے فرمایا کہ خلفائے اربعہ میں
کوئی ذاتی عداوت یا دشمنی تو تھی نہیں اگر تھی تو اتنی جتنی ہم میں اور مولوی عزیز مرزا صاحب
میں ۔ مثلاً اگر کوئی جگہ خالی ہو اور اسکے لئے مولوی عزیز مرزا بھی کوشش کریں اور ہم بھی تو
اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دونوں میں دشمنی یا عناد ہے ۔ اگر اس مقام یا موجودہ ملازمت
سے قطع تعلق کرنے کے بعد دوسری جگہ چلے جائیں تو ہم لوگوں میں کوئی دشمنی نہ ہوگی ،
اور اپنے حق کے لئے کوشش کرنا کوئی دشمنی کی بات نہیں ہے ۔

شیعہ سنی کے جھگڑے کے متعلق انکی یہ رائے تھی کہ یہ پولیٹکل جھگڑا ہے ۔
انکے پاس ایک عالم جرمن کی کتاب بھی تھی جس میں اسپر خوب بحث کی ہے
مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کردیں لیکن افسوس کہ یہ خیال
عمل میں نہ آیا ۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک معزز ممبر نے انھیں لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ
آپکا نام اب کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے تجویز کروں اور مجھے قوی امید ہے
کہ سب ممبر اسے خوشی خوشی قبول کریں گے ۔ آپ کے انتخاب کے لئے تین بڑے
وجوہ ہیں ۔ اول آپ شیعہ ہیں دوسرے عالم ہیں ۔ تیسرے صاحب مال و جاہ
ہیں ۔ مرحوم نے جواب میں لکھا کہ جو وجوہ آپ نے میرے انتخاب کے لئے لکھے
ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ۔ اسلئے کہ آپ کا فرمانا ہے کہ میں عالم ہوں یہ غلط ہے میری
حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے ۔ دوسرے یہ کہ میں مالدار ہوں یہ بھی
صحیح نہیں ہاں اتنا ہے کہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں ۔ تیسرے یہ کہ میں شیعہ ہوں یہ صحیح ہے
لیکن میں سلسلہ مہری کا شیعہ ہوں اس سے آگے بڑھنے کی میں نے ذرا بھی کوشش

نہیں کی ہے۔ علاوہ اسکے میں اس قسم کی کانفرنسوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جبکہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔ اور اسی لئے میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پریسیڈنٹ ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔"

ایک دن شمس العلما مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے کیوں عداوت ہے۔ حالانکہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی اُن سے دشمنی ہوتی حضرت شیخ عبدالقادر رح جیلانی نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیونکر فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادر رح کی نذر و نیاز کرتی ہے لیٹے بیٹھے انکا نام لیتی ہے۔ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے۔ اگر اسی طرح آپ کی آدھی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔"

مذکورۂ بالا واقعات سے مرحوم کے مذہبی خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے زیادہ تصریح کی حاجت نہیں۔

مرحوم صحیح بخاری کے بڑے مداح اور قدردان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ہدایہ کے بھی وہ بہت ثناخوان تھے اور جس قدر مختلف نسخے انکے پاس بکنے آتے وہ خوشی خوشی انھیں خریدتے تھے حالانکہ متعدد نسخے موجود تھے۔

اگرچہ مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت حمیت قومی اُن میں ضرور تھی اور اسلام و بانیٔ اسلام پر دل سے یقین کرتے تھے مگر

مولویون کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتون سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ قیام انگلستان میں وہ اکثر ہندوستانی اور دیگر بلاد عثمانی کے طلبہ اور مقیم اصحاب کی دعوتین کرتے رہتے تھے۔ ایک بار انھون نے کنگ ایڈورڈ ہفتم کے باڈی گارڈ کو دعوت دینے کا خیال کیا اور بذریعہ ٹیلیفون اُن سے دریافت کیا۔ اُنکے افسر نے نہایت خوشی کے ساتھ دعوت قبول کی اور کہا کہ یہ تو ہمارے لیئے بڑی عزت وفخر کی بات ہے کہ عالم سید نے ہماری دعوت کی ہے۔ دعوت کے دو گھنٹے پہلے اس افسر نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے پوچھا کہ اگر آپ اجازت دین تو مولوی صاحب کو جو ہمارے ساتھ ہیں لیتے آئین کیونکہ ہم لوگ جاہل ہیں آپ سے کیا باتیں کرینگے۔ مرحوم نے فرمایا کہ آپ ایک نہیں بلکہ جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے ان مسلمانون سے تعارف پیدا کرانے کے لئے ترکی اور ایرانی قونصلوں کو بھی دعوت دی اور اس بے تکلفی کی وجہ سے کسی انگریز کو دعوت میں نہ بلایا۔ شام کے وقت جب سب لوگ کھانے کی میز پر آئے تو باڈی گارڈ والون کے مولوی صاحب نے جو غالباً پنجابی تھے کہا کہ کھانے سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ کے پاس گوشت کہان سے آیا ہے مرحوم نے پوچھا کہ اس سے آپ کا کیا مقصد ہے۔ مولوی صاحب نے کہا لندن میں کہیں حلال گوشت نہیں ملتا، سب حرام ہوتا ہے اسلئے میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے ذبح نہ کرون گا کبھی گوشت نہ کھاؤن گا مرحوم نے غصّے سے تلخ لہجے میں جواب دیا کہ افسوس آپ جاہل ہیں اور دین اسلام سے بالکل بے خبر اور ناواقف ہیں۔ ایک مسلمان کے دستر خوان پر آپ کو اس قسم کے فاسد خیالات وشبہات

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کیا آپ کو لا تجسسوا کا قول یاد نہین ہے؟ کیا آپ
کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمر جب غیر قومون کے ساتھ معاہدہ کرتے تھے تو منجملہ
اور شرایط کے ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ جو مسلمان وہان وارد ہو اسکی تین
دن تک دعوت کرین۔ کیا ان مسلمان مسافرون کے لئے مسلمان ذبح کرتے
تھے یا مسلمان باورچی ہوتے تھے؟ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے کہ جبتک
کسی شئے کے حرام ہونے کا علم نہ ہو اُسے حلال سمجھنا چاہیئے؟ چونکہ یہ گفتگو مرحوم
نے کسی قدر تلخ اور درشت لہجے میں کی تھی اور سوائے ہندوستانیون کے دوسرے
اسے سمجھ نہیں سکتے تھے اسلئے باقی لوگ حیرت سے مرحوم کا مُنھ تک رہے
تھے۔ آخر ترکی قونصل نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ مرحوم نے سارا قصہ دہرایا
اور کہا کہ یہ ہندوستان کے مسلمانون کا نمونہ ہے اس سے آپ انکی اخلاقی
حالت کا اندازہ کر لیجئے۔ یہان یورپینون نے اول ہی میرا دم ناک مین کر رکھا
ہے، کوئی پوچھتا ہے "تمہارے مذہب مین پردہ کیون ہے؟" کوئی کہتا ہے "
تمھارے پیغمبر نے تعدد ازدواجات کی اجازت کیون دی ہے؟" کوئی سوال
کرتا ہے "تمھارے نبی نے عورتون کے مارنے کا کیون حکم دیا ہے"؟ ان
اعتراضات اور سوالات کا جواب دیتے دیتے ہم تنگ آگئے ہین اور پھر
جب یہ مولوی صاحب اور انکے ہم خیال یہان کی سوسائیٹی مین رہکر اس
قسم کی رکیک باتین کرتے ہیں تو مسلمانون کے متعلق غیر قومون کے خیالات
کیا ہو نگے۔ ایسے شخص کے زہریلے خیالات کا اثر تمام قوم اور ملک پر
پڑتا ہے۔ ترکی قونصل نے کہا اگر واقعی ہندوستان کے مسلمانون کی یہ

حالت ہے تو نہایت قابل افسوس ہے۔ جب اہل فوج کو یہ معلوم ہوا کہ اُنکے
مولوی صاحب نے سید صاحب کی دل آزاری کی ہے اور انھیں رنج پہونچا یا ہے
تو اِن سب نے بالاتفاق مولوی صاحب سے یہ کہا کہ وہ سید صاحب کے قدمون پر
گرین اور معافی مانگین ورنہ ہم اپنی جماعت سے خارج کر دینگے۔ چنانچہ مولوی
صاحب نے اُٹھ کر معافی مانگی اور مرحوم نے خندہ پیشانی سے معاف کر دیا اور
جب رخصت ہونے لگے تو مولوی صاحب کو گلے لگایا اور اُلٹی معافی مانگی اور
سو روپیہ کا چک انکی نذر کیا اور یہ نصیحت کی کہ ایسے شخصی اور ذاتی خیالات سے
ملک و قوم بدنام ہوتے ہیں آیندہ کبھی کسی سوسائیٹی میں ایسی گفتگو نہ فرمائیے گا
ورنہ تمام ہندوستان کے مسلمان غیر قومون کی نظرون مین ذلیل ہو جائین گے۔
مرحوم ہندوستان کے مروجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز اُن لوگون کو
وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد زوجات کے حامی تھے۔

پارسی قوم کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ قوم پچاس سال میں فنا ہو جائے گی
کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔
مرحوم کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں جبکہ وہ تمدن ہند
کا ترجمہ کر رہے تھے انھون نے اپنے ایک دوست کو وہ باب سُنانا شروع کیا
جسمیں دراوڑی قوم کا (جو ہندوستان کی ایک قدیم وحشی قوم تھی) ذکر تھا۔ جب
مرحوم پڑھنا ختم کر چکے تو اُس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟
اتفاق سے اسوقت ایک مولوی صاحب جو مرحوم سے ملنے کے لئے آئے تھے
پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارہ سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں۔

مولوی محمد سورتی نے جو عربی زبان کے مستند عالم اور قدیم کتب کے شوقین ہیں مرحوم سے ایک کتاب بغرض نقل مستعار طلب کی، کتاب تھی نادر، مرحوم کو دینے میں تامل تھا مگر مروت کے مارے صاف صاف انکار بھی نہ کر سکتے تھے۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیدی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بیشک نہایت عمدہ ہے مگر اسکی جلد سؤر کے چمڑے کی ہے مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً لاحول ولا قوۃ کہکر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے مجاوروں نے موٹی اسامی سمجھ کر آگھیرا، مرحوم نے جب یہ دیکھا تو کہا بھئی مجھے کیوں گھیرے ہوئے ہو میں تو وہابی ہوں یہ کہنا تھا کہ سب چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

مرحوم بزمانہ طالب علمی نیز بعد ازاں پنشن لینے کے بعد انگلستان میں کئی سال مقیم رہے اور انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائیٹی میں جانے اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر باوجود اسکے کہ وہ انگریزی سوسائیٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور انکے آداب و تکلفات کو مہمل سمجھتے تھے وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حب جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے اور اسے صرف روپیہ کمانا اور اسکا صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دوسرے کی بات کی پرواہ نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

زندگی کے آخر زمانے میں مرحوم کو بعض وجوہ سے حیدرآباد دکن کا قیام ترک کرنا پڑا۔ اس وقت انھیں اسکا رنج بہت تھا۔ کیونکہ یہاں انکے

مکانات تھے، کتب خانہ تھا، بیوی بچے سب یہیں تھے اور دو بیٹیوں کی ملازمت کا سلسلہ بھی یہیں ہو گیا تھا۔ دوسرے عمر کا بہترین حصہ یہیں کٹا تھا اور دنیا کے نشیب و فراز اور ادبار و اقبال کے تماشے یہیں دیکھے تھے۔ لہذا اسکی محبت وطن کی محبت سے کم نہ تھی۔ لیکن جب یہاں سے جا کر انھوں نے حیدرآباد میں قیام کیا جہاں انھوں نے ایک بڑا مکان اپنے رہنے کے لئے خرید لیا تھا اور پھر وہاں سے مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں آنے جانے لگے اور قوم کی خدمت میں وقت صرف ہونے لگا تو اس وقت آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وقت اب آیا ہے، اس سے پہلے عمر عزیز بیکار بکھیڑوں اور تفریح میں گزری، زندگی کا لطف اب آئے گا تھوڑے ہی عرصہ بعد یونیورسٹی کا مسئلہ چھڑ گیا۔ جسمیں انھوں نے بڑے شوق اور جوش سے کام شروع کیا اور یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب بھی انہیں کے تفویض ہوئی جسکے لئے وہ خاص طور پر موزون تھے۔ اسمیں انھوں نے بڑی محنت کی اور قابل قدر کام کیا۔ آخر وہ وقت جو اگرچہ معین نہیں ہے مگر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا آ گیا اور بے وقت اجل سر پر آن پہونچی اور دفعتہ حیدرآباد میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے تاریخ ... سنہ ۱۹۱۵ء انتقال ہو گیا۔ اور قوم کا ایک برگزیدہ فرد اٹھ گیا۔

مرحوم علاوہ عالم و فاضل ہونے کے متعدد زبانوں کے ماہر تھے اور افسوس کہ اب قوم میں کوئی شخص ان کا جانشین نہیں ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ مرحوم پر حب دولت و جاہ غالب تھی لیکن جب روپیہ انکے

پاس آتا تو اسکے دینے میں بھی وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک اور چلتے پرزے ہوتے یا اشاعت شہرت میں مدد دیتے تھے۔ مرحوم علما اور طالب علموں کی قدر کرتے تھے اور خواہ اُنکی دنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہوں اُن سے بڑی مروت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نکرتے تھے۔ اُنکی صحبت سے خوش ہوتے تھے اور اسلئے اکثر اُنکے ہاں علمی تذکرے اور چرچے رہتے تھے۔ اُنکی مہمان نوازی دیکھ کر عربوں کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہند اور غیر ممالک کے سیاح اور علما کے لیے اُنکا عالیشان مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ حق میزبانی ادا کرتے تھے۔ جب جائے اُنکے مکان پر کوئی نہ کوئی ہندی، انگریز، فرانسیسی، جاپانی، امریکن، ترکی یا مصری سیاح یا عالم نظر آتا تھا۔ دوسروں کی بھلائی اور مقصد برآری کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بے کسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے۔ نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دستگیری کرنا فرض ہے چنانچہ ایک زمانے میں محکمۂ تعمیرات و معدنیات و ریلوے میں سب کے سب یوروپین، یوریشین اور دیسی عیسائی تھے مسلمان اکا دُکا نظر آتے تھے لیکن جب مرحوم کا تقرر اس عہدے پر ہوا تو مسلمان رفتہ رفتہ داخل ہونے شروع ہوئے اور اب معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مرحوم کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی

چنانچہ جب وہ حیدرآباد سے وظیفہ لیکر انگلستان گئے تو وہ بھی اُنکے شریک سفر تھیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی مرحوم کے ہاں مہمان تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اسکا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ اُلٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی، مگر ایک بات کا آپکو میرا شکرگزار ہونا چاہئیے آپکو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اُسے تنہا چھوڑکر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خودغرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حُبِ جاہ میں بعض ایسی باتیں کرگزرتے تھے جو انکی شان کے شایان نہوتی تھیں۔ خفا ہو جانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہو جاتے تھے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ اُن میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔ مرحوم اگر اپنے فضل و کمال سے کام لیتے تو وہ بہت بڑے آدمی ہوتے، لیکن افسوس کہ حیدرآباد کی گوناگوں دلفریبیوں اور تجربوں نے اُنکے وقت عزیز کا بہت سا بیش قیمت حصہ غصب کرلیا اور جاہ طلبی کے جھگڑوں نے وہ الجھاؤ پیدا کیا کہ اس قدر اطمینان نصیب نہوا کہ وہ علمی مشاغل میں اطمینان کے ساتھ مصروفیت رکھتے جسکے وہ ہر طرح موزوں اور اہل تھے۔ انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اُسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جنکے لئے وہ دن رات سرگرداں و حیراں رہا، وہ آرزوئیں جنکی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہوگیا اور وہ کوششیں جنکے لئے اس نے اپنی جان تک کھپا دی پانی کے بلبلے سے زیادہ ناپائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں۔

اور کچھ انھیں کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور
جو شاید محض ضمنی طور پر کئے گئے تھے ۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے ۔
بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تکمیل بھی کرے ۔ پایۂ کمال کو
بھی پہنچے اور پھر ایسے کام کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلق خدا کو ان سے
فائدہ پہونچے ۔ وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان
وقت پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور قدر اس وقت ہوتی ہے جبکہ وقت ہاتھ
سے نکل جاتا ہے ۔ انسان دنیا میں نہیں رہتا مگر اسکے اعمال رہجاتے ہیں
لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو ۔ جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے
جاتے ہوں اور جو لوگوں کے دلوں پر نقش رکھتے ہوں ۔ مرحوم نے زمانۂ
ملازمت اور اپنی عمر میں بہت سے کام کئے لیکن اکثر ایسے ہیں جیسے ہوا کا
جھونکا کہ آیا اور گیا ۔ لیکن یادگار دنیا میں وہی رہیں گے جن کا اثر دوسروں
کے قلب اور دماغوں تک پہنچے گا ۔ یہ انکی بعض تحریریں ہیں جو انکے
قلم سے نکلیں ملک میں پھیلیں اور سورج کی روشنی کی طرح سے ایک سرے
سے دوسرے سرے تک حیات عالم میں اپنا مفید کام کرتی رہیں گی اور
مرحوم کی یاد کو انکے قدر دانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی ۔

۳

تمدن ہند

یہ مرحوم کی آخری کتاب ہے اور یہ بھی تمدن عرب کے مشہور مصنف
موسیو لیبان کی تصنیف ہے ۔ مرحوم نے ان دو ایسی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے کہ

انکا نام بہت عرصہ تک یاد رہیگا۔ کیونکہ یہ دونوں کتابیں اہل ملک کے لئے مفید اور دلچسپ ہیں۔ عربی تمدن کو جس طرح اشاعت اسلام کی وجہ سے خاص وسعت حاصل ہوگئی ہے، اسی طرح ہندی تمدن اپنی قدامت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ تمدن کی نشو و نما میں ہزاروں مختلف اثرات کام کرتے ہیں جن کا سراغ لگانا امکان سے باہر ہے لیکن ایک ظاہری اور بڑا سبب خود ملک اور اسکی آب و ہوا ہے۔ ہندوستان بلا مبالغہ خلاصہ عالم ہے۔ کیا ہے جو یہاں نہیں ہے، اور کونسی اسکی ایسی ادا اور دلکشی ہے کہ جس کی دنیا بھر دل دادہ و شیدائی نہیں۔ سر بہ سر بفلک پہاڑ کھڑے پہرہ دے رہے ہیں، قدموں کے نیچے بحر زخار موجیں مار رہا ہے، ملک کے ایک حصے میں اسقدر گنجان آبادی ہے کہ تل رکھنے کو جگہ نہیں دوسرے حصے میں لق و دق بیابان پڑے ہیں، آب و ہوا کو دیکھیئے تو ایک طرف وہ کڑکڑاتے جاڑے پڑے ہیں کہ دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں۔ اور لہو بدن میں جم جاتا ہے، اور دوسری طرف وہ قیامت کی گرمی ہے کہ لہو پسینہ ہوکر بہ جائے، اور پھر بعض مقامات پر وہ اعتدال ہے کہ انسان بھولے سے بھی جنت کی ہوس نہ کرے۔ تہذیب کا یہ عالم ہے کہ ایک جگہ کمال تمدن کی وہ انتہا نظر آتی ہے کہ دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب و تمدن کی آنکھیں نیچی ہو جائیں، اور دوسری جگہ وہ وحشی اقوام آباد ہیں کہ جنھیں دیکھکر حضرت آدم اور انکی اولاد کی طرز معاشرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ مال و دولت اور زر و جواہر کی یہ حالت ہے کہ ابتدا سے ابتک بڑے بڑے تاجداران عالم کی للچائی ہوئی نظریں اس پر

تمدن ہند کی تاریخ گویا تین ہزار سال کی تاریخ ہے اور اسے کئی قرنون میں تقسیم کیا گیا ہے۔
قرن اول یعنی رگ وید کا زمانہ۔ اسمیں آریون کے زور و قوت اور جنگ و فتح کا آغاز ہے جسمیں وہ ملکیون سے لڑائی بھڑائی میں مصروف رہے۔ یہ لوگ بعد کے ہندوؤن سے بالکل مختلف تھے جو گیان دھیان اور فلسفہ و الٰہیات میں مگن رہتے تھے۔ اسوقت کا علمی کام صرف رگ وید کے ۱۰۱۷ گیت ہیں جو اگرچہ مذہبی ہیں مگر اُن سے ابتدائی زندگی کی حالت مترشح ہوتی ہے اور دنیا کے ابتدائی فلسفہ کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ یہ گویا پندرہ سو سال قبل مسیح کا زمانہ ہے۔
قرن دوم۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ وہ ستلج تک پہونچے اور گنگا جمنا تک بڑھے۔ اسمین انھون نے اپنے فتوحات کی تکمیل کی اور ملک کے اصلی باشندون کو بالکل مغلوب و محکوم کرلیا۔ اسی زمانہ میں وید تصنیف ہوئے اور کورو اور پانچالون کی جنگ ہوئی۔ یہ زمانہ پندرہ سو قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح تک ہے۔
قرن سوم۔ اسمین آریون نے اپنے فتوحات کو اور وسیع کیا۔ یہ زمانہ جنگی اور علمی کارنامون سے ممتاز ہے۔ فلسفہ کا خاص کر زور ہوا اور ایک ایسی تحریک کا آغاز ہوا جو دنیا میں ابتک عالمگیر ہے یعنی بدھ مذہب کی بنیاد پڑی۔ اس زمانہ کو ایک ہزار سال قبل مسیح سے تین سو بیس قبل مسیح تک سمجھنا چاہیئے۔
قرن چہارم۔ یہ مذہب بدھ کا زمانہ ہے۔ اسمیں بدھ حکومت اور بدھ مذہب کا زور و شور رہا۔ علوم و فنون کو رونق ہوئی۔ شاعری، طب،

صرف ونحو، قانون، نجوم، فلسفہ وغیرہ کی تالیف وتصنیف کا بازار گرم ہوا اور ہندو تمدن جنوبی ہند وسیلون وغیرہ میں پھیلا۔ یہ زمانہ ۳۲۰ قبل مسیح سے ۵۰۰ سن عیسوی تک شمار کیا جا سکتا ہے۔

قرن پنجم۔ جدید برہمنی مذہب پھر ابھرتا ہے اور بدھ مذہب کو مغلوب کر لیتا ہے۔ یہ پولٹیکل اور علمی کارناموں کا زمانہ ہے جو ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ سن عیسوی تک رہا یعنے محمود غزنوی کے حملے تک۔

قرن ششم۔ مسلمانوں کا عہد

قرن ہفتم۔ یورپی عہد۔

ہند کے قدیم تمدن پر اگر ابتدا سے غور کیا جائے تو تحقیق ہو سکتا ہے کہ انسانی تمدن کیونکر بنتا، بڑھتا، نشوونما پاتا اور پھلتا پھولتا ہے۔ اول اول جب آریا خانہ بدوش گلہ بانوں کی طرح ملک میں داخل ہوئے اور پھر آخر میں رفتہ رفتہ سارے ملک میں چھا گئے اور انکی معاشرت، نظام سیاست، علم وفضل، اور قوت وعظمت کو عروج وکمال حاصل ہوا جب اول سے آخر تک یہ تمام قرون اپنی مختلف نیرنگیوں کے ساتھ ہماری نظر سے گزرتے ہیں تو سب سے پہلے قدیم خیالات، معتقدات اور توہمات کا دور خاکہ آتا ہے کہ انپر غور کیا جائے تو انکی دہند میں واقعات کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ انسان جب تمدن کی اول سیڑھی پر قدم رکھنے کو ہوتا ہے تو اسکی کیا حالت اور حیثیت ہوتی ہے اور آئندہ مدارج کیونکر طے کرتا ہے۔

ہمیں اس زمانہ کی حالت ویدوں سے کیا معلوم ہوتی ہے؟ آریہ

جب شمالی ہند میں داخل ہوئے تو انھیں اپنے پیشرو تورانیون اور یہان کے اصلی وحشی باشندون سے مقابلہ کرنا پڑا اور مدت تک اسی جنگ وجدل میں بسر ہوئی آخر رفتہ رفتہ دشمن پسپا ہوئے اور آریاؤن کا قبضہ شمالی ملک پر ہوگیا۔ انکی حالت اسوقت ویسی ہی تھی جیسی ایک جنگ جو فاتح قوم کی ہوتی ہے۔ فاتح وید کی سوکتون میں اپنی فتح ونصرت کے گیت گاتے، حصول دولت وثروت اور پامالی دشمن کی دعائین مانگتے ہیں۔ اسوقت نہ مندر تھے نہ بت۔ اور سوائے آریاؤن اور اصلی باشندون کے کوئی ذات پات کا امتیاز نہ تھا۔ وہ آگ، پانی، آسمان اور سورج سے التجائین کرتے اور انکے بھجن گاتے ہیں ایک ایسی قوم کے لئے جو دنیا میں اول اول میدان تمدن میں قدم رکھ رہی ہے یہ بات کوئی خلاف عقل یا خلاف فطرت نہیں ہے۔ مثلاً جب وہ آندھیون سے التجا کرتے ہیں کہ تم تھم جاؤ یا آسمان سے گڑ گڑا کر یہ کہتے ہیں کہ مینھ برساؤ یا سورج سے درخواست کرتے ہیں کہ نکل اور چمک تو یہ ایسی باتین ہیں جواب بھی بعض سادہ لوح فرقون میں پائی جاتی ہیں، البتہ یہ ضرور ہے ہندوستان میں آکر جب انھون نے قدرت کے عظیم الشان مظاہر دیکھے تو وہ اُنکے آگے پرستش کیلئے جُھک گئے جو ایک امر فطرتی ہے۔

یہان ویدی زمانے کے دیوتاؤن کے متعلق مختصر سا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیا آریہ اس وقت خدا کو مانتے تھے؟ اُنکا خدا ایک تھا یا کئی؟۔ رگ وید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا مفہوم اُنکے

ہاں نہیں ہے۔ وہ متعدد دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ان دیوتاؤں کی تین قسمتیں کی جاسکتی ہیں (۱) اکاش کے دیوتا۔ (۲) پرتھوی یعنی زمین کے دیوتا (۳) پانی کے دیوتا۔ اور ان میں ہر ایک کے گیارہ گیارہ تھے گویا کل ۳۳ دیوتا ہوئے اور بعضوں نے ۳۳ سے تین ہزار تین سو تینتیس تک پہونچا دئے ہیں۔ بعض انہیں سے سودمندی اور فائدہ کے خیال سے دیوتا مانے گئے اور بعض خوف اور ڈر کی وجہ سے۔ مثلاً ازرہئے رگ وید اگنی (آگ) برق سے آئی اور دو لکڑیوں کی رگڑ سے پیدا ہوئی۔ آگ کا دریافت کرنا ابتدائے تمدن کے لئے نہایت ضروری ہے اور یہ ترقی کا ممد و معین ہے لوگ بجائے کچی چیزیں کھانے کے پکا کے کھانا شروع کرتے ہیں، اسکی مدد سے وہ رات کو بھی کام کر سکتے ہیں، جاڑوں میں وہ انھیں اکڑ کر مرجانے سے بچاتی ہے اور جو سورج اور صبح صادق میں نظر آتی ہے اور زمین و آسمان کو روشن کرتی ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی شے کو جو آسمان سے زمین پر آتی اور انسان کے اتنے کام آتی ہے دیوتا نہ سمجھیں۔ آندھی اور رعد و برق خوف کی وجہ سے دیوتا مانے گئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے بڑا دیوتا اندر ہے جو نیلے آسمان کا دیوتا، بادلوں کا جمع کرنے والا، مینھ کا برسانے والا، گرج کا کڑکانے والا، تاریکی کا مٹانے والا اور روشنی کا لانے والا اور قوت، حیات اور تازگی بخشنے والا ہے۔ لیکن ان سب کے پیچھے ایک خیال ہے جو حیات سے پرے ہے اور جسکا نام مذہب ہے۔

ویدی زمانہ زیادہ تر اسلئے قابل مطالعہ ہے کہ یہاں ہمیں زبان و خیالات کی پہلی صورت، مذہب و توہمات و رسوم کی بنیاد اولین فلسفیانہ خیالات کی ابتدائی جھلک اور خاندانی، دینی اور سیاسی زندگی کی سعی نخستین نظر آتی ہے۔ لیکن ان سب کی بنیاد مذہب پر ہے جو فطرت کی سب سے پہلی تعبیر ہے۔ اور مذہب کی نشو نما کی ابتدائی حالت جیسی یہاں معلوم ہوتی ہے وہ کسی دوسرے ملک کے لٹریچر میں نظر نہیں آتی۔ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے ہاں یہ مفقود ہے۔ جو لوگ انسان کے ابتدائی حالات و خیالات کی تحقیق کے لئے وحشی اقوام کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں رگ وید کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

ایک سوال اسکے متعلق تحقیق طلب ہے اور وہ یہ کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رگ وید کا زمانہ ۱۵۰۰ برس قبل مسیح یعنی اب سے تین ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا تھا تو کیا آریا اسوقت فن تحریر سے واقف تھے؟ اگر نہیں تھے تو یہ کب معرض تحریر میں آیا اور نیز تحریر کا رواج آریاؤں میں کب سے شروع ہوا؟ اسمیں کچھ شک نہیں کہ آریا لوگ اسوقت فن تحریر سے بالکل ناآشنا تھے اور چوتھی صدی قبل مسیح سے اول ہندوستان میں تحریر کا کہیں پتا نہیں ملتا۔ ہندوستان بھر میں کہیں کوئی کتبہ ایسا نہیں پایا گیا۔ جو تیسری صدی قبل مسیح کے وسط سے قبل کا ہو۔ سب سے قدیم کتبے زمانہ بدھ کے ہیں جو راجہ اشوک کے عہد میں نصب کئے گئے تھے یہ راجہ سلوقس کا ہمعصر تھا اور اسکا سفیر راجہ کے دربار میں کئی سال تک رہا۔ اس راجہ نے اپنی وسیع سلطنت میں مختلف مقامات پر کتبے نصب کرائے اور اسکی حکومت کا

زمانہ ۲۵۹ - ۲۲۲ (ق م) تک تھا۔ ان کتبوں کی نسبت یہ بات دلچسپی سے خالی نہوگی کہ یہ دو قسم کے ابجدوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایک تو سیدھی طرف سے بائیں جانب کو جیسے فارسی عربی لکھی جاتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ابجد شامی ہے اور ہندی ابجد وہیں سے ماخوذ ہے۔ اور دوسری بائیں جانب سے داہنی جانب کو جیسے ہندی یا انگریزی وغیرہ مگر یہ بھی شامی ابجد سے حاصل کی گئی ہے مگر ائے حسب ضرورت اپنے طور پر بنا لیا گیا ہے یہ دوسری قسم کی ابجد تمام ہندی ابجدوں کا ماخذ ہوئی۔ اس سے پورے طور پر یہ ثابت ہے کہ فن تحریر کتبوں تک میں تیسری صدی (ق م) سے قبل استعمال نہیں ہوا تھا۔ میگھاستینیز (سفیر سلوقس) صحیح لکھا ہے کہ ہندی لکھنا نہیں جانتے اور اُنکے قانون تحریر میں نہیں آئے۔ سلہ

جب یہ ثابت ہے کہ چوتھی صدی (ق م) سے پہلے فن تحریر کا رواج ہندوستان میں نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ وید سینہ بہ سینہ چلے آئے اور قریباً تین ہزار سال تک حافظہ میں محفوظ رہے کیونکہ سب سے قدیم نسخہ رگ وید کا ۱۵۰۰ء کا ہے۔ اہل یورپ کے لئے شاید یہ امر باعث حیرت و تعجب ہو مگر ہم ایشیائیوں کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسوقت ہندوؤں میں وید اور مسلمانوں میں قرآن حفظ کیا جاتا ہے اور مطبوعہ نسخوں سے نہیں بلکہ اُن اساتذہ سے جنھوں نے سلسلہ بہ سلسلہ اپنے اساتذہ سے اسی طرح حفظ کیا تھا۔

چونکہ یہ بات مصنف تمدن ہند سے رہ گئی تھی لہذا یہاں اسکا لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ایک دوسری بات کا بیان کردینا

سلہ انڈیا، پروفیسر میکس مولر۔

جو اس واقعہ سے مستنبط ہوتی ہے فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہوگا۔ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ قدیم سے قدیم کتبہ اشوک نواسہ چندر گپت کے عہد کا ہے؟ اسکی حکومت ۲۵۹ - ۲۲۲ قبل مسیح تک رہی۔ لیکن اِن کتبون کی زبان کیا ہے؟ کیا وہ ویدی سنسکرت ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا وہ برہمنون اور سوترون کی مابعد کی سنسکرت ہے؟ بالکل نہیں۔ بلکہ یہ کتبے مقامی بولیون مین لکھے ہوئے ہیں جو اُسوقت ہندوستان مین بولی جاتی تھین اور وہ نحوی سنسکرت سے بالکل مغائر ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ (۱) قدیم ویدی سنسکرت تیسری صدی (ق م) سے قبل ہی رخصت ہو چکی تھی (۲) مابعد کی علمی و نحوی سنسکرت کا رواج اُٹھ چکا تھا اور لوگ اسلئے بولنے اور سمجھنے سے قاصر تھے۔ غرض یہ کہ سنسکرت بدھ کے مبعوث ہونے سے قبل اس ملک کی زبان نہیں رہی تھی۔ اور اسلئے قدیم ویدی سنسکرت کا شباب بدھ مذہب کی پیدائش سے کہین پہلے ہو چکا تھا۔ بدھ غالبًا سنسکرت جانتا ہوگا لیکن شاگردون کو سخت تاکید تھی کہ وہ اسکی تعلیم کی تلقین لوگون کو ملک کی عام زبان مین کرین تاکہ وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکین۔

ویدی زمانہ کے بعد ایک دوسرے زمانہ کا آغاز ہوا جسکے خاص اور امتیازی کارنامے یہ تھے۔

(۱) جنگ و جدل اور فتوحات۔

(۲) برہمنون کی قوت اور ذات کا زور۔

(۳) معاشرتی اور علمی ترقی۔

(۴) اپنشد یعنی روحانی تعلیم۔

اس زمانہ مین آریہ ستلج کو عبور کرکے گنگا جمنا کے دوآبہ اور گنگا ئی میدانوں میں آئے، انھون نے اصلی باشندون سے ایک مدت تک لڑائی بھڑائی کرکے انھین نکال باہر کر دیا یا غلام بنالیا اور اس زرخیز خطے میں بخوبی آباد ہو گئے۔ اسمین شک نہیں کہ انھین اس زمانہ میں جنگ وجدل کرکے اپنی فتوحات کو وسیع کرنا پڑا۔ لیکن جب وہ یہان کے باشندون کو مغلوب کرچکے، ملک فتح کرلیا اور آبادیان قائم کرکے انھین "ہندوا" چکے تو انھون نے معاشرت و تمدن کی طرف توجہ کی دنیا میں کون سا ملک اور کون سی قوم ہے جو بغیر جنگ جدل اور بغیر تلوار اٹھائے اس منزل تک پہونچی ہو۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے مخالفون پر غالب آچکے تھے لیکن ابھی تک ان میں جنگجوئی کا جوش باقی تھا جو باہمی مخاصمتون میں بھڑک اٹھتا۔ چنانچہ مہابھارت اور راماین کے جنگ نامے اس زمانے کی یادگار ہیں۔ اگرچہ یہ کتابین مبالغہ سے مملو اور دوراز کار باتون سے بھری ہوئی ہیں تاہم اس زمانہ کی معاشرت کا ضرور پتہ لگتا ہے۔ راماین تاریخی لحاظ سے بالکل ہیچ و پوچ ہے۔ رام اور سیتا وغیرہ خیالی ہیرو ہیں اگرچہ حسن نظم و بیان نے انھین واقعی اشخاص قرار دیا ہے اور ہندوستان میں سب ہندو مرد عورت انھین سچ مچ کے تاریخی اشخاص سمجھتے ہیں اور کتاب کے اخلاقی نتیجہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ کتاب مہابھارت کے بعد کے زمانے کی ہے مگر عام طور پر اسے قدیم زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ غرض یہ زمانہ دیکھا جائے تو برہمنون کا زمانہ ہے۔ نظم و نسق سلطنت، جنگ و صلح، معاشرت و مذہب، علوم و فنون ہر شے میں برہمن پیش پیش ہیں اور ہر جگہ انھیں کا زور ہے۔

اس عہد میں ہندوؤں نے بہ نسبت ویدی زمانہ کے ہر شعبہ میں بہت کچھ ترقی کی
بادشاہی ٹھاٹھ، عیش و عشرت کے سامان، معقول عمارتیں ہر طرف نظر آنے
لگین اور انتظام مملکت، عدالت، زراعت، فن جنگ، قانون، صرف و نحو، منطق، فلسفہ،
ہندسہ، نجوم، مختلف پیشوں اور علم ادب کے بعض شعبوں میں نمایاں ترقی ہوگئی۔
اس زمانے کے کارناموں میں اپنشد کی تصنیف ہے جو ایک قسم کا فلسفہ یا تصوف
ہے اور جو اُس زمانے کی عام روش سے بالکل نرالی چیز ہے جس پر آیندہ فلسفہ
مذہب یا تصوف کی بنیاد قائم ہوئی۔ اپنشد بہت سے ہیں اور مختلف علماء کی
تصنیف سے ہیں۔ اسکی تعلیم کا اصل اصول ایک عالم گیر روح ہے جو سب میں
ساری ہے اسمیں اور توحید میں فرق ہے، توحید میں خالق اور مخلوق الگ
الگ ہیں مگر اپنشد کی تعلیم میں خدا ایک عالمگیر ذات ہے، باقی سب اسی سے
ہے یا اُسکا جزو ہے اور اسمیں مل جائیگا اور اس سے علحدہ ہستی نہیں رکھتا۔
اُسے مذہب ہمہ اوست سمجھنا چاہیئے۔ یہی اصول ہندو فلسفہ کی جان ہے جو
آگے چل کر نشو ونما پاتا اور یوگ اور ویدانت میں نئے اور لطیف پہلوؤں سے
ظاہر ہوتا ہے۔ اسکے بعد دوسرا اصول تناسخ کا مسئلہ ہے۔ جو اس وقت کے
بعد سے ہندو فلسفہ اور مذہب کا رکن رکین ہوگیا۔

لیکن اس زمانے کا امتیازی مسئلہ ذات ہے۔ ذات کا امتیاز دنیا میں
ہر جگہ تھا اور اب بھی پایا جاتا ہے خصوصاً تاریخ روم میں یہ فرق نمایاں طور
پر معلوم ہوتا ہے۔ وہاں کھانے پینے اور شادی بیاہ کے معاملے میں امراء
عوام میں وہی سدِ سکندری حائل تھی جسے ہم ہندوؤں میں ذات کہتے ہیں

اور کیا اب یورپ میں وہی امتیاز اور فرق نہیں ہے ؟ مگر بات اتنی ہے کہ وہاں یہ امتیاز بدلتا رہتا ہے اور ایک حالت پر قائم نہیں رہتا کیونکہ اسکا دارمدار سوشل حالت پر ہے مگر ہندی ذات کا مدار مذہب پر ہے اور اسلئے وہ اٹل اور قائم رہنے والی ہے ۔ اسمین شک نہیں کہ امارت وغربت، شرافت و رذالت کے امتیازات ہر جگہ تھے اور ہیں مگر یہ آتے اور جاتے ہیں اور پرچھائین کی طرح بدلتے رہتے ہیں، یہانتک کہ غلامی سی شے جس کی جڑین مشرق سے مغرب تک دنیا کے تمام مختلف تمدنون میں پھیلی ہوئی تھین اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ پتال تک پہونچ گئی ہیں آخر دنیا سے اٹھ گئی، مگر نہ اٹھی تو یہ ذات کی غلامی ۔ درحقیقت ہندوون کے تمدن پر یہ ایسا بُرا دھبا ہے کہ گو یہ ملک ہزار ترقی کر جائے مگر یہ نظرون میں ہمیشہ کھٹکتا رہے گا ۔ بدھ مذہب اور اسلام نے مساوات اور اخوت کا ڈنکا بجایا، ذات سے بہت کچھ بیزاری ظاہر کی اور اگرچہ انکا قیام صدیون تک رہا مگر کچھ نہ ہوسکا اور ذرا ظہور اصلاح ہوئی بھی تو وہ برائے نام اور عارضی تھی ۔ یہ سچ ہے کہ ذات کے امتیاز سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ کم سے کم آریاؤن (برہمنون) کی نسل مخلوط نہیں ہوئی لیکن جس حالت میں کہ نیچ ذات والے رکھے گئے ہیں اور جس تنفر اور حقارت کا برتاؤ ان سے کیا جاتا ہے وہ نہایت شرمناک ہے ۔ نیچ قوم یادگار ہے فاتح کے جبر اور مفتوح کی مظلومی کی ۔ غلامی ہر جگہ سے اٹھ گئی مگر یہ غلامی جو سب سے قدیم ہے، مذہب کے پردے میں اب تک باقی ہے ۔ علاوہ ذات کی الجھن کے ایک بڑی مصیبت اس زمانہ میں یہ تھی کہ برہمنون کا زور

تمدن کے ہر شعبہ میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ جس طرح کھڑے پانی پر کائی اور درخت پر کاس بیل چھا جاتی ہے اسی طرح برہمن بھی بے طرح تمام ہندو دان اور انکے نظامات پر چھائے ہوئے تھے۔ اور خاص کر مذہب میں تو وہ افرا تفری مچا رکھی تھی کہ خدا کی پناہ۔ مختلف عبادتوں نئی نئی قسم کی پرستشوں، طرح طرح کے چڑھاووں، منتوں اور اعمال کا ایک ایسا مسلسل تار بندھا ہوا تھا کہ اس سے چھٹکارا پانا ایسا ہی محال تھا جیسے مکڑی کے جالے سے غریب مکھی کا۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کسی وقت بیجان رسوم اور اکتا دینے والے اعمال سے فرصت نہ تھی۔ گویا یہی مذہب تھا یہی عبادت تھی اور یہی معاشرت اور اسکا حاصل اور یہی راہ نجات تھی۔ اور طرہ یہ کہ دن بدن یہ زنجیریں اور کڑی ہوتی جاتی تھیں اور انھیں وہ نزاکتیں اور باریکیاں پیدا کی جاتی تھیں کہ یہ نام کا مذہب وبال جان ہو گیا تھا۔ ان بیجا اور حوصلہ شکن قیود اور جکڑبند کی شدت سے لوگ عاجز آگئے اور صبر وتحمل کا پیالہ لبریز ہو گیا اور سختی اس انتہا کو پہونچ گئی جبکہ زنجیریں خود بخود ٹوٹنے لگتی ہیں۔ آخر وہ وقت آیا کہ اس طوفان بے تمیزی میں تزلزل پیدا ہوا جابروں کے حواس پراگندہ ہوئے اور قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کٹ کے گرنے لگیں۔ اور وہ دھند جو ملک پر چھائی ہوئی تھی آفتاب صداقت کے طلوع ہوتے ہی کافور ہو گئی۔ بعثت بدھ علیہ السلام نے ایک نئی روح پھونک دی اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس سر زمین پر اس رحمت باران کا نزول ہوا جس کا یہاں چپا چپا اور ذرہ ذرہ تشنہ لب تھا۔ اس نے

مردہ دلوں کو شگفتہ کر دیا، مایوسوں کو آس دی، امیر و غریب، برہمن سودر، سب کو
ایک نظر سے دیکھا، مساوات اور اخوت کی صلائے عام دی اور یہی اسکی کامیابی
کا بڑا راز تھا۔ جو لوگ برہمنوں کے سخت شکنجے میں نیم جان ہو رہے تھے انکی جان
میں جان آگئی، ذات پات کا امتیاز اٹھ گیا، ویدوں کے دیوتا اور برہمنوں کے
مہمل اعمال اور بے معنی ریاضتیں بالائے طاق رکھ دیں۔ اسکی عام ہمدردی،
ذاتی نیکی اور نیکی کی تلقین نے سب کو برابر کر دیا اور بڑے بھلے چھوٹے بڑے
سب اسکی طرف جھک گئے۔ اسکی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی ایک مصیبت
ہے اور زندگی اور اس کی لذات کی خواہش اس مصیبت کا باعث ہیں۔ اس
خواہش کا مٹانا مصیبت کا کم کرنا ہے اور یہ خواہش پاک زندگی سے مٹ سکتی
ہے۔ ہمیشہ صداقت، نیکی، ہمدردی، مہربانی اور خیر پر قائم رہنا چاہیئے۔ اور بُرے
جذبات اور نفسانی لذات پر غالب آنا چاہیئے۔ غرض تزکیہ نفس اس تعلیم کا
بڑا اصول ہے۔ اس دنیا میں پاک اور نیک زندگی بسر کرکے بلحاظ سزا و جزا
تزکیہ نفس حاصل کرنا اسکا اصل مقصد ہے۔ اور یہی بے گناہ اور پاک زندگی
نروان ہے۔ دنیا میں اول بار بدھ نے یہ تعلیم دی کہ انسان بلا احتیاج
دیوتاؤں اور خدا کے اسی زندگی میں نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس
طرح اس نے انسان کا رتبہ بڑھا دیا۔

بدھ ایک طرح سے تناسخ کا قائل ہے لیکن اسکے اور برہمنوں کے
تناسخ میں فرق ہے۔ بدھ روح کا قائل نہیں اور جب روح نہیں تو تناسخ
کیسا اسکا جواب اسکے ہاں یہ ہے کہ انسان کے اعمال فنا نہیں ہو سکتے۔

جب انسان مرجاتا ہے تو اعمال کے لحاظ سے نیا وجود پیدا ہوتا ہے۔ اسکے ہاں آیندہ کی سزا و جزا کوئی چیز نہیں اور نہ اس کے ہاں جنت کا وعدہ اور جہنم کا وعید ہے۔ پاک زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اور یہی نروان یا نجات ہے۔ نیکی اپنا صلہ خود ہے اور پاک زندگی مذہب کا اعلیٰ اور آخری مقصد ہے۔ اگر زندگی میں نروان حاصل نہوا تو کرم یا اعمال کے رو سے وہ نئے جنم لے گا یہانتک کہ تزکیہ نفس کامل ہو اور نروان حاصل ہو جائے۔

تین صدی تک اس تعلیم کی تلقین ملک میں ہوتی رہی لیکن نہ تو چندرگپتا اور نہ اسکے بیٹوں نے اس مذہب کو قبول کیا مگر اسکا جانشین بندوسارا جو ۲۶۰ ق م میں گدی نشین ہوا اس مذہب کے حلقے میں آیا اور اسکا بہت بڑا حامی اور داعی ثابت ہوا، جس نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی اسکی دعوت دی۔ راجہ اشوک کا نام وزلگا سے جاپان اور سائبیریا سے سیلون تک مشہور اور عزت سے لیا جاتا ہے۔ اسکے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دعاۃ ہندوستان کے مختلف صوبوں میسور، مدراس، پنجاب، کشمیر، ٹراونکور اور انکے علاوہ سیلون، شام، مصر، مقدونیہ وغیرہ میں بھیجے۔ تو اسکی سلطنت تمام شمالی ہند میں پھیلی ہوئی تھی اور اسکے کتبے دہلی، الہ آباد، پشاور اور گجرات، اڑیسہ اور میسور میں پائے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو سیلون بھیجا اور مہندا نے وہاں کے بادشاہ اور رعایا کو بدھ مذہب سے مشرف کیا۔ یہانتک کہ یہ مذہب سیام اور جاوا میں بھی پہونچا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں بدھ مذہب کی کتابیں شہنشاہ چین کے پاس پہونچیں اور ایک

دوسرے شہنشاہ چین نے ۶۲ء مسیحی میں اور کتابیں منگوائیں اور بدھ مذہب
وہاں پھیلنا شروع ہوا یہانتک کہ چوتھی صدی مسیحی میں وہاں کا عام مذہب
ہو گیا چین سے کوریا پہونچا (۳۷۲ء) اور وہاں سے جاپان (۵۵۲ء)
اور کوچین چین، فارموسا، منگولیا میں چوتھی اور پانچویں صدی میں گیا۔ اور
کابل سے اس مذہب نے تاشقند، بلخ و بخارا تک رسائی حاصل کی۔

علاوہ بدھ کی تعلیم کے جس میں نیکی، عام ہمدردی اور تزکیہ نفس کی تلقین تھی
بدھ مذہب کی اشاعت اور ترقی کا بڑا باعث یہ خیال کیا جاتا ہے کہ راجہ
اشوک نے اس مذہب کو اختیار کر لیا جسکی وجہ سے یہ راج دھرم (یعنی
سلطنت کا مذہب) ہو گیا اور اسمیں شک نہیں کہ اس نے اسکی اشاعت
میں بڑے جوش اور شدومد سے کام لیا۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو یہی
واقعہ اسکے ضعف کا بھی باعث ہوا، کیونکہ شاہی اثر سے لوگ کثرت سے
برائے نام اسمیں داخل ہو گئے اور خصوصاً اُن صوبجات سے جو نئے نئے
سلطنت میں شریک ہوئے تھے اور جہاں ہندوؤں نے بہت کم ترقی
کی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عظیم الشان اور عالمگیر اصلاح، میں بجائے
قوت کے ضعف پیدا ہونے لگا اور قدیم خالص مذہب کا یہ ضعف نو مذہبوں
کے پسند خاطر ہوا اور رفتہ رفتہ بوجہ اس اختلاط کے بدھ مذہب اور برہمنی
مذہب میں فرق کم ہوتا گیا۔ روح کے عقیدہ میں پھر ترقی ہونے لگی اور
عام پسند رسوم اور توہمات کا رواج خود بدھوں میں بڑھتا گیا۔ اصلی خیالات کی
جگہ جدید خیالات نے لینی شروع کی، یہانتک کہ ویدی دیوتا اور چڑھاوے

وغیرہ کی رسوم بھی رخصت ہوگئیں لیکن اسکے ساتھ ہی بدھ مذہب کو بھی زوال
آگیا۔ یہ زوال ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور جلد ہی ہندو مذہب نے
پھر اپنا زور قائم کرلیا۔ چنانچہ گیارھویں صدی میں صرف کشمیر اور اڑیسہ میں
رہ گیا اور مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔ اور
اب ایک طرف صرف نیپال میں اور دوسری طرف لنکا میں پایا جاتا ہے۔
عجیب بات ہے کہ بدھ مذہب بہ نسبت اپنے جنم بھومی کے غیر ممالک میں
زیادہ پھیلا اور قائم رہا۔ افغانستان، نیپال، مشرقی ترکستان، تبت، منگولیا
منچوریا، جاپان، چین، مشرقی جزائر ہند، سیام، برما، اور سیلون سب اسکے
زیر نگیں تھے اور اب بھی دنیا کی آبادی کا ایک تہائی حصہ اسکے نام لیواؤں
میں سے ہے۔ اور اسکی خانقاہیں چین سے بحر کاسپین تک جا بجا پھیلی ہوئی ہیں
اور سلطنت روس کے حدود تک پہنچی ہوئی ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بدھ مذہب دنیا کی ایک عظیم الشان تحریک تھا اور
بہت کچھ انقلابات میں سے ہے گو اسکی بدولت ہوئی ہندوستان سے
بیس نکالا جاچکا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اسکی یادگار جین مذہب میں اب تک
باقی ہے جو تحقیق نہیں۔ مگر درحقیقت اسکی یادگار کسی خاص مذہب یا فرقہ میں
نہیں بلکہ اہل ملک کے مذہب و معاشرت اور اخلاق میں پائی جاتی ہے۔
غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہندو مذہب اور ہندوؤں پر مفصلہ ذیل خاص
اثرات اس مذہب کے ہوئے جو اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔

(۱) طبائع میں خاص نرمی، لینت اور انکسار پیدا ہوا جس کا اثر ہندوؤں

انسانوں کے باہمی تعلقات پر ہوا بلکہ بے زبان حیوانوں تک پہونچا۔

(۲) بدھ سے قبل ہندوؤں کے تمام خیالات اور علوم کا دارومدار ویدوں پر تھا لیکن بدھ کے بعد اُنکے فلسفہ اور علوم کا تعلق ویدوں سے بالکل اُٹھ گیا۔ یہاں تک کہ جدید برہمنی مذہب (پُرانی مذہب) ویدوں کا مذہب نہ تھا بلکہ ایسے دیوتاؤں اور ہیروں کی پرستش رائج ہوگئی جن کا ویدوں میں ذکر تک نہیں۔

(۳) ذات پات کا امتیاز اُٹھ جانے سے مختلف فرقوں میں میل جول بڑھ گیا اور مساوات کا خیال پیدا ہوا اگرچہ ذاتیں قائم رہیں مگر جدید برہمنی مذہب نے اسے پھر دبا دیا۔

(۴) گوشت خوری کا رواج اُٹھ گیا۔

(۵) لوگوں میں جنگ جوئی کا مادہ کم ہوگیا۔

زمانۂ بدھ کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جو ابتک اسکی یادگار کے طور پر قائم ہے۔ وہ اس زمانہ کی تعمیر اور سنگ تراشی ہے جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔ اور درحقیقت ان لوگوں نے اس فن کو پایۂ کمال تک پہونچا دیا تھا۔ اس زمانہ سے قبل پتھر صرف فصیل شہر یا پلوں وغیرہ کی تعمیر میں استعمال ہوتا تھا لیکن بدھ کے زمانہ سے بڑی بڑی عمارتوں میں کام آنے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فن تعمیر ہندی اور انکا طبع زاد ہے لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ بعض بدھی عمارتوں میں جو پنجاب میں اب دریافت ہوئی ہیں صاف طور سے یونانی فن عمارت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ بدھ مذہب نے ہندوؤں کو جہاں اور چیزیں ارشاد میں دی ہیں وہاں فن عمارت بھی ہے

بدھی اور ہندو انی عمارتوں میں فرق یہ ہے کہ بدھی پہاڑ کو کھود کر غار بناتے
اور اس میں اپنا کمال سنگ تراشی و فن تعمیر دکھاتے لیکن ہندو پتھر صاف
کر کے پہاڑ کے روبرو اپنی عمارت تیار کرتے تھے۔ یہ فرق خاص کر ایسے
مقامات پر یاد رکھنے کے قابل ہے جہاں جہاں ساتھ ساتھ اُس زمانے کی
عمارتیں موجود ہیں جبکہ بدھ مذہب برہمنی مذہب میں محو ہو چلا تھا اور بت پرستی
عام ہو گئی تھی۔

بلحاظ علوم کے اگرچہ بدھ کا زمانہ کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا لیکن
ایسا بھی نہیں کہ نا قابل توجہ ہو۔ تنجلی کے یوگ اور ویاسا کے ویدانت کا آغاز
اسی زمانے میں ہوا اگرچہ بدھ مذہب کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں منو
کا شاستر بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ لیکن بڑی چیز علمی لحاظ سے اس زمانہ کی
یہ ہے کہ علم نجوم میں معتدبہ کامیابی ہوئی اور اس کامیابی میں یونانیوں کا
بھی حصہ ہے جنھوں نے اس میں خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ ہندوؤں نے
اس فن میں اُن سے بہت کچھ اکتساب کیا۔ طب کو بھی ترقی ہوئی کیونکہ
بدھ مذہب کے اثر سے انسانوں اور حیوانوں کے لئے ملک میں جا بجا
شفا خانے قائم کئے گئے تھے۔

نیز اس زمانے میں علم کا چرچا ضرور تھا۔ ہیون سانگ مشہور چینی
سیاح نے اپنے سفرنامے میں بعض بدھ دارالعلوموں کا ذکر کیا ہے۔ "نالندہ
کی خانقاہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ایک بہت بڑا دارالعلوم تھا۔
وہ لکھتا ہے کہ یہاں کئی ہزار بھکشو (بدھ درویش) تھے جو بلحاظ علم و فضل

خاص اہتمام کئے تھے۔ لوگ انکی بہت وقعت و توقیر کرتے تھے اور یہ یوں رات بحث مباحثہ اور تکرار علمی میں مصروف رہتے تھے۔ دور دور کے علما و فضلا وہاں آکر شریک ہوتے اور نالندہ کی شرکت سے شہرت حاصل کرتے تھے۔ نالندہ کا طالب علم ہونا یا وہاں سے تعلق رکھنا باعث عزت سمجھا جاتا تھا گویا اسے وہی عزت تھی جو کبھی مسلمانوں میں قرطبہ و بغداد یا فرانس میں کلونی اور کلرو کو حاصل تھی۔ یا جیسے آج کل علی گڑھ کالج کے طلبا کو حاصل ہے۔

وہ مذہب جو اخلاق و خیالات کی اصلاح کے لئے آیا تھا اور جس نے انسان کا رتبہ دیوتاؤں سے بڑھا دیا تھا اور جس نے اپنی پاک تعلیم کے سامنے جہل مذہبی رسوم اور دیوتاؤں بلکہ روح و خدا تک کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا آخر وہ برہمنی توہمات اور باطل پرستی کا ایسا شکار ہوا کہ بت پرستی خود اسکا شعار ہوگئی، بدھ دیوتا مانا گیا اور دوسرے بتوں کی طرح اسکی بھی پرستش ہونے لگی اور رفتہ رفتہ برہمنی مذہب نے اسے اس ملک سے ایسا ناپید کیا جیسے یہ کہیں کہ کسی شئے کا بیج مارا گیا۔ برہمنی مذہب کو پھر عروج ہوا اور اس عروج کے ساتھ اس نے اپنے قیود کی جکڑ بند کو اور سخت کر دیا۔ اس جدید برہمنی دور کو پرانوں کا عہد اور پرانوں کا مذہب سمجھنا چاہیئے۔ ویدی اور پرانی مذہب میں بڑا فرق یہ تھا کہ ویدی مذہب میں تو اُسے فطرت مثلاً اندر، اگنی، سوریا، ورونا وغیرہ کی پرستش تھی اور پرانی مذہب میں یہ دیوتا ہو گئے اور برہما، وشنو اور شو کی پرستش کا رواج ہوا۔ بڑی خصوصیت اس جدید عہد کی بتوں کی پوجا ہے۔ قدیم سے دیوتاؤں کے چڑھاوئے آگ پر چڑھائے جاتے تھے لیکن

بدھ مذہب کے بعد سے یہ چڑھاوے بتوں کے سامنے پیش ہونے لگے اور اس بت پرستی میں طرح طرح کی رسوم اور سیکڑوں قسم کے باطل عقاید اور توہمات کو زور ہوگیا۔ یہ تغیر بہت برا ہوا۔ بتوں کی پرستش انسان کے دل پر کبھی پاک اثر پیدا نہیں کرتی اور اس وجہ سے بہت سی خرابیاں اور برائیاں ہندوؤں میں پیدا ہوگئیں البتہ تخیلات اور توہمات غالب آگئے اور بت پرستی نے شان و شوکت اور رسوم و اہم کی رسمیں بڑھا دیں اور اس ضمن میں سنگ تراشی، شاعری، موسیقی اور فن تعمیر اور ظاہری رسوم اور ظاہری عبادت اور اندھا دھند تقلید نے ترقی پائی۔ اور ذات کا امتیاز اور مختلف فرقوں کا نفاق درجۂ کمال کو پہونچ گیا۔ ذات نے برہمنوں کی قوت اور وقعت کو بیشک بڑھا دیا لیکن باقی تمام پیشہ وروں اور دستکاروں کو ذلیل اور کمین بنا دیا۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ طبیبوں، سناروں، لوہاروں، جولاہوں، رنگ سازوں، اسلحہ سازوں اور عطاروں کا شمار چماروں اور رنڈیوں کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ اس سے قوم میں نفاق اور منافرت پیدا ہوگئی، برہمنوں کے عروج کے لئے ساری قوم کو ذلیل ہونا پڑا۔

لیکن اسکے ساتھ ہی یہ زمانہ بھی عظمت سے خالی نہیں۔ گویا یہ قدیم زمانے کا آخری دور تھا۔ بکرماجیت اور اسکے نورتن اسی زمانے کی مشہور یادگاریں ہیں، جسکی شان و شوکت کی داستانیں اب تک ملک میں مشہور ہیں۔ راجپوت بھی اول بار میدان تمدن میں اسی زمانے میں نظر آتے ہیں۔ منو کا مشہور شاستر بھی اسی دور کی تصنیف ہے اور اس زمانے کی معاشر

ورسوم اور مذہب کے سمجھنے کے لئے بڑی کارآمد ہے۔ کالیداس اور بھوابھو
جو ہندوستان کے سب سے بڑے مشہور شاعر اور ڈرامانویس گزرے ہیں
اسی زمانے میں پیدا ہوئے اور ایک دنیا اب تک انکے کمال کی عزت
کرتی ہے۔ شاعری اور ڈراما اس زمانہ کا اصلی حسن تھا۔ اسکے علاوہ فن نجوم
وطبابت میں بھی ترقی ہوئی۔ اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ کچھ اوپر
دو ہزار سال پہلے اسکندر اعظم کے لشکر میں ہندو طبیب موجود تھے اور گیارہ
صدی بعد ہارون الرشید کے دربار میں بھی دو ہندو طبیب منکا اور صالا
نظر آتے ہیں۔

فاضل ابوریحان بیرونی جو محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان آیا
اور یہاں رہ کر اس نے ہندوؤں کے حالات وعلوم کا بڑے غور سے
مطالعہ کیا اُس نے اس بحث پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے جسکے دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی میں ہندو زوال کی حالت میں تھے۔ مذہب
برہمنوں کی ملک تھی عوام جہالت و باطل توہمات میں مبتلا تھے۔ علوم و
سائنس کا چرچا گھٹتا جاتا تھا اور جو چند لوگ جاننے والے تھے وہ بتانے میں
بڑا بخل کرتے تھے مگر باوجود اسکے اپنے ملک اور قوم پر بڑا فخر و ناز تھا
دوسرے ممالک اور اقوام کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے اور یہ سمجھتے
تھے کہ ملک ہے تو انکا۔ قوم ہے تو انکی اور علوم و فنون ہیں تو انکے اور باقی
سب ہیچ اور مہمل ہے۔ ذلت اور غلامی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ دیسیوں
(مثلاً دستکاروں وغیرہ) کا شمار سودروں میں ہونے لگا تھا۔ اور

مذہبی تعلیم حاصل کرنے سے محروم کر دیے گئے تھے اور بجائے علوم و فنون کے مہمل روایات اور مہمل قصے کہانیاں رائج ہو گئیں تھیں۔ پولیٹیکل قوت میں بھی ضعف پیدا ہو گیا تھا اور ذات کی قیود نے ان کو اس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

ہندوستان پر اس وقت ہر طرف انحطاط و زوال چھایا ہوا تھا اور آفتاب تمدن لب بام تھا کہ جھٹ پٹے کے وقت ایک جدید عہد کا آغاز ہوا۔ مغرب کی تاریکی میں قدیم راہ سے ایک غیر قوم نے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور کچھ ہی سارے ملک پر مسلط ہو گئی۔

یہ مسلمانوں کی قوم تھی جو اول سندھ میں پہنچی اور بعد ازاں افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ اور کئی صدی تک اس ملک پر حکمران رہی۔

اس سے پیشتر آریا اور برہمنی تمدن پر اندر اور باہر سے مختلف اور متعدد حملے ہو چکے تھے۔

۱۔ ایرانیوں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں اس ملک پر حملہ کیا۔

۲۔ یونانیوں نے چوتھی صدی قبل مسیح میں یورش کی۔

۳۔ اس کے بعد اہل باختر کے حملے تیسری یا پانچویں صدی تک ہوئے۔

۴۔ پانچویں صدی تمام میں بدھ مذہب کا بڑا حملہ برہمنی مذہب اور تمدن پر ہوا۔

۵۔ غیر آریا اقوام ہند اور نیچ اقوام کے حملے خصوصاً غیر آریا سلطنتوں کی طرف سے ساتویں اور آٹھویں صدی میں۔

۶۔ ادنیٰ اعتقادات اور وحشیانہ رسوم کی برہمنی مذہب سے کشمکش جس پر سے شنکراچاریہ کی تعلیم سے آٹھویں نویں صدی میں فلسفی فرقہ

شوکی بنا پڑی اور اس مذہب سے بگڑ مضلحون کے ذریعہ بارہ سے سولھوین صدی تک نشوونما ہوئی۔

۷۔ مسلمانوں کے حملے گیارھوین صدی سے اٹھارھوین صدی تک۔

۸۔ انگریزی عہد۔

لیکن نہ یونانی اسکا کچھ کرسکے نہ ایرانی، نہ بدھ مذہب قائم رہا نہ غیر آریا اقوام کا اثر۔ یہاں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس نے آریا قوم ان تمام مخالف اثرات پر غالب آئی اور باوجودیکہ اسکی اکثر ہمعصر اور ہم سر قومیں دنیا سے مٹ گئیں لیکن وہ اب تک قائم ہے اور نہ صرف قائم ہے بلکہ اس میں پھر بڑھنے اور عروج کرنے کے آثار موجود ہیں۔ اہل بابل و اسیریا کا تمدن کہاں گیا؟ اہل فینشیا اور انکی تہذیب و تجارت کدھر گئی؟ مصریوں کا مشہور آفاق تمدن کیا ہوئی؟ ایرانیون کی شان و شوکت کہاں ہے؟ یونانیون کی عالمگیر عظمت کا نام رہگیا مگر وہ عظمت والے ناپید ہوگئے۔ روما کی شوکت و جلالت کے افسانے صرف تاریخوں میں رہ گئے مگر خود وہ ایسے مٹے کہ پھر دیسے جانشین نصیب نہوے۔ لیکن ہندو اب بھی کم و بیش اپنی تمدن و تہذیب کے ساتھ باقی ہیں اور اقوام عالم میں بڑھنے کا دم خم رکھتے ہیں۔ آخر اسکے وجوہ کیا ہیں؟ میرے خیال میں اسکے بڑے اسباب یہ ہوسکتے ہیں۔

۱۔ ہندو رشیوں کی روحانی اور علمی ریاضت۔

۲۔ ان کا منضبط نظام تمدن۔

۳۔ ان کی روا داری۔

۴۔ ان کی عورتوں کی وفاداری اور جاں نثاری۔

انھیں خوبیوں کے اثر نے انھیں ابھی تک دنیا میں باقی رکھا ہے اور اگر انھوں نے انکے زندہ رکھنے کی کوشش کی تو وہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلامی عہد سے قبل جس نے اس پر تسلط کیا اور ایسا اثر ڈالنا چاہا وہ یا تو خود مٹ گیا یا اس میں ضم ہو کر فنا ہو گیا۔ رہے انگریز سو انھوں نے سرے سے ایسا ڈھنگ ڈالا ہے کہ وہ ہندیوں کی سوسائیٹی سے ایسے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ جیسے کوئی امراض متعدی سے۔ نیز فاتح کا غرور مفتوح کے میل جول کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اس لئے نہ وہ ہم میں مل سکتے ہیں اور نہ وہ یہاں رہ سکتے ہیں، ان میں ہم میں ایک نہیں کئی سمندر حائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انکے تمدن اور تعلیم کا اثر ہم پر ضرور پڑے گا اور پڑ رہا ہے لیکن ہم میں ان میں حقیقی اتحاد اور میل جول پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ وہ چاہتے نہیں اور افتاد ایسی آکے پڑی ہے کہ ہم بھی اسکے کچھ ایسے خواہاں نہیں۔ اور اگر کبھی انھوں نے اس کا خیال کیا بھی تو انکی ہستی بھی اسی طرح مٹ جائیگی جیسی بعض اور قوموں کی جو یہاں آکر بسیں اور اگر رہے بھی تو انہیں ہندوستان کی سب سے ذلیل قوم بن کر رہنا پڑیگا۔ اس زمانے کے حکیم شاعر نے ہندوستان کو "غارت گر اقوام و اکال الامم" کا بہت صحیح خطاب دیا ہے۔ اسکی حالت ایک سمندر کی سی ہے۔ مختلف دریا اس میں آ آکے گرتے رہے، اور اپنی ہستی فنا کر کے اسی میں مل جاتے ہیں۔ الا مسلمانوں کے،

جو اگرچہ فاتح کی حیثیت سے آئے مگر بھائیوں کی طرح گھل مل کے رہے اور باوجود صدیوں کے قیام، کثرت اختلاط اور بے تکلف میل جول کے ان دونوں قوموں میں اب تک گنگا جمنی شان نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ ہندوستان کے مسلمان ایک حد تک "ہندو اگئے" ہیں مگر اپنی قومی حیثیت اور قومی شان کو اب تک لیئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں مختلف قسم کے تمدن آئے مگر کسی کا اثر باقی نہ رہا اور رہا تو اس طرح کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ مگر مسلمانوں کے تمدن کے آثار نمایاں طور پر باقی رہیں گے اور اہل ہند پر اس کا ایسا گہرا اثر ہے کہ زمانہ اسے مٹا نہیں سکتا۔ ہم یہاں نہایت سرسری طور سے چند اثرات کا نام لیتے ہیں۔

(۱) مسلمانوں نے ہندوؤں کے مذہب وخیالات پر بڑا اثر ڈالا خصوصاً خالص توحید کا اثر سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

(۲) کھانے پینے رہنے سہنے اور دوسرے عام معاشرتی طریقوں میں ترقی دی۔

(۳) بیہودہ رسوم اور توہمات کا زور کم کیا۔

(۴) فن عمارت کو خاص طور پر ترقی دی۔

(۵) فن جنگ میں بھی خاص ترقی ہوئی اور توپ اور بارود کو رواج دیا۔

(۶) بعض علوم مثلاً علم النجوم۔ طبابت اور خاص کر تاریخ و جغرافیہ کا ذوق پیدا کیا۔

(۷) نئے نئے پھل پھول لائے باغبانی اور فلاحت کو بڑھایا اور عام ذوق میں اصلاح کی۔

(۸) اور سب سے بڑھ کر ایک نئی زبان کا بننا ہے جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یہ ایک قومی وجہ ہے کہ اردو کو اس ملک کی عام زبان ہونے کا دعویٰ ہے۔

غرض دونوں قومیں ایک دوسرے کے تمدن و معاشرت اور خیالات اور دیگر اثرات سے اس قدر متاثر ہوئی ہیں کہ اب اگر کوئی چاہے کہ ان اثرات کو مٹادے تو ناممکن ہے۔ گویا قسمت میں یہ بدا تھا کہ یہی دونوں قومیں اس ملک کی وارث ہونگی اور اسکی قسمت انہیں دونوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان کے ایکے میں اسکی بہبودی و فلاح اور ترقی و عروج ہے اور انکی پھوٹ میں اسکی ذلت و خواری اور نکبت و غلامی ہے۔ جب اٹھیں گے تو مل کر اٹھیں گے اور اگر گریں گے تو اپنی نااتفاقی کی بدولت۔ دنیا میں کوئی فرد بشر ایسا نہیں ہے جو بے عیب ہو اسی طرح کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو عیوب و نقائص سے خالی ہو مگر دنیا میں شاید ہی دو قومیں ایسی ہیں جو ایسے اوصاف اور عیوب سے متصف ہیں کہ اگر یہ اتحاد کرلیں تو ایک کے عیوب پر دوسرے کی خوبیوں سے پردہ پڑ جائے گا۔ اور ایک کے ضعف کو دوسرے کی قوت سنبھال لے گی۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندو ایک ایسی قوم ہے جس کے گزشتہ کارنامے اس عالم کی بہترین اور اعلٰے یادگاروں میں سے ہیں اور اس میں اب بھی بڑائی کے آثار اور دنیا میں ایک علی قوم بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مسلمان وہ قوم ہے جس نے اپنی عالمگیر فتوحات کے ساتھ علم و اخلاق کی روشنی دنیا میں پھیلائی اور گو اب انحطاط میں ہے مگر اب بھی اسکی سلطنتیں دنیا میں قائم ہیں اور اگر وہ عقل سے کام لے تو اس میں

اتنی سکت باقی ہے کہ وہ پھر دنیا کی نام آور قوموں میں سے ہو جائے۔ اسے خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ ان دو قوموں کا سنگم ایک ایسے ملک میں ہوا ہے جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، اگر یہ دونوں قومیں نفسانیت اور خود غرضی کو چھوڑ دیں اور تھوڑا سا جبر اور تھوڑا سا صبر اختیار کریں تو انکے اتحاد کی بدولت ایک ایسے تمدن کی بنیاد قائم ہو جائے اور یہ خود ایک ایسی قوت بن جائیں کہ اسکی نظیر نہو اور ایک دنیا اُن کے قدموں تلے ہو۔ تاریخ عالم کو چھوڑ دو، کیا صرف ہندوستان کی تاریخ اس سبق کے لئے کافی نہیں ہے، کیا صدہا اور ہزارہا سال سے وقتاً فوقتاً جو آفات و مصائب کا نزول اس بدنصیب ملک پر ہوا ہے وہ کافی شہادت اس بات کی نہیں ہے کہ نااتفاقی گناہ اور اتفاق ایک بڑی نیکی ہے؟ کیا اس سبق کے سیکھنے کے لئے ابھی اور ذلتوں مصیبتوں اور ٹھوکروں کی ضرورت ہے؟ ٹھنڈے دل سے تعصب کو برطرف کر کے اگر تاریخ کا مطالعہ کرو اور واقعات و حالات کو سوچو تو اصل راز کا خود بخود انکشاف ہو جائے گا۔ مولوی سید علی مرحوم نے درحقیقت بڑا کام کیا کہ تمدن عرب اور تمدن ہند جیسی کتابوں کا ترجمہ اُردو زبان میں کر دیا تاکہ ہم ایک دوسرے کے محاسن اور کارناموں سے واقف ہو کر ایک دوسرے کی عظمت و وقعت کریں اور اپنے عیوب و نقائص پر اطلاع پاکر اصلاح کے درپے ہوں۔ اور اصل یہ ہے کہ تمدن عرب کے بعد مولوی صاحب مرحوم کا فرض تھا کہ وہ تمدن ہند کا بھی ترجمہ کریں اور ہم خوش ہیں کہ وفات سے قبل وہ اس فرض کو انجام دیگئے۔ اس لحاظ سے اگر ہم مولوی سید علی مرحوم کا شمار فاضل ابوریحان بیرونی علامی الفضل فیاضی فیضی جیسے علما میں کریں تو کچھ زیادہ بے جا نہو گا۔

لیبان کی تمدن ہند کے علاوہ ایک اور کتاب اسی بحث پر ہندی فاضل مسٹر رومیش چندر دت مرحوم کی تصنیف سے ہے۔ یہ کتابیں دو تین سال کے تفاوت سے ایک ہی زمانہ میں لکھی گئیں۔ مسٹر دت کی کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر اور مستند ہے لیکن اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے خاندان کے حالات اپنے خاندان والوں کے لئے لکھے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ تصویر کے روشن اور تاریک رخوں کے دکھانے میں بڑی استادی سے کام لے گا۔ مسٹر دت نے تحقیق میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا لیکن چونکہ ہندوؤں کو تاریخ سے دلچسپی نہ تھی اسلئے تمدن و معاشرت کے حالات دکھانے میں قصوں اور افسانوں کی کتابوں سے مدد لینی پڑی ہے اور ظاہر ہے کہ قدیم قصوں افسانوں میں تمدنی حالات کے دکھانے میں کس قدر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ بخلاف اسکے لیبان ایک غیر شخص ہے مگر ہند اور اہل ہند کے قدیم تمدن سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اس نے جہاں محاسن دکھائے ہیں وہاں ان کے ضعف کو بھی جتا دیا ہے۔ اپنی اور غیر کی نظر میں جو فرق ہوتا ہے وہ محتاج صراحت نہیں۔ اگر کوئی ہمدرد ہمیں ہمارے نقص بتائے تو وہ درحقیقت ہمارے شکریہ کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں اپنی اصلاح میں بہت بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ اسکے لیبان نے یہاں کی مختلف اقوام کے حالات و اصل و خصائص پر بھی بحث کی ہے اور ان اقوام کے باہمی اختلاط سے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ بھی دکھائے ہیں، جو دلچسپی و فائدہ سے خالی نہیں۔ بمقابلہ مسٹر دت کے اس نے ہند کی عمارات کا حال بھی زیادہ تفصیل سے لکھا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس سے خاص دلچسپی تھی

اگرچہ ہندی تجارت کا مجمل ذکر کیا ہے لیکن ہندی جہازرانی کے متعلق ہر دو مصنفین ساکت ہیں حالانکہ جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ فن جہازرانی ہندوستان میں قدیم سے ہے۔ علاوہ جہازوں کی اُن تصویروں کے جو اجنتا اور مادورا اور پُری کے مندروں میں موجود ہیں اور عہد اندھران کے اُن سکوں کے جن پر جہاز کی تصویر بنی ہے، ہندوؤں کا جاوا اور سیلون میں آباد ہونا اور بدھ واعیوں کا جاپان اور چین جانا اور تجارتی تعلقات کا مصر، یونان و دیگر ممالک سے ہونا اور رومی اور چینی سیاحوں کا یہاں کے بندرگاہوں اور تجارت کا ذکر کرنا کافی اور قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ اہل ہند فن جہازرانی سے قدیم سے واقف تھے۔ نیز اس نے ہند کی موجودہ حالت (انگریزی عہد) سے بحث کی ہے لیکن اس ضمن میں اس نے ہندوستان کی موجودہ تعلیم اور تعلیم یافتہ اصحاب پر بڑی سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے اور موجودہ انگریزی تعلیم کو اہل ملک اور حکام ملک دونوں کے لئے خطرناک بتایا ہے۔ لیبان کی یہ رائے بعض دیگر یورپی سیاحوں اور اینگلو انڈین مصنفوں کی بھی ہے، اگرچہ اس میں کسی قدر جدت پائی جاتی ہے لیکن صاف بوئے تعصب آتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس تنقید کے وقت دو باتوں کا لحاظ نہیں رکھا ورنہ وہ ایسی سخت رائے نہ دیتا۔

اول یہ کہ ایک ایسے ملک میں جو صدہا سال سے ایک خاص نہج پر چلا آرہا ہے، اور جو اپنا خاص تمدن اور اپنے خاص علوم رکھتا ہے جب اس میں ایک جدید تمدن اور اجنبی زبان و علوم کو رواج دیا جائیگا تو ظاہر ہے کہ دلوں میں ہیجان اور دماغوں میں پراگندگی اور انتشار پیدا ہوگا اور ابتدا میں اسکے نتائج بھی اچھے پیدا نہ ہونگے۔

دوسرے لیبان نے اوس وقت کے طریقۂ تعلیم پر غور نہیں کیا ۔ تعلیمی نتائج کی خرابی زیادہ تر طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ہوتی ہے چنانچہ اس نقص کو ملک کے اہل الرائے اور خود گورنمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے اور اُسکی اصلاح پر برابر توجہ کی جا رہی ہے چنانچہ اب کچھ تو مرور زمانہ سے اور کچھ جدید اصلاح سے بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے اور ہمیں توی امید ہے کہ موجودہ تعلیم اگر صحیح طریقہ سے دی گئی تو ملک اور گورنمنٹ دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی ۔ لیبان نے ایسی ہی بعض اور خفیف غلطیاں کی ہیں جو عموماً یورپی سیاحوں سے سرزد ہو جاتی ہیں ۔ مثلاً اس نے مثل متوشی بعض دیگر یورپی سیاحوں اور مصنفوں کے بیگم کی اصل بیگم بتائی ہے ۔

غرض مصنف کے بعد ہمیں مترجم کا ممنون ہونا چاہیئے جنکی وجہ سے یہ کتاب صحیح اور فصیح اُردو میں ہم تک پہونچی اور اردو علم ادب و تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہو گیا ۔

غلط نامہ

مقدمات عبدالحق حصۂ اول

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۴	سا	ایسا
۴	۱۴	ایک بار	ایک بار یہ
۵	۱۱	کیا	کیسا
۱۰	۳	پھلایا	پھیلایا
۱۴	۴	گی	گئے
۱۶	۵	ربا	رہا
۱۸	۱۸	ریورڈ	ریورنڈ
۱۹	۱۸	کہ	سکو
۱۹	۱۹	کا	سکا
۲۴	۱۳	سول	سوال
۲۵	۱	(اجتہادی)	(اجتہاد رائی)
۲۶	۱۸	صورتوں	سورتوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۷	۱	علاوہ	باوجود
۲۹	۹	بیکمن	لیسمن
۳۲	۳	برتاؤ	برتاؤ روا
۳۳	۳	روائتیں	رعایتیں
۳۳	۱۳	کے	کے پڑھ لینے کے بعد پھر کسی بڑی سے بڑی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔
۳۴	۲	سکر	شکریہ
۳۵	۱۴	ہے	ہیں
۳۶	۱۴و۱۵	خفیہ	خفیہ پر
۳۷	۳	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۳۷	۱۴	کچھ کہ	کچھ
۳۸	۱	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۳۸	۱۸	ورمکردہ	اور مکروہ
۳۹	۱۵	کہروں	گھروں
۴۰	۲	آئرونگ واشنگٹن	واشنگٹن ارونگ
۴۰	۵	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۴۰	۱۷	کوسش	کوشش
۴۱	۵	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۴۱	۷	ان	آپ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۱	۱۲	اٹھا رکھا	اٹھا نہ رکھا
۴۳	۱۹	تحقیق و مضموں	تحقیق وہ مضمون
۴۵	۱	مضموں	مضمون کے
۴۶	۱۱	بندہ نواز	حضرت بندہ نواز رح
۴۷	۹	سنہ ۸۱ھ	سنہ ۸۰۱ھ
۴۷	۱۷	حضرت	حضرت کی عمر ایک سو پانچ سال کی تھی حضرت کی زندگی
″	″	″	کے یہ چند واقعات ہیں اس غرض سے بیان کیے ہیں
۴۸	۱۴	تقرر	تقریر
۵۳	۷	آمدہ	آمادہ
۵۴	۱۰	ببجیر	ہبجیر
۵۶	۱۹	ں میں	ان میں
۵۸	۹	تجخر	تجخیر
۵۹	۱۸	توہ ستتر	تو یہ ستتر
۶۲	۶	تو کوئی	تو نہ کوئی
۶۳	۱	دیکھیے ٹھپکار	دیکھیے کیسی پھٹکار
۶۹	۲	بھی	ہی
۷۲	۱۴	میں ...	میں بھی
۸۰	۱	... کرنے	پیدا کرنے
۸۰	۱۹	... کا تصور	قوت کا تصور

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۷	۱	قوس و قزح	قوس قزح
۸۷	۱۰	بڑی	تڑی
۸۹	۱۴	قفس	ققنس
۹۰	۵	منتھے	ٹھٹی
۹۴	۴	سکے	سکی
۹۴	۷	کہ ...	سرمیہ
۹۶	۱۱	میں	ٹاپیا
۹۷	۷	(جبرو دیمقراطیسی	(جبرو دیمقراطیسی)
۹۷	۷	(سکانشس)	(کانشس نس)
۹۹	۲	ڈنگ	ونگ
۹۹	۲	جو ..... اوسط	جو بہت سے اوسط
۹۹	۱۳	سنرجان	سرجان
۱۰۳	۸	جن کی	جس کی
۱۰۲	۱۱	کاس	گاس
۱۰۲	۱۱	ھیبو لا	نیبولا
۱۰۲	۱۱	ضبا پہ	ضبابہ
۱۰۳	۹	یہ اسرار	یہ پر اسرار
۱۰۴	۱	شکو	کے
۱۰۷	۱	سے	شے پر

۱۰۷	۴	کوئی شئے	کوئی ایسی شئے
۱۰۷	۱۱	(کانشنس)	(کانشس نس)
۱۱۱	۱۳	س	اِس
۱۱۱	۱۵	متعق	متعلق
۱۱۴	۲۱	اہم	اہم
۱۱۴	۲	کہر	گہرا
۱۱۵	۱	لاسبجزی	لابیتجزی
۱۱۵	۳	مدرکہ تو کہاں	مدرکہ کہاں
۱۱۵	۴	کانشنس ...	کانشس نس یعنے
۱۱۵	۶	ہیں	ہاں
۱۱۷	۹	ڈرامہ	ڈر
۱۱۸	۱۵	مذہب	مذاہب
۱۱۹	۳	آخر مخالفت	آخر یہ مخالفت
۱۱۹	۱۳	ناکامیوں . کا	ناکامیوں اور مایوسیوں کا
۱۲۰	۱۷	سمجھنا	سمجھتا
۱۲۱	۷	قربانی	قربان
۱۲۲	۱	پر زیادہ	پر بہت زیادہ
۱۲۳	۱۰	فیڈس	فیڈاس
۱۲۴	۹	سرچھپانے	سرچھپانے

۱۲۴	۱۳	طرف ہوتا ہے	طرف سے ہوتا ہے
۱۲۵	۵	اُس کے اصول	اُس اصول
۱۲۵	۱۵	لاتعداد	لاتعدد
۱۲۶	۴	مسائل	سائنس
۱۳۳	۱۴	بنیاد نہ ہلا سکا	بنیاد کبھی نہ ہلا سکا
۱۳۴	۵	کرتی ہے تو اور	کرتی ہے اور
۱۳۴	۶	کوئی ستارہ	کوئی نیا ستارہ
۱۳۵	۴	سلے	سنے
۱۳۸	۸	کا	کے
۱۳۹	۱۰	لے	بے
۱۴۰	۱	اعلیٰ	عالی
۱۴۱	۱۰	اور	یا
۱۴۲	۱۲	کیوں کہ یہ ظاہر ہے	کیوں کہ ظاہر ہے
۱۴۲	۱۴	سائنس وہ مذہب	سائنس و مذہب
۱۴۳	۱۵	مذہب	مذاہب
۱۴۸	۸	یا ہم	باہم
۱۴۹	۱۵	جب	جزو
۱۵۸	۲	کی ... کر لیجائے	کی گفتگو کر لیجائے
۱۶۳	۸	بڑی	بد معاش
۱۶۳	۱۴	دستی	دوستی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶۳	۱۶	ٹھرے	ٹھیرے
۱۶۴	۹	بیوں	بیسیوں
۱۶۴	۱۸	تے	ہوتے
۱۶۵	۱۵	بڑ	پڑھ کر
۱۶۵	۱۷	چلے	چلیئے
۱۶۶	۱	ہمارے	ہماری
۱۶۶	۵	وقت	اوقات
۱۶۷	۷	عدل و انصاف و انسانیت	عدل و انسانیت
۱۶۷	۱۱	ترکی فتح	ترکی کی فتح
۱۶۸	۸	علاقہ بیوستہ	علاقہ پیوستہ
۱۶۸	۸	مشاہیر یونان و رومنجملہ	مشاہیر یونان و روما بھی منجملہ
۱۶۹	۱	بہت سے طبائع	بہت طبائع
۱۷۳	۱۰	مزاج کے کٹرے ہیں ہیں	مزاج کے کٹرے ہیں۔ دنیا کے بڑے
"	"	ہیں	بڑے تاجدار اور شہنشاہ خاص کر اسکا شکار
"	"	"	ہوگئے ہیں
۱۷۵	۱۴	دست اندازی	دست درازی
۱۷۶	۱۹	ڈنڈا	ڈانڈا
۱۷۶	۱۹	مشرق۔ الاقصی	مشرق الاقصیٰ
۱۷۷	۲	کیوچو میں چین	کیوچو چین میں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۷	۴	انبیطہ	ذنبیطہ
۱۷۷	۱۴	پیدا ہو الف سکیہ	پیدا ہو دیکھو
۱۷۷	۱۵	مصوبہ ... [illegible]	شہوت ... بولاد گواہ
۱۷۸	۱۹	سرتیب الاعتقادی	سستیٔ الاعتقادی
۱۸۰	۱۶	[illegible]	[illegible]
۱۸۱	۳	ہموکی	سوگئی
۱۸۱	۱۹	بھرا	بیٹھا
۱۸۲	۸	اوس	روسی
۱۸۳	۳	عملم	حلم
۱۸۴	۱۳	گکیا	بکیسہ
۱۸۷	۱۲	بدل گئی ہو... اور	بدل گئی ہو۔ لوں میں جنگ اور امنگوں
//	//	//	میں ابتیج پیدا ہو گئی ہے اور
۱۸۸	۹	تدبیر	تشہیر
۱۸۹	۷	عزت	غیرت
۱۹۰	۵	حالات پر بھی	حالات پر
۱۹۰	۹	تفاسیں	تفتیش
۱۹۱	۱۵	اولی	اوّل
۱۹۲	۱	جی	دل
۱۹۳	۹	پرزور	زوردار

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۲	۹	کون	کونسا
۱۹۳	۱	تانے بانے کیطرح جکڑے ہوئے	تانے بانے کیطرح ایسے جکڑے ہوئے
۱۹۴	۳	نوازش کرنا	نوازش کرنی
۱۹۴	۴	اس نظام چھپا رہا ہے	اس میں پنہاں ہیں
۱۹۴	۷	مشتاق	مشتاقِ
۱۹۵	۱۵	اردو میں ... ایسے ایسے	اردو میں اس زمانہ میں ایسے ایسے
۱۹۵	۱۸	سوقع	موقع
۱۹۵	۱۹	بہاسے	بہا دیئے
۱۹۶	۶	ایک وسیع اور عظیم الشان منظر کی	ایک ایسے منظر کی
۱۹۶	۱۶و۱۷	سوائے مراۃ العروس کے	مراۃ العروس کے سوا
۱۹۷	۲	قائل ہو جاتیں ہیں	قائل ہو جاتی ہیں
۱۹۷	۳	یہ بات سوائے مرحوم کے	یہ بات مرحوم کے سوا
۱۹۷	۹	تشبیہ	تشبیہات
۱۹۸	۴	استعمال کرتے ہیں	استعمال کر جاتے ہیں
۱۹۸	۸	ادا ہوسکتا	ادا ہوسکتا تھا
۱۹۸	۱۰	اسی سے	اِس سے
۱۹۸	۱۱	آزاد رو	آزادہ رو
۱۹۸	۱۶	حمایت اسلام	حمایت الاسلام
۱۹۹	۵	حمایت اسلام	حمایت الاسلام

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۹	۱۱	تخیل کے پرواز	تخیل کی پرواز
۱۹۹	۱۱	پہونچتے جاتے تھے	پہنچ جاتے تھے
۲۰۰	۹	سرسید	سرسید علیہ الرحمتہ
۲۰۰	۱۰	مولانا شبلی تک	مولانا شبلی نعمانی تک
۲۰۰	۱۶	.... ان کی دینی خدمت	میں اُنکی دینی خدمت
۲۰۰	۱۸	دل کھول کے	دل کھول کر
۲۰۲	۱۶	سکوٹ	سکوٹ
۲۰۵	۹	.... ابھی ہماری قوم میں	معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہماری قوم میں
۲۰۸	۱	... مبارک باد	دلی مبارک باد
۲۰۸	۵	ادا کردیا ہے	ادا کیا ہے
۲۰۸	۱۰	قابل مؤلف	قابل مصنف
۲۰۸	۱۵	دربار سے	درباروں سے
۲۱۱	۸	شاہ عالم بادشاہ کی بادشاہت	شاہ عالم کی بادشاہت
۲۱۱	۱۸	برٹش میویم	برٹش میوزیم
۲۱۵	۱۵	عجیب	عجب
۲۱۷	۱	لکھی ...	لکھی ہے
۲۱۷	۳	انکو میر حیدر علی حیران سے تلمذ ہے	تلمذ انکو میر حیدر علی حیران سے ہے
۲۱۹	۳	شاہ جنات	شاہ اجنہ
۲۲۴	۸	اس نجیب و غریب	اس عجیب و غریب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲۵	۱۴	. . . . اور	عہد سلطنت قائم آسمی بادشاہ روشندل
″	″	″	خدا پرست سے ۔ پھر اسکے بعد نواب سعادت
″	″	″	علیخاں کا ذکر کیا ہے ۔ اور
۲۲۶	۱۱	اس کے بعد	ان کے بعد
۲۲۷	۲	صاف نظر آتی ہے	صاف صاف نظر آتی ہے
۲۳۵	۱۲و۱۲	آداب ۔۔ خدمت گذاری ادا کیے . . .	آداب خدمت گذاری کے تھے سب ادا کیئے
۲۳۸	۱	شاعری کو اعتراف	شاعری کا انحراف
۲۴۱	۷و۸	جو پنڈت چک بست صاحب نے	جیسے لالہ چک بست صاحب نے
۲۴۳	۱۱	بے انتہا بغضی کی ہے	بے انتہا ہیٹی کی ہے
۲۴۴	۱۱	کبھی ۔۔۔ دن عید اور رات شب برات	کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے
۲۴۶	۴	کچھ دنوں سے اسکا ساتھ دیا	کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا
۲۴۹	۸	فارسی زبان میں نہیں	فارسی زبان میں نہیں ملتی
۲۴۹	۱۵	۲۷ ماہ صفر	۲۵ ماہ صفر
۲۵۰	۶	رسالے لکھے ہیں گئے	رسالے لکھے ہیں لے
۲۵۱	۶	منافہ	مناقشہ
۲۵۱	۱۹	سہالی	سہالی
۲۵۲	۳	اہالی وحوالی	اہالی وموالی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵۳	۵	[illegible]	[illegible]
۲۵۴	۱۴	قاضی عضد الدولہ	[illegible]
۲۵۴	۱۵	[illegible]	[illegible]
۲۵۴	۱۷	[illegible]	[illegible]
۲۵۵	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۵۶	۶	[illegible]	[illegible]
۲۶۱	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۶۱	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۶۱	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۶۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۷۱	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۷۲	۳	[illegible]	[illegible]
۲۷۲	۱۳	[illegible]	[illegible]
۲۷۳	۵	[illegible]	قائم
۲۷۳	۱۶	نکات شعرا	نکات الشعرا
۲۷۴	۱	ایں دو چار بیت	[illegible]
۲۷۶	۱۵	[illegible]	شعلۂ [illegible] آتش دل
۲۷۷	۱۲	[illegible]	یک الزام رہ گیا
۲۷۷	۱۸	[illegible]	[illegible]

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۷۹	۱	یہ سمجھ	یہ سمجھے کہ
۲۷۹	۱۴	دیکھا	[illegible]
[illegible]	۹	[illegible]	ہیں
۲۸۱	۱۰	[illegible]	[illegible]
۲۸۱	۱۳	چاہئے	چاہیئے
۲۸۳	۵	کوئی جیس یہ نہیں	کوئی جس میں یو نہیں
۲۸۳	۲	یاں	کہاں
۲۸۳	۱۳	ہم سہری	ہمسری
۲۸۴	۵	کرۂ حرارت	کرۂ حرارت
۲۸۵	۱	تائید ... ہیں	تائید کرتے ہیں
۲۸۶	۱	سکریۂ شب	گریۂ شب
۲۸۶	۱۰	لے کمری	بے کمری
۲۹۳	۶	رکھو	رکھیو
۲۹۴	۱۱	چارہ گر... اپنا	چارہ گر ہے اپنا
۲۹۴	۱۲	ہوزگو	ہرزہ گو
۲۹۴	۱۴	کہیئے کیا	کیجیے کیا

۲۹	۱۱	گیارا	گیارہ
۲۹	۱۹	اٹھارا	اٹھارہ
۳۰	۹	سنہ ۱۳۰ء	سنہ ۱۷۳۰ء
۳۰	۱۴	۲۰۰ ہجری	۱۲۰۰ ہجری
۳۰	۵	ہم پہوچنا	ہم پہنچنا
۳۰	۱۰	غل	غلو
۳۲	۶	نکات الشعرا . .	نکات الشعرا بھی
۳۲	۱۷	اپنی . . . آپ بیتی	اپنی اس آپ بیتی
۳۳	۱۱	خانہ جنگیاں . . . بربادیاں	خانہ جنگیاں اور بربادیاں
۳۳	۱۹	فقر و فاقے	فقر و فاقہ
۳۳	۸	غم و غصے	غم و غصہ
۳۳	۸	کاماں	کاما
۳۳	۱۳	کاماں	کاما
۳۳	۱۷	مجکو	مجھکو
۳۳	۱۶	سیب	سب
۳۴	۱۵	خود . . . کے	خود اُ نکے
۳۴	۱۴	اس لیے ایہ عظم الدین خاں	اسلیئے اعظم الدین خان
۳۵	۸	وہ رنرکی کے	وہ روڑکی کے
۳۵	۱۶	صداقت نامہ	صداقت نامے

۳۵۰	۱۹	جوہر ایک	جن میں سے ہر ایک
۳۵۳	۱۸	حاصادتی ہے	حاصل ہوتی ہے
۳۶۰	۷	کل کتاب کتب کی	کل کتب کی
۳۶۳	۱	نولڈکی۔۔ ہشتاد سالہ	نولڈکی ہشتاد سالہ
۳۶۴	۱۲	پڑتا	پڑتا
۳۶۳	۱۴	سناتے	سنائے
۳۶۷	۱۵	عداوت کہتے ہو	عداوت رکھتے ہو
۳۷۱	۲	بلاد عثمانی	بلادِ اسلامی
۳۷۹	۱۱	پڑے ہیں	پڑتے ہیں
۳۸۰	۵	جڑبوٹیاں	جڑی بوٹیاں
۳۸۱	۱۱	وید تصنیف ہوے	وید تصنیف ہوئی
۳۸۲	۱۲	ملک میں چھاگئے	ملک پر چھاگئے
۳۸۳	۵	سوکتوں میں	شوکتوں میں
۳۸۴	۲	تین قسمتیں	تین قسمیں
۳۸۶	۴	شامی	سامی
۳۸۶	۹	(سفیر سلوقس) صحیح	(سفیر سلوقس) نے صحیح
۳۸۷	۲	نواسہ چندرگیت	نبیرہ چندرگپت
۳۸۷	۹	لوگ اسلیئے بولنے	لوگ اسکے بولنے
۳۹۰	۱۲	ذرا ظہورا اصلاح	ذرا اصلاح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۴	۴	سکوس پیالے	اکاس بیل
۳۴	۱۹	ذرہ ذرہ	ذرہ ذرہ
۳۴	۱۲	بلحاظ سرا وجزا	بلا لحاظ سزا وجزا
۳۵	۴	جہنم کا وعید	جہنم کی عید
۳۵	۱۹	نزعی کیبنت	نزعی کیفیت
۳۶	۸	تجلی	متجلی
۳۹	۵	البتہ تخیلات	اسیر تخیلات
۳۹	۱۷	واستانیں	داستانیں
۴۰	۱۳	تھی	تھا
۴۰	۱۹	صناع و دستکاروں	صناع اور دستکاروں
۴۰	۲	رائج ہوگیئں تھیں	رائج ہوگئی تھیں
۴۱	۷	انگیریز	انگریز